آج

۵۶

نیتر سنگھ راوت | ابھیمنیو اَنَت | لی کوک لیانگ

بین وینید وسانتوس | اودیسیوس ایلیتِس | ژاں فولیاں

گوٹفریڈ بین | خالد جاوید | وجاہت مسعود

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۶

مئی ۲۰۰۷ء

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) ۴۵ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 5213916 5650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

ٹیتر سنگھ راوت

۷

پتھر اور پانی

(سفرنامہ)

ابھیمنیو انت

۹۵

ماتم پرستی

لی کوک لیانگ

۱۰۷

جس وقت لوگ سیر کو نکل جاتے ہیں

بین وینید وسانتوس

۱۲۸

آنکھوں دیکھی

اودیسیوس ایلیتس

۱۳۹

لاش کا معائنہ

۱۴۰

ہیلن

۱۴۱

ابراندوخت

ژاں فولیاں

۱۴۳

موت

گوٹفریڈ بین

۱۴۵

لٹل ایسٹر

خالد جاوید

۱۴۷

سائے

۱۷۵

جلتے ہوئے جنگل کی روشنی میں

وجاہت مسعود

۲۰۰۳

یک خوابِ خوش و لے...

(۲۶ منتخب کالم)

سن پینسٹھ کا جذبہ یا قوم کی توہین

سیاسی عمل سے انکار کا رویہ

جب احمدیوں کا وجود جرم ٹھہرا

حدود آرڈیننس اور حقوقِ نسواں

خبر کا جبر

بلوچ احساس مسترد نہیں کیا جا سکتا

پاکستان: عورتوں کا دن ۱۲ر فروری کیوں؟

بنگلہ بھاشا آندولن: ڈھاکہ پہ کیا بیتی

... تری زلف کے سر ہونے تک

یا الٰہی مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

شہرِ لاہور تیری رونقیں دائم آباد

پھانسی گھاٹ پہ گھاس

موسیقی اور رقص قانون کی زد میں

ابرِ بہار چل دیا...

این جی اوز نے کیا بگاڑا ہے؟

بگٹی ہلاکت — آفاتِ ناگہانی کا اشارہ

معاہدۂ وزیرستان: کس کی جیت؟

غلام اسحاق خان: نصف صدی کا قصہ

Scanned with CamScanner

نجی عقوبت خانے — سپریم کورٹ تک

حسبِ قانون — فانے کا پتلا سِرا

تانگہ آگیا کچہریوں خالی

روشنی سے ڈرتے ہو؟

بہادر آدمی کی موت

محتسب کی خیر ہو...

...جڑیں کھوکھلی ہوگئی ہیں

معاشرے اور حرم سرا میں انتخاب

❁

Scanned with CamScanner

نیترسنگھ راوت

پتھراور پانی

(سفرنامہ)

ہندی سے ترجمہ

عامر انصاری، اجمل کمال

Scanned with CamScanner

تعارف

نیتر سنگھ راوت کا جنم ۱۹۳۸ء میں اُتر پردیش کے اس شمالی پہاڑی خطے میں ہوا جس کے علاقوں — کماؤں، گڑھوال، جوہار وغیرہ — سے اردو کے پڑھنے والے جم کوربٹ کی شکار سے متعلق کہانیوں کے اردو ترجموں کے ذریعے واقف ہیں اور جسے چند برس پہلے یوپی سے الگ کر کے اُتر انچل کے نام سے ایک نئی ریاست بنا دیا گیا ہے۔ نیتر سنگھ اس خطے کے جوہار علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے ہیں جس کا نام گن گھر ہے۔ انھوں نے بی اے تک نینی تال میں اور اس کے بعد بمبئی میں تعلیم پائی۔ وہ اخباری ادارے ٹائمز آف انڈیا سے سترہ برس تک اخبار نویس کے طور پر منسلک رہے اور اس عرصے میں سے دس سال اس ادارے کے ہفتہ وار جریدے دِنمان کے ادارتی عملے میں شامل رہے۔ اس دوران انھوں نے ملکی اور غیر ملکی فلموں کے بارے میں فکر انگیز اور سنجیدہ مضامین بھی لکھے۔ ۱۹۷۸ء میں وہ سرکاری ٹی وی 'دوردرشن' سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے دوردرشن کے لیے متعدد دستاویزی فلمیں بنائیں جن میں ایک مشہور فلم ماگھ میلہ ان کے آبائی خطے کے ہمالیائی پہاڑوں ہی کے بارے میں تھی۔ فروری ۱۹۹۰ء میں ان کی اچانک وفات ہو گئی۔

پتھر اور پانی ان کے اس سفر کی روداد ہے جو انھوں نے اپنے آبائی خطے کو دیکھنے کی غرض سے اپنی بیوی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ سفرنامہ پہلے ہفتہ وار دِنمان میں قسط وار اور پھر ۱۹۸۲ء میں پہلی بار کتاب کی صورت میں شائع ہوئی۔

کالامُنی پہاڑ کی چوٹی جوہار کے علاقے کو کماؤں کے نشیبی علاقے سے الگ کرتی ہے، اس چوٹی کو پار کرتے ہی مُنسیاری قصبہ ہے جو لگ بھگ پچاس برس پہلے تک ہندوستان اور تبت کے درمیان تجارت کا اہم مرکز رہا ہے۔ کالامنی کے پہاڑ کو پار کرتے ہوئے یہ احساس ہونا ناگزیر ہے کہ یہ علاقہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر تک — یعنی پکی چوڑی سڑک بننے سے پہلے — کتنا دشوار گذار رہا ہوگا۔ درحقیقت ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط تک اس علاقے کے لوگوں کو صرف پچاس یا سو کلومیٹر کی دوری پر نشیبی ہمالیائی علاقے تک میں دوسری دنیا سے آئے ہوئے لوگوں کی طرح دیکھا جاتا تھا۔ یہی علاقہ نیتر سنگھ راوت کا آبائی وطن ہے جہاں سے وہ بچپن میں اپنے ماں باپ کی پیٹھ یا کندھے پر بیٹھ کر، پیدل یا گھوڑے پر سوار آیا جایا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان اور تبت کے درمیان تجارت کم ہوتی جا رہی تھی اور اس اونچے ہمالیائی علاقے میں — جو کم سے کم چھ ماہ برف سے ڈھکا رہتا ہو اور جہاں کھیتی لگ بھگ نہ ہونے کے برابر رہی ہو — روزی کمانا کس قدر دشوار رہا ہو

Scanned with CamScanner

گا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیتر سنگھ کے دادا مفلسی کی آخری حد سے گزر کر باہر چلے گئے تھے اور اپنے بیٹے، یعنی نیتر سنگھ کے باپ، کو بھی نصیحت کی تھی کہ اپنی آل اولاد سمیت کبھی مت لوٹنا۔

تاہم نیتر سنگھ نے بچپن میں بھوٹیا یا سَوک قبیلے کے ان بیوپاریوں کی بہت سی کہانیاں سنی تھیں جو اپنے گھوڑوں اور بکریوں کے لشکر کے ساتھ آسام، کلکتہ، بمبئی اور کراچی کا مال تبت میں گیانم، تکلاکوٹ، گرتوک اور لھاسا کے قصبوں میں پہنچاتے تھے اور جنھیں پیڑھی در پیڑھی پھلنے پھولنے والے اس کاروبار نے بہت مالدار بنا دیا تھا۔ جوہار ہی کے ایک بیوپاری سُن پتی سَوک کی بیٹی راجولا اور ویراٹ کے راجہ مالوشاہی کے عشق کی منظوم داستان راجولا مالوشاہی کماؤں کی سب سے مقبول عام اور فنکارانہ لوک شاعری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سُنپتی سوک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بیوپار کرنے منسیاری سے باگیشور، سومیشور اور ویراٹ کے راستے، رام گنگا کی وادی سے ہوتا ہوا، میدانوں تک جایا کرتا تھا: اس کے پاس بہت سے نوکر تھے اور ان گنت گھوڑے، بکریاں اور خچر جن پر اس کا مال لدا ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تجارتی قافلوں کے اس پیدل سفری سلسلے نے ایک پوری ثقافت کو جنم دیا تھا جو اس کاروبار کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ نابود ہو گئی۔

تبت کے لوگ باہر کے لوگوں کو اپنے علاقے میں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہندوستان کے باشندوں کو تیرتھ یاترا کے لیے کیلاش اور مانسرور تک جانے کی اجازت تھی، اس کے سوا کہیں نہیں۔ سَوکوں کو بھی — جو نسل، ناک نقشے اور رہن سہن میں تبتیوں کے قریب تھے اور تبتی زبان سے بھی واقف تھے — صرف تجارتی منڈیوں تک جانے دیا جاتا تھا اور وہاں سے انھیں لوٹنا پڑتا تھا۔ انگریزوں نے تبت میں جاسوسی کی غرض سے کچھ مقامی لوگوں کو تبت بھیجا تھا جن میں سے بیشتر زندہ واپس نہ آ سکے۔

کماؤنی زبان میں تبت کو ہُن دیش اور تبتی باشندوں کو ہُنیا کہا جاتا ہے۔ بھوٹیا یا سَوک برادری کے لوگوں نے، جو تبت کی سرحد کے اس طرف، نیپال کے مشرق میں واقع ہمالیائی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں، نہ صرف بیوپار بلکہ ثقافت کے لین دین میں بھی صدیوں پل کا کام کیا ہے۔ خود اس برادری کے نسلی پس منظر، مذہبی اعتقادات اور رسوم، زبان اور رہن سہن میں ان دونوں علاقوں کی ثقافتوں کا امتزاج تھا۔ سوکوں کی بہت سی بستیاں ان سفری راستوں پر بھی واقع تھیں اور تجارتی قافلوں کے پڑاؤ کے علاوہ، درآمدی اور برآمدی مال کے گوداموں اور ہمالیائی خطے کی شدید سردی کے دنوں میں خاندانوں سمیت ان کی پناہ گاہ کا بھی کام دیتی تھیں۔ ان بستیوں کی ایک مثال تھالہ گاؤں ہے۔ یہ نیتر سنگھ راوت کا دوسرا وطن ہے؛ یہ جوہار سے باہر باگیشور ضلعے میں کافی نشیب میں واقع ہے اور یہیں سے اس سفری روداد کا آغاز ہوتا ہے۔

تبت جانے والا یہ راستہ ان متعدد راستوں میں سے ایک تھا جو اپنی طوالت اور دشواری کے لحاظ سے

Scanned with CamScanner

ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ یہ راستہ اگر چہ زیادہ مصروف راستوں میں شمار نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود اس پر سرحد کے اِس طرف گلیشیئر کے قریب واقع آخری ہندوستانی گاؤں مِلم میں ۱۹۶۰ء کی دہائی تک پانچ سو پکے مکان موجود تھے۔ تبت جانے والے اس راستے پر ۱۰۵ کلومیٹر کے فاصلے پر مغربی تبت کی تجارتی منڈی گیانم واقع تھی۔ یہ راستہ سال میں صرف دو مہینوں — جولائی اور اگست — میں کھلتا تھا، اس کے باوجود یہاں ۱۹۴۰ء کی دہائی میں سالانہ پچیس لاکھ روپے کی تجارت ہوتی تھی۔

نین سنگھ راوت کا یہ سفرنامہ ایک ایسی ثقافت کی آخری بڑی روداد ہے جس کا اب قریب قریب کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس کے باوجود یہ اس سماج اور اسے جنم دینے والے قدرتی ماحول کا ایک نہایت اپنائیت بھرا بیان ہے جو اس علاقے سے باہر کے کسی لکھنے والے سے شاید ممکن نہ ہوتا۔ ایک طرف یہ سفرنامہ ایک ایسے علاقے کے سفر کا احوال ہے جو فطری حسن اور شدائد دونوں سے بھرپور ہے، دوسری طرف یہ لکھنے والے کے اندرونی سفر کی بھی روداد ہے جس میں وہ اس خطے میں گزارے ہوئے اپنے بچپن کے دنوں کو اور بعد کے زمانے کے غیر متواتر رابطوں کو بھی یاد کرتا ہے۔ اس روداد کا تیسرا پہلو گزرتے وقت اور بدلتی ہوئی زمینی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ افراد اور معاشروں میں آنے والی تبدیلیوں کا نہایت موثر اور مصور، لیکن اسی قدر سادہ بیان ہے۔

Scanned with CamScanner

جون کے پہلے ہفتے میں اپنے آبائی گاؤں تھالہ (تحصیل باگیشور، ضلع الموڑا) میں میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مِلَم گلیشیئر تک جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو خاندان کے لوگوں اور جاننے والوں نے مشورہ دیا کہ جوہار کا علاقہ شروع ہونے پر ہم رنگین کپڑے نہ پہنیں۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس 'دیو بھومی' میں رنگین کپڑے پہننے والے یا تو چلتے چلتے بے ہوش ہو جاتے ہیں یا انھیں 'آنچریاں' (دیو بالائیں یا پریاں) ہر لے جاتی ہیں۔ لوک عقیدے کے خلاف چھیڑ خانی کا کوئی ارادہ نہ ہوتے ہوئے بھی عقل اور تصور کے بیچ دبی دبی سی بحث چھڑ گئی۔ عقل نے بغیر تجربہ کیے ہی ایسے عقیدے کو رد کرنے کے علاوہ نامعلوم کو چیلنج نہ دینے کا بچھاؤ بھی دیا، لیکن تصور میں کئی طرح کی تصویریں اُبھرنے لگیں... ہم رنگین کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور پریاں ہمیں لے جا رہی ہیں... ہمارے پیر زمین کو نہیں چھو رہے ہیں، ہوش میں بھی ہیں اور نہیں بھی... کیسی ہوتی ہوں گی پریاں، کیسے بولتی ہوں گی؟ ویسے ہی تو نہیں بولتیں جیسے کارٹون فلموں میں اُدھم مچاتے کردار بولتے ہیں؟... کہاں تک لے جائیں گی؟... من بڑا پاپی ہوتا ہے، بھوگے بنا نہ ماننے پر آمادہ!

پچھلے برس گڑھوال میں رنوائی (ضلع اُتر کاشی) سے گنگوتری اور پھر بدری ناتھ سے آگے مانہ تک گیا تھا۔ اِدھر تھالہ سے مُنسیاری کی طرف جاتے وقت خیال آیا کہ کُماؤں کا پھیلاؤ گڑھوال سے زیادہ ہے۔ کماؤں کو حصوں میں بار بار دیکھا ہے، لیکن اُسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ساتھ اِس بار ہی دیکھا، اس لیے اس کے پھیلاؤ اور وسعت کا احساس یک مشت حاصل کرنے کی سہولت رہی۔ مُنسیاری کو میں نے قریب پانچ برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ اتنے بڑے وقفے کے بعد اسے دوبارہ دیکھنے پر میں نے اس فرق کا سامنا کیا جو کسی دیکھی ہوئی جگہ میں ہوتی ہوئی تبدیلیوں کی خبریں سن کر بنائے گئے تصور اور پھر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ فرق اچانک پوری طرح ظاہر ہو کر شعور کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہے — بنائے گئے تصور کو بیشتر رد کرتے ہوئے ... یہاں کالج نہیں، چراگاہ تھی، یہاں صرف کھیت تھے، یہاں 'ترکیپ' (خیمے) گڑے رہتے تھے...

Scanned with CamScanner

جہاں میدان سا تھا، وہاں میں اُتار ہی اُتار کیوں دیکھ رہا ہوں؟... بچپن کی بار کوندھ کر پھر ساکت ہو گیا۔ اُس پار، بہت قریب دکھائی دیتے ہمالیہ کے مشہور چوٹیوں کے سلسلے پنچ چولی پر نظر ٹکی تو خیال آیا کہ وہ میری یاد میں نہیں ہے، اسے پہلی بار ہی دیکھ رہا ہوں۔ پچھلے تیس بتیس سالوں میں مُنسیاری اتنی ضرور بدل گئی ہے کہ گاؤوں کے جھرمٹ میں سے ایک اچھا خاصا قصبہ اُبھر آیا ہے۔ بڑی جگہ مُنسیاری تب بھی مانی جاتی تھی جب وہ گاؤوں کا جھرمٹ بھر تھی۔ ''سار سنسار، ایک مُنسیار'' (سارا سنسار ایک منسیاری کے برابر) جیسی کہاوت یہ جتلاتی ہے کہ سرحد پر رہنے والوں کے پرکھوں نے اُسے کس سطح کے مبالغے سے سجایا تھا۔ اتنے برس بعد دیکھے گئے چہرے ٹھوس سچ کی طرح سامنے آتے ہیں... اصل روپ کو جلائے رکھنے کے باوجود بدلے ہوئے ہوا پانی کا اثر، اور عمر اور آپ بیتی جگ بیتی کی چھاپ لیے ہوئے ملنے کے عمل کے لین دین میں ایک مہربان عورت نے میری بیوی سے کہا، ''چھوٹا سا تھا یہ جب یہاں سے گیا تھا۔ بہت دبلا تھا— حمل گرنے کے باوجود زندہ رہ جانے والے گھوڑے کے بچے جیسا دبلا تھا، اور کالا بھی۔ اب تو بہت بدل گیا ہے۔''

میرا اندازہ تھا کہ آگے جانے کے لیے زادِراہ، خیمے اور گھوڑے کا انتظام کرنے میں دو تین دن سے زیادہ وقت نہیں لگے گا، لیکن مُنسیاری میں پروگرام الجھ گیا۔ لوگوں سے جانکاری ملی کہ بدلے ہوئے حالات کو میں نہیں سمجھ رہا ہوں۔ لیلم اور بوگڑیار، ان دو پڑاؤوں میں ترقی کی نشانی بطور ڈاک بنگلے ہیں، اس لیے خیمے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ زمانہ گزر چکا ہے جب جوہار کی طرف جانے والوں کو ہر موسم میں رات گزارنے کے لیے صرف خیمے کا ہی سہارا مل سکتا تھا۔ یہ جانکاری میں پہلے بھی حاصل کر سکتا تھا، لیکن اپنے دیس میں کہیں جانے سے پہلے میں موٹا سا اندازہ لے کر چلتا ہوں تاکہ جاننے کی گنجائش زیادہ رہے اور بھٹکنا ناممکن نہ ہو جائے۔ آگے جانے کی جلدی کے راستے میں ایک رکاوٹ آ گئی: گڑھوال کے چنڈی پرساد بھٹ[1] نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جوشی مٹھ میں 'پیڑ لگاؤ مہم' سے نپٹ کر

---

[1] چنڈی پرساد بھٹ: ہندوستان کے ایک معروف ماحولیاتی ماہر اور کارکن، جو جنگلوں کو تجارتی کٹائی سے محفوظ رکھنے کے لیے چلائی جانے والی مشہور ''چپکو تحریک'' کے رہنماؤں میں شامل ہیں۔ یہ تحریک ۱۹۷۳ء میں دریائے الکھ نندا کی وادی سے شروع ہوئی اور جلد ہی دوسرے ہمالیائی علاقوں تک پھیل گئی۔ اس میں مقامی عورتیں درختوں سے چپک کر کھڑی ہو جاتی تھیں تاکہ انھیں کاٹا نہ جا سکے۔ (ا۔ک۔)

Scanned with CamScanner

سیدھے مُنسیاری آئیں گے اور مِلّم کے سفر میں میرے ساتھ رہیں گے۔ چار پانچ دن انتظار کرنے کے بعد ان کا تار ملا کہ بیمار ہیں، نہیں آئیں گے۔ ایک ساتھی کم ہو گیا، اس لیے ساتھ لے جانے کے لیے سامان کا وزن بھی کم ہو گیا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ گھوڑا کرائے پر لے کر اپنی جیب پر فالتو بوجھ ڈالوں۔ میں نے طے کیا کہ بستر اور زادِراہ لے جانے کے لیے ایک مزدور کو ساتھ لے لوں۔ جوہار کے دشوار گذار راستے پر ایک مزدور تیس کلو تک وزن ڈھو سکتا ہے۔ بھرپور بستر لے جانا ضروری ہے، گرم کپڑے اور زادِراہ بھی۔ تیس کلو کی حد کا تقاضا پورا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تکیے کم کر سکتا تھا۔ تھوڑا سامان میں نے خود ڈھونے کا فیصلہ کیا کیونکہ تیس کلو میں ساتھ چلتے مزدور کے بستر کے لیے بھی گنجائش نکالنی تھی۔ موسم کے آثار دیکھ کر میں نے رات کو سامان باندھ لیا تھا لیکن صبح دیکھا کہ بارش بہت تیز ہے۔ جس گھر سے میں آگے جا رہا تھا اس کے افراد کی نظر بھی کہہ رہی تھی کہ ہم روکنا نہیں چاہتے، لیکن ایسے میں آگے جانے میں جوکھم تو ہے ہی۔ دکھ اور جوکھم بھوگے ہوئے لوگوں کی نظر جو کہتی ہے اس کو نظرانداز کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ بیوی سمیت چکمہ دیتے موسم کے حوالے ہو جانے کے بجائے میں نے سفر ملتوی کرنا بہتر سمجھا۔ دل پر شدید مایوسی چھا گئی تھی۔ برسات شروع ہو گئی ہے یا نہیں، یہ طے کرنا مشکل تھا۔ سوچا، شروع ہو گئی ہے تو ممکن ہے کہ ہفتے پندرہ دن تک راستہ روک لے۔ واپسی کا خیال زور دکھانے لگا تھا، لیکن دل مانا نہیں۔ نیچے بہت گہری گھاٹی کی آڑ میں کہیں کہیں تھوڑا سا جھانکتی ہوئی گوری گنگا خاموشی اور بے نیازی سادھے رہنے کے باوجود کہہ رہی تھی: بس، یہیں تک؟ مُنسیاری کے سرہانے بسے دُمّر کے اس پار دو پربتوں کے بیچ کی ڈھلان — آسمان چھوتی دو چوٹیوں کے برابر سے گھاٹی کی سطح تک جھکی ہوئی ڈھلان — بھی جوہار کی سمت دکھاتے ہوئے ویسی ہی خاموشی اور بے نیازی سادھے ہوئے کہہ رہی تھی: یہیں سے لوٹ جاؤ گے کیا؟ میں نے خود کو بہت ادنیٰ محسوس کرتے ہوئے کئی بار اس ڈھلان کی طرف دیکھا، نیچے گوری گنگا کی طرف دیکھا۔

خوب برس کر تیسرے دن بادل ندارد ہو گئے تو میں نے موسم کے بارے میں اپنی سمجھ پر بھروسا نہ کر کے مقامی لوگوں سے پوچھ تاچھ کی۔ یہ ایک بات سب نے دہرائی کہ مُنسیاری اور اس سے نیچے کا موسم اوپر جوہار کے موسم پر لاگو نہیں ہوتا۔ بوگڈیار سے اوپر، یعنی صرف انیس بیس میل کا راستہ طے کرنے پر، دوسرا ہی موسم ہوگا۔ وہاں بارش ہوگی بھی تو بہت ہلکی، تیز ہوا کے جھونکوں سے بکھرتی چھتراتی

ہوئی۔ جوہار سے لوٹے دو مزدوروں نے بھی یہی کہا کہ جوہار میں ابھی بارش شروع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے باوجود بیس بائیس میل تک کی دشواری کو جانچنا ضروری بھی تھا اور چکمہ دینے والا بھی، کیونکہ لوگ میرے ارادے کا تیور پہچان کر صلاح دے رہے تھے۔ ارادہ کچھ کمزور دکھائی دے تو کوئی کہتا، ''بارش تو شروع ہو ہی گئی ہے۔ راستہ ٹوٹتا رہتا ہے، کہیں کہیں بہت کچا ہے اور ایسا کہ اوپر سے پتھر آتا دکھائی دے تو بچنے کے لیے پھرتی سے آگے پیچھے بھاگ بھی نہیں سکتے۔ کہیں کہیں صرف 'بیت' (بالشت) بھر راستہ ہے اور وہیں گوری (گنگا) بھی ٹھیک نیچے بہتی ہے۔ پیر پھسلے تو سیدھے گوری میں ہی گرو...'' میرا ارادہ پختہ دکھائی دے تو حوصلہ دینے والے کہتے: ''اتنے برس بعد اس طرف آئے ہیں تو جائیے ملم تک۔ بار بار اتنی دور کون آ سکتا ہے؟ جانے والے جا ہی رہے ہیں۔ نیچے کا راستہ زیادہ خطرناک ہو تو اوپر کے راستے جائیں۔ اوپر کے راستے سے پھیر بڑھ جاتا ہے اور چڑھائی بھی بہت ہے، لیکن جوکھم کم ہے...'' میں نے دن طے کیا— اس ارادے سے کہ بارش ہوگی تو بھی رکوں گا نہیں۔

جس دن جانا تھا اُس دن بارش نہیں ہوئی۔ جن کے گھر سے جانا تھا انھوں نے پہلے پڑاؤ تک میل کا حساب بتانے کی بجائے کہا، ''زیادہ دور نہیں ہے لیلم۔ پہلے میں یہاں سے 'گھام' (دھوپ) آنے پر جاتی تھی اور وہاں گھاس کاٹ کر دن چھپنے سے پہلے لوٹ آتی تھی...'' میری بیوی مینا (پاروتی راوت) کی پیدل چلنے کی صلاحیت کا اندازہ نہ ہونے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بھی ہم دن چھپنے تک لیلم پہنچ جائیں گے۔ روانہ ہونے تک مجھے کھوجتے ہوئے پاس کے گاؤں تلا گھوڑا پھاٹا سے گمان سنگھ پنچ پال آ گئے، جن کی رنگین طبیعت کے اکا دکا قصے میں سن چکا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جوہار میں کہاں کہاں جائیں تو ایک مختصر سفر کا مقصد قاعدے سے پورا ہو جائے گا۔ گمان سنگھ جی سے ہی دستور کے مطابق ماتھے پر 'پِٹھاک' (رولی جو کماؤں میں سب جگہ سفر پر نکلتے وقت یا تیج تیوہار میں لگاتے ہیں) لگوا کر باہر آنے پر دیکھا کہ پاتھروں (چوڑے چوکور پتھروں) کی ٹھگنی دیوار پر پالتی مار کر بیٹھا ایک ادھیڑ شخص سارنگی بجانے کی تیاری کر رہا ہے اور اس کے سامنے کھڑی اس کی بیوی گانے کے لیے سارنگی کی سنگت کی انتظار کر رہی ہے۔ میں چونکا— یہ آج بھی یہاں ہیں؟ یہ میں فوراً سمجھ گیا کہ گیہوں کی فصل سمیٹی جا رہی ہے، لہٰذا وہ آئے ہیں مانگنے کے لیے ہی، لیکن یہ طے نہیں کر پایا کہ وہ 'ہڑکی' (گا بجا کر مانگنے والوں کا ایک خاص گروہ) ہیں یا ایسے ہی کسی اور قبیلے کے ہیں۔ میں نے

Scanned with CamScanner

بچپن میں اپنے آبائی گاؤں تھالہ میں بُڑکیوں کو کئی بار دیکھا تھا۔

''بلی ...ی...ی...ی...ی...

او بھِنا آ...آ...آ...'' (بھِنا = جیجا)

ایک عمر دار عورت کو گاتے ہوئے دیکھ کر میں جھینپ گیا۔ دل میں یہ خیال بھی کوندھ گیا کہ اس کے گانے کے انداز میں غلامی کی جھلک ہے — صدیوں پرانی غلامی۔ اسے کچھ دے کر میں روانہ ہو رہا تھا، لیکن گمان سنگھ آگے آ گئے۔ ''رکیے بھائی صاحب! سنیے تو سہی کہ کیا گا رہی ہے۔ یہ تو بڑا اچھا شگون ہے... جاتے وقت یہ اچھا شگون ہو رہا ہے...'' گمان سنگھ نے پھر اس عورت سے کہا، ''سناؤ! ہمارے جوہار جاتے وقت جو گیت گاتے ہیں، وہ سناؤ!''

وہ پھر گانے لگی: ''بلی...ی...ی...ی...''

میں بہت لمبی کھنچتی ہوئی اس تان کے بعد کی سطریں صاف نہیں سن سکا، لیکن گمان سنگھ سر ہلاتے ہوئے اشارہ دے رہے تھے کہ سب سن رہے ہیں، سب سمجھ رہے ہیں، یہ بھی جانتے ہیں کہ اگلا بول کیا ہے۔ مجھ سے انھوں نے پوچھا، ''یہ بلی...ی...ی...ی... کیا ہے، سمجھ رہے ہیں؟ یہ لوگ کتیور کے ہیں۔ یہ بلی...ی...ی...ی... کتیور کی طرف کا پکارنے کا ایک انتہائی اپنائیت بھرا طریقہ ہے، جیسے 'بلی...ی...ی...ی...تول گھاس کاٹی ہالو؟' (...تو نے گھاس کاٹ لیا ہے؟) دوسری کہتی ہے، 'ناہو، بلی...ی...ی...ی...تو جاگی رہیئے ہاں، کملا بینی...ی...ی...' (نہیں، کہاں سے کاٹ لیا...تو میرا انتظار کرنا کملا بہن)۔ یہ ہے بلی...ی...ی...ی...''

بٹوا کھول کر گمان سنگھ نے اس عورت کے ہاتھ میں پانچ روپے کا ایک تازہ نوٹ تھماتے ہوئے کہا، ''اب تم وہ گیت سناؤ جو ہم لوگوں (سوکوں) کے جوہار سے ہُن دیش (تبت) جاتے وقت تم لوگ گاتے تھے۔'' نوٹ سمیت ایک ہاتھ سے سلامی دے کر وہ عورت ناچنے کے لیے دوسرے ہاتھ سے ساڑھی کا پلا پھیلانے لگی تو میں اُسے ناچتے نہ دیکھنے کے لیے گھبرا کر چل دیا۔ گمان سنگھ جی شاید سمجھ گئے تھے کہ میرے لیے انتہا کا نقطہ آ گیا ہے۔ کچھ دور تک ساتھ چلتے وقت انھوں نے کہا، ''ہمارے بزرگوں کی رئیسی کی نشانی ہیں یہ لوگ۔ شوقین تھے اس لیے کہیں سے ہُڑکیے لے آئے، کہیں سے انھیں لے آئے۔ یہ لوگ بھانڈ ہیں، کتیور سے لائے گئے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

میں سوچ رہا تھا کہ کون جانے یہ لائے گئے یا خود ہی آ گئے۔ ان کے ساتھ ذات پات کے غرور کی بو بھی بچی رہے گی۔ جاگیرداری کی روایت کی لاش ڈھوتے ہوئے گا بجا کر مانگنے والے ایسے گروہ آج تک بدلتے بدلتے بھی نہیں بدلے ہیں۔ خود ہم ہی کتنا بدلے ہیں؟

مُنسیاری کی حد سے نکلتا ہوا راستہ پیدل چلنے والوں کے لیے کافی سہل ہے، لیکن اس پر چلتے ہوئے میں سمجھ رہا تھا کہ آگے وہ ایسا نہیں رہ جائے گا۔ دقتیں اور ٹوٹ پھوٹ ایسے ہی آڑ میں رکھی جاتی ہیں۔ قریب میل بھر آگے نکل کر خیال آیا کہ گوپ سنگھ پیچھے رہ گیا ہے، جو بوجھ لادے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ایک کھلے ہوئے موڑ سے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر جہاں تک نظر جاتی تھی، وہاں تک وہ کہیں نہیں دکھائی دیا۔ مینا پھولے ہوئے پاکھڑوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گئیں اور انھوں نے کہا، ''لوٹ کر دیکھو، ماجرا کیا ہے۔'' وزن کا اندازہ وہ کر چکا تھا، لہٰذا یہ مان لینے کی گنجائش نہیں تھی کہ اس کی چال ہی بہت مریل ہو گئی ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید بستر بند کا فیتہ ٹوٹ گیا ہے اسی لیے وہ کہیں اٹک گیا ہے۔ اس کی لاپرواطبیعت کی ہلکی آہٹ مل چکی تھی کیونکہ بوجھ ڈھوتے رہنے کے باوجود اس کے پاس رسّی نہیں تھی اور عین وقت پر اُسے رسّی مانگنے کے لیے بھٹکنا پڑا تھا۔ لگ بھگ پون میل لوٹ کر میں نے دیکھا کہ بوجھ سڑک کے کنارے رکھ کر وہ نیچے کھیت میں کسی سے زور زور سے باتیں کر رہا ہے۔ ایک آواز کانوں سے ٹکرائی: ''دیکھ، تیرے سیپ لوٹی او گے...'' (تیرا صاحب تو لوٹ آیا) گوپ سنگھ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور صفائی دینے لگا: ''آپ کیوں لوٹ آئے سَیپ (صاحب)؟... ہم کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہے سَیپ...''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں؟'' اس نے کہا، ''مجھے ایک جوگی مل گیا تھا۔ کہنے لگا، تیرا بھلا ہوگا، تیرا بھلا ہوگا۔ مجھ سے چھ سات روپے ٹھگ چکا ہے۔ آج بھی ایک روپیہ میں نے دیا...''

''نہ دیتے تو؟'' میری آواز کافی تیکھی ہو گئی تھی۔ ''تم جیسے ملتے رہتے ہیں ان لمپٹوں کو... لوٹ کے آ جائیں تو بتانا کہ کون ہے...''

گوپ سنگھ کی آواز ڈوب گئی تھی، ''کہہ رہا تھا، نہیں رکو گے تو بھلا نہیں ہوگا... ڈر لگتا ہے ایسے جوگیوں سے...''

Scanned with CamScanner

بوجھ اٹھا کر وہ ساتھ چلنے لگا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ’’بستر تمھارے پاس نہیں ہے، پیر میں جوتے نہیں ہیں، اور جا رہے ہو جوہار۔ اس سے برا اور کیا ہوگا تمھارا؟ رات میں ہم تمھیں دو پشمینے اور ایک دری کے سوا اور کچھ نہیں دے سکیں گے۔ نیند آ جائے تو ٹھیک ہے، نہیں تو مرنا ٹھنڈ سے۔ چھ سات روپے اور ملا کر کپڑے کے جوتے ہی خرید لیتے...‘‘ گوپ سنگھ اپنا بستر نہ رکھنے کی بات تو گول کر گیا، لیکن جوتے کے خلاف اس کا تبصرہ تھا، ’’کپڑے کے جوتے پر کون پیسے برباد کرے گا؟ پچھلے ہی مہینے چودہ روپے میں کپڑے کے جوتے لیے تھے، لیکن سات دن بھی نہیں چلے...‘‘

مفلسی کے باوجود گوپ سنگھ شوقین آدمی ہے۔ میں بھانپ گیا کہ کپڑے کے جوتوں کی حقیقت کھولنے کے علاوہ وہ اپنی مجبوری پر مٹی بھی ڈال رہا ہے۔ کماؤں کے دیہاتوں میں زیادہ تر عورتیں ننگے پیر چلتی ہیں، لیکن مرد اب جوتے چپل پہنتے ہی ہیں۔ اس طرف جوہار کی سبھی عورتیں بھی جوتے پہنتی ہیں؛ چپل اس لیے بھی نہیں پہنتیں کہ وہ وہاں نہیں ٹکتیں۔

دیکھتے دیکھتے گوپ سنگھ ہم سے بہت آگے نکل گیا، پچھلی کسر پوری کرنے کے لیے ہی نہیں، اکہرے بدن کا یہ نوجوان جو عمر میں مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا ہوگا، بوجھ لادے، لگ بھگ خالی چلتے ہوئے ہم سفروں کو تیز چلنے کے لیے مسلسل اکساتا رہا۔ بوجھ لے کر چلنا تو کیا، خالی ہاتھ چلنے کی مشق بھی چھوٹ جانے کے علاوہ میں اس لیے بھی پچھڑ جاتا تھا کہ بیوی کی چال دھیمی تھی۔ چپل تیاگ کر پہنے گئے جوتوں سے ان کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔

گوری گنگا کو پاس سے دیکھنے کی خواہش تیز ہو رہی تھی، لیکن کسی موڑ پر پاس آنے کا گمان دے کر وہ پھر دور ہو جاتی تھی۔ لیلم تک یہ کئی بار ہوا۔

بستی اور اس کے آثار پیچھے چھوٹ گئے، سناٹا گہرا ہونے لگا اور راستہ خطرناک نہ ہوتے ہوئے بھی پہلے جیسا نہ رہا تو بیوی کے چہرے پر ایک اجنبی، اَن بوجھے اور دشوار علاقے کے نزدیک پہنچنے کی دہشت جھلکنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سوچ رہی ہیں میں انھیں ایک نہایت گئے بیتے مفلس علاقے کی طرف لے جا رہا ہوں۔ میں نے ان سے کہا، ’’یہ علاقہ ویسا نہیں ہے جیسا تم سوچ رہی ہو۔ اس راستے کبھی ہزاروں خاندان جوہار جاتے تھے، ہزاروں یاتری ہر سال کیلاش، مانسرور تک جاتے تھے۔ بھیڑ بکریوں، گھوڑوں، خچروں کے گلے کی گھنٹیوں کی کھل کھل اور کھنکناہٹ سے یہ راستہ گونجتا رہتا تھا۔

موسم آنے پر دیس کے کونے کونے سے لایا گیا لاکھوں روپے کا سامان اس راستے تبت جاتا تھا۔ آج بھی جو خاندان اس طرف گئے ہیں، وہ اپنی گاڑھی کمائی سے چھ مہینے کا راشن لے کر گئے ہیں۔ ننگا بھوکا علاقہ نہیں ہے یہ۔'' بیوی کے چہرے پر دہشت کی وہ خفیف پرچھائیں آگے کہیں نظر نہیں آئی۔

لیلم ہم دن ڈھلنے تک پہنچ گئے تھے۔ تسلی ہوئی کہ ہماری رفتار زیادہ بری نہیں ہے۔ گوپ سنگھ کو لیلم پہنچنے تک میں گوپال کہنے لگا تھا۔ اسے ساتھ لیے ڈاک بنگلے کا معائنہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ ڈاک بنگلہ ذرا زیادہ ہی الگ تھلگ ہے اس لیے سڑک کے کنارے دکان پر ہی رات بتائی جائے۔ دکاندار سے جان پہچان بڑھنے پر انکشاف ہوا کہ وہ وہاں بیٹھا مجھے میرے کٹے پھٹے ماضی سمیت جانتا ہے۔

شام ہونے تک تھکان ختم ہو چکی تھی —— صرف آٹھ میل پیدل چلنے کی تھکان۔ خیال آیا کہ شہروں نے مجھے کتنا نچوڑ دیا ہے۔ اتنی تھکان کبھی دن بھر میں تیس بتیس میل پیدل چلنے پر بھی نہیں ہوتی تھی۔ گوپال 'سیپ سیپ' (صاحب صاحب) کہہ رہا تھا—— میں واقعی سیپ بن گیا ہوں۔ بوڑھے دکاندار کی چلم میں تمباکو پیتے ہوئے میں نے گوری گنگا کے اُس پار ایک دوسرے کی سرحد سے ملے ہوئے بُی اور پاتل، ان دو گاؤوں کی طرف دیکھا۔ دور دراز کے ایسے گاؤوں کی طرف میں اکثر افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور اس نامعلوم شخص یا ان لوگوں کی سمجھ کی پڑتال کرتا ہوں جو شروعات میں کسی مقام کو گاؤں بسانے کے لیے چنتے ہیں، بیابان کو آباد کرتے ہیں، اپنے لیے اور اپنی آل اولاد کے لیے۔ بُی کی بغل میں دائیں طرف ایک جھرنا بہتا ہے۔ پاتل کی بغل میں بھی بائیں طرف ایک جھرنا بہتا ہے۔ یہ ہر وقت آسمان چھوتی پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گوری تک آتے دکھائی دیتے ہیں—— نیلے رنگ اور چاندنی کی سی چمک کا تسلسل اور ایک سی چال لگاتار قائم رکھتے ہوئے۔ جون میں بھی ان جھرنوں میں اتنا پانی تھا کہ دونوں گاؤوں کو پانی کے مسئلے سے بارھوں مہینے آزاد رکھنے کا بھروسا دے سکے۔ پانی کے اور بھی ذرائع ہوں گے جو گاؤں والوں کو ان جھرنوں تک جانے کی بھی تکلیف نہیں دیتے ہوں گے۔ گاؤں والے کبھی بھی ارادہ باندھ کر ان جھرنوں کا پانی اپنے کھیتوں تک لا سکتے ہیں۔ سیڑھی نما کھیتوں پر پکے ہوئے گیہوں کا گھنا پھیلاؤ جتلا رہا تھا کہ وہاں کی مٹی گن وان ہے۔ بوڑھے دکاندار نے بتلایا کہ وہاں دھان، گہت بھٹ (پہاڑی دالیں)، ماش (اُڑد) اور طرح طرح کی سبزیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ دونوں گاؤوں میں جھونپڑیوں کی تعداد 'پاتھر چھتیں' (جن کی چھت پر

چوڑے پتھر بچھے ہوں) مکانوں سے زیادہ تھی، لیکن جھونپڑیاں ہی ناداری کی پہچان نہیں ہوتیں۔ آس پاس جنگل ہے، مویشیوں کے لیے گھاس کی کمی نہیں ہے، ایندھن کی کمی نہیں ہے، مُنسیاری نزدیک ہے اور جوہار بھی دور نہیں ہے۔ اتنی ساری سہولتوں کی آڑ میں ایک بڑی مشکل بھی نظر آتی ہے: دونوں گاؤں کھل کر سورج کے سامنے نہیں آتے، پہاڑ کے بدن کے ساتھ پیچھے اڑے رہ جاتے ہیں اور سامنے لیلم کی طرف ایک اور پہاڑ کی آڑ ہے، اس لیے دھوپ دیر میں آتی ہوگی۔ یہ ایک مستقل اور حل نہ ہونے والی مشکل ہے۔ جاڑوں میں ایسی جگہوں میں دھوپ کی دوری اور زیادہ ترساتی ہے۔ میں نے نظر سے سامنے کھڑے، بہت بڑے پہاڑ کا قد ناپتے ہوئے دکاندار سے*، جو بُئی کا باسی ہے، پوچھا، ''اوپر چوٹی پر چڑھ کر کیسا دکھائی دیتا ہے؟''

اُس نے کہا، ''نیچے تو منسیاری سے بہت آگے تک دکھائی دیتا ہے، لیکن اوپر کی طرف اس سے بھی اونچے ایسے ہی پہاڑ دکھائی دیتے ہیں — ہمالیہ نہیں۔'' میں نے بوڑھے کی عمر کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچا کہ دس پندرہ سال پہلے ہی وہ اس پہاڑ پر چڑھا ہوگا۔

شام کو بادل گھر آئے اور اندھیرا ہوتے ہوتے برسنے لگے۔ اندیشہ اور غیر واضح سا خوف گھرا کر اندر بیٹھ گیا۔ بستر میں گھس کر لالٹین بجھانے کے بعد دھیان موسلا دھار بارش کی آواز پر مرکوز ہو گیا۔ کچھ دیر تک بارش کی آواز اور سیدھے نیچے لگ بھگ سو گز کی دوری پر بہتی گوری کی آواز کی الگ الگ پہچان قائم رہی، پھر بارش اور تیز ہوئی تو اس کی آواز اور گوری کی آواز ایک ہوگئی؛ بلکہ اور بھی آوازیں تھیں جو ایک ہو کر گوری کے 'رِریوٹ گھگھوٹ' میں ایک ساتھ دھنس گئیں۔ میں نپٹ اندھیرے میں لگا تار سنتا رہا بوکھلائی ہوئی گوری کو... دن میں دکاندار کہہ رہا تھا، ''یہ جگہ بہت کچی ہوگئی ہے۔ اوپر ایک جگہ ڈھالو زمین کھسک کر الگ ہوئی اور بیٹھ گئی۔ دراڑ دور تک دکھائی دیتی ہے۔'' میں تب پوچھنا بھول گیا تھا کہ کیا وہ دراڑ اس دکان کے ٹھیک اوپر ہی کہیں ہے؟ مصیبت سر پر نہ ہو تو ایسے ہی نظر انداز رہ جاتی ہے۔ اس اندھیرے میں پانی دھرتی کو کاٹے گا تو لے جائے گا بہا کر سب کچھ اور سیدھے گوری کے حوالے کر دے گا، اس رِریوٹ گھگھوٹ کے حوالے کر دے گا... لیلم کا نام مجھے شاید تب سے یاد ہے جب سے اس دنیا میں ہونے کی یاد ہے۔ آج، اس رات میں پانی کیا اس کے ساتھ ہمیں بھی نگل جائے گا؟ پریشانی ذہن کو دیر تک دبوچے رہی اور پھر گہری نیند کے حوالے ہوگئی۔

Scanned with CamScanner

صبح آسمان نکھر آیا تھا۔ لیلم دھلا ہوا، ساکت اور بے فکر نظر آ رہا تھا— ہونی سے ویسا ہی بے نیاز جیسا ایک کماؤنی لوک گیت کا یہ ٹکڑا ہے: ''دھرتی لے امر نہیتی، جاگ جاگ پیڑ'' (دھرتی بھی امر نہیں ہے، جگہ جگہ دھنستی رہتی ہے)۔ میں نے گوپال سے کہا، (لگ بھگ ساڑھے تین میل کی کھڑی چڑھائی پار کر کے) ''اوپر سے نہیں، نیچے سے ہی جائیں گے۔''

گوری نزدیک آتے آتے اچانک ہی بہت نزدیک آ گئی، وہیں جہاں راستہ بہت دشوار ہے۔ چٹانوں پر بغیر سیمنٹ کے جمائے گئے چھوٹے پتھروں کی کچی دیوار پر راستہ سکڑ کر کہیں توازن قائم رکھتے ہوئے پیر رکھنے بھر کی جگہ دیتا ہے اور کہیں اُتمیں کی ایسی کچی لکڑیوں پر ٹکا ہوا ہے جن کی موٹائی ان کی مضبوطی کے بارے میں انجان راہی کو دھوکا دے سکتی ہے۔ نیچے شور مچاتی گوری کا پانی چٹانوں سے ٹکرا کر گھومتا اُچھلتا رہتا ہے۔ بارش نے اور زیادہ کمزور ہوئی کچی دیوار اور بھیگی ہوئی لکڑیاں کہیں بھی دباؤ جھیلنے سے انکار کر سکتی ہیں۔ گوپال رک گیا تھا، ہمیں ساتھ لے چلنے کے لیے۔ میں نے اس سے کہا کہ کچی دیواروں اور پُلیوں پر ایک کے بعد ایک جائیں گے، ساتھ ساتھ نہیں، اور پکی جگہ پہنچتے ہی مڑ کر دیکھیں گے کہ پیچھے آتے ہوئے ساتھی نے خطرہ پار کر لیا ہے یا نہیں۔ موت کے منھ میں جاتے ہوئے کو ہم بچا تو نہیں سکتے، لیکن جتنی احتیاط برت سکتے ہیں برتیں۔ خطرناک راستہ پار کرنے تک گوپال خاموش رہا۔ پیر تلے کی زمین پکی اور چوڑی ہونے پر اس نے میری بیوی سے کہا، ''بہن جی، مجھے تو آپ ہی کی فکر تھی۔ ایسے ہی ہمت نہیں ہاریں گی تو جو ہار پہنچ جائیں گی، ہمیں لوٹنا نہیں پڑے گا۔''

میں نے اس سے کہا، ''آج تم تیز مت چلو۔ مجھے تم سے جگہوں کے نام پوچھنے ہیں، پیڑ پودوں کے نام پوچھنے ہیں۔ میں بہت کچھ بھول گیا ہوں۔''

ڈھلان شروع نہیں ہوا تھا، اس لیے گوری کی رفتار بہت تیز نہیں تھی۔ گوری گنگا میں بھاگیرتھی اور اَلک نندا ندیوں سے زیادہ پانی ہے۔ پچھلے برس میں بھاگیرتھی کو گنگوتری تک اور الک نندا کو بدری ناتھ سے آگے مانہ تک دیکھ آیا تھا۔ دن بھی یہی تھے، بیچ برسات کے نہیں، کہ گوری کا پانی مستقل طور پر بڑھ گیا ہو۔ دھوپ تیز ہوئی تو پیڑ پودوں کی چھاؤں بھی گھنی ہو گئی۔ ان کے گھنے پن کو لانگھ کر یا اُن کے تلے آگے بڑھتے ہوئے، اغل بغل سے الگ ہوئے پتوں کی ہریالی دھوپ سے ٹکرا کر کسی قدر پاردرشی (شفاف) ہو گئی تھی۔ ایسی پاردرشی ہریالی کے ٹکڑے سب طرف نظر آنے لگے، پتیوں کے پھیلاؤ نے

دھوپ کی چلک کو بھی ہر طرف پھیلا دیا تھا۔ اس علاقے کی ہریالی غیر معمولی ہو جاتی ہے ہر سال۔ اس ہریالی پر دھوپ پڑنے سے سارا علاقہ منور ہو گیا۔ ہریالی، دھوپ اور اس کا احساس پورے اُبھار پر آ گیا۔ راستے کے کنارے چٹانوں پر جھولتی چوڑی اور گول مٹول 'دھیوپات' (گھی کا پتا) کی چکناہٹ دھوپ میں اور نمایاں ہوگئی۔ خیال آیا کہ لوک بولی نے اس پودے کو کتنا مناسب اور رنگ کے مطابق نام دیا ہے۔

دونوں طرف سے پہاڑ اور اونچے ہو گئے تھے اور بیچ میں گوری گرج رہی تھی۔ ہمالیہ نزدیک آتا ہے تو ان پہاڑوں میں بھی آسمان چھونے کی مسابقت بڑھ جاتی ہے جو ہمالیہ کے قریب ہوتے ہوئے بھی بغیر برف کے ہیں۔ آنکھیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھو تو ان پر زیادہ اونچائی پر اُگی ہوئی 'بولو گھاس' (یعنی گھاس کے بچے) کی خواب کی سی ہریالی کانپتی ہوئی سی دِکھتی ہے، نظر کو بہکاتی ہے۔ روح سکون سے نہیں رہ پاتی، پراسرار دنیا اسے اپنی طرف لے جاتی ہے، جہاں تک وہ جا سکے۔ پچھلے برس گڑھوال میں ہَرسِل سے آگے گنگوتری کی طرف جاتے ہوئے بھی میں نے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ مُنسیاری میں گروپاڑ کی طرف کی ایک استانی نے کہا تھا، "کالی ندی کی گھاٹی کہیں کہیں اتنی گہری ہے کہ آسمان بہت چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔" ایک ہاتھ کا پنجہ سکوڑتے ہوئے اس نے اس آسمان کا ناپ بھی دکھایا تھا — اتنا سا۔ میں نے گہری گھاٹی سے گزرتے ہوئے کئی بار سر کے اوپر نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا کٹا پھٹا محدود پھیلاؤ جتلا رہا تھا کہ موازنہ دیکھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دیکھے بغیر کوئی تخلیق ممکن نہیں ہے — باریک سے باریک تجرید بھی دیکھے ہوئے پر منحصر ہے... کالی ندی کی گھاٹی نہ جانے کتنی گہری ہے۔

ڈھلان دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا اور میں آس پاس بہت گھنی اُگی ہوئی 'بابیول' (گھاس کی ایک قسم) کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے اتنا نزدیک اور اتنی فراوانی میں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ لڑکپن میں جس گاؤں میں رہا ہوں، وہاں کی ان عورتوں کی تکلیف کا خیال آیا جو اپنی جھونپڑیاں چھانے کے لیے آٹھ دس میل دور تک جنگل جا کر اسے اکٹھا کرتی ہیں۔ کئی عورتوں کو میں نے خطرناک چٹانوں پر چڑھ کر اسے کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ بابیول پانی کو دوسری گھاسوں سے زیادہ برداشت کر سکتی ہے، اس کا نکاس آسان بنا دیتی ہے۔ اس سے رسیاں بنتی ہیں، جھاڑو بنتے ہیں...

Scanned with CamScanner

یہاں یہ اتنی وافر مقدار میں مہیا ہے، لیکن اسے کاٹنے والی عورتیں بہت دور ہیں۔ ممکن ہے یہ ہر سال اچھوتی رہ کر سوکھ جاتی ہو، ممکن ہے کہ موسم آنے پر عورتیں اس کی کھوج میں یہاں بھی آتی ہوں... اچانک گوری کی تیز گمک نے اس اُدھیڑ بن سے دھیان کھینچ لیا۔ وہ اس وقت آڑ میں نہ ہوتی تو میں اسے اس ڈھلان میں دہاڑتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ مُرلی کی ہلکی آواز سنی تو میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ تعجب ہوا یہ دیکھ کر کہ گوپال پیٹھ پر بوجھ لادے اس چڑھائی پر چڑھتے ہوئے ہی مُرلی بجا رہا ہے۔ بیٹھنے لائق جگہ آتے ہی میں نے اس سے کہا، ''گاڑ (ندی) کی آواز کی وجہ سے سنائی نہیں دے رہا ہے۔ یہاں بیٹھتے ہیں، تم بجاؤ پورے من سے۔'' گوپال نے تھوڑا جھینپ کر مرلی کا منہ انگوٹھے کے ناخن سے دباتے ہوئے کہا، ''یہ خراب ہوگئی ہے۔ ٹھیک سے نہیں بج رہی ہے...'' مرلی کو کوٹ کے اندر کی طرف بڑی جیب میں ٹھونس کر اس نے بیڑی سلگالی تو میں نے پوچھا، ''کیسا لگ رہا ہے یہاں؟'' اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے ہلے، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ بالکل چپ رہا کچھ لمحوں تک۔ شاید وہ مرلی کے ذریعے سے ہی کچھ کہہ سکتا تھا۔ پھر بات بدلتے ہوئے اس نے کہا، ''سیپ، یہ رو... بگڑ ہے...''

گوری کے شور کے علاوہ پورا جملہ نہ سن پانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ تب تک میں یہی جانتا تھا کہ جوہار کے راستے میں کہیں رَکسی بگڑ (راکھشسوں کی گھاٹی یا وہ گھاٹی جو راکھشسی بن گئی ہو) بھی ہے۔ گوپال سے میں نے کہا، ''زور سے بولو، کیا نام بتایا تم نے؟''

''روپسی بگڑ، روپسی بگڑ...''

میں نے اسے ٹوکا۔ ''روپسی بگڑ یا رَکسی بگڑ؟ یہاں کہیں رکسی بگڑ بھی تو ہے؟''

''نہیں ہے سیپ،'' اس نے کہا، ''صحیح نام روپسی بگڑ ہی ہے۔ آپ نے غلط سنا ہوگا۔''

ذہن اپنی رفتار سے بھٹک کر بہت پیچھے چلا گیا... کہنے والے نے غلط نہیں کہا ہوگا شاید، میں نے ہی غلط سنا ہوگا۔ جوہار کے اس راستے کے بارے میں بچپن میں اکثر سونے سے پہلے میں نے جتنے قصے سنے تھے، زیادہ تر راکھشسوں اور ان کی حرکتوں کے بارے میں ہی سنے تھے۔ بستر میں گھس کر گھپ اندھیرے میں اور تخیل میں بھی کیسی کیسی صورتیں جاگ اٹھتی تھیں... شاید اس ماحول میں ہی 'رکسی' سنا ہو...

میں اس گھاٹی کا نام سن کر اسے دیکھنے کے لیے زیادہ متجسس ہوگیا۔ گوری نہیں دکھائی دے رہی تھی، اس لیے میں نے مینا سے کہا کہ کچھ دور آگے جا کر اطمینان سے بیٹھیں گے۔

دو تین موڑ کاٹنے پر گوری اپنے پورے 'گھمک تال کھمک تال' سمیت سامنے آ گئی، پانی اور پتھروں کی بھڑنت سے اٹھتا 'گھمک تال کھمک تال' کچھ اندر کو دھنسی ہوئی کالی، ڈراؤنی اور بھیگ کر چکنی ہوئی فولادی چٹانوں سے ٹکرا کر کئی اونچی نیچی سطحوں پر گونج رہا تھا۔ بے شمار بوندیں ہوا میں اچھل رہی تھیں، کہیں دھند پیدا کرتی ہوئی اور کہیں سورج کی زد میں آ کر اندردھنش (دھنک) بناتی ہوئی۔ کبھی کبھی بھولا بھٹکا سا کوئی پنچھی بوندوں سے دھند کے پار، دھنک کے پار، چٹانوں تک چلا جاتا اور پھر ویسے ہی لوٹ آتا۔ ندی میں باڑھ آ جائے تو اس طرف کے لوگ کہتے ہیں، ''گاڑ بولی گے'' (ندی پگلا گئی ہے)۔ روپسی بگڑ اور اس سے میل ڈیڑھ میل آگے تک گوری ہر وقت پگلائی رہتی ہے۔ ڈھلان، پتھر اور چٹانیں رہ رہ کر اس کا بہاؤ روکتی ہیں، اسے چھلانگ لگانے کے لیے مجبور کرتی ہیں اور اس چنوتی کے جواب میں بولائی ہوئی گوری ہنکارتی ہوئی اور تیز بہنے لگتی ہے۔ کہیں کوئی بڑا پتھر آڑے آ جائے تو وہ اس سے ٹکرا کر یا اسے لانگھ کر کچھ آگے نکل جاتی ہے، اور پھر جیسے بدلہ لینے کے لیے لوٹ لوٹ کر اس کے اردگرد تیزی سے گھومنے لگتی ہے — جھاگ اگلتے ہوئے اس پر وار کرتی ہے۔ کسی کونے پر مضبوط چٹان کی دبوچ میں آ جائے تو ہمکتے چیختے ہوئے پوری طاقت سے اس پر حملہ کرتی ہے، اور لوٹتے ہوئے اپنے آپ کو سمیٹ لیتی ہے۔ یہ سنگھرش چلتا رہتا ہے ہر پل۔ چٹانیں اور پتھر پانی کی مار سے چکنے، چوڑے چپٹے یا گول مٹول ہو گئے ہیں۔ گوری کی چپیٹ میں آئی ہوئی چٹانیں اور پتھر طرح طرح کی شکل بے شکل ہیئتوں کا مجموعہ بن گئے ہیں۔ روپسی بگڑ ایسا 'روپَس' (سندر) نہیں ہے کہ ایک کماؤنی لوک گیت کی اس سطر کو اندرونی جواز دے سکے: ''گوری گنگا بھاگرتھی کو کے بھلو ریواڑا'' (گوری گنگا اور بھاگیرتھی کے پتھریلے ریتیلے تٹ کیا ہی سندر ہیں)۔ روپسی بگڑ کی فولادی چٹانیں گوری گنگا کو اپنے ریواڑ (تٹ) پھیلانے کی چھوٹ نہیں دیتیں۔ جنگل اور گھنی جھاڑیاں بھی اسے کہیں اِس پار اور کہیں اُس پار سے گھیرے رہتی ہیں اور اس کے ہاہاکار کی گونج چٹانوں کی کھوہوں میں گھس کر گھٹتی رہتی ہے۔ روپسی بگڑ کا حسن دہشت پیدا کرنے والا حسن ہے۔ وہ سحرزدہ کر دیتا ہے۔

روسی ادیب میخائل پرشون کی تعریف میں گورکی نے لکھا ہے، ''انجام کار ریگستان میں کوئی حسن نہیں ہے، حسن عرب کی روح میں ہے: فن لینڈ کے گمبھیر منظر میں کوئی حسن نہیں ہے، وہ ایک فن لینڈ کا باسی تھا جس نے اس حسن کو خلق کیا اور اپنے ڈرامائیت سے عاری ملک کی نذر کر دیا۔ کسی نے کہا

Scanned with CamScanner

ہے، 'لیو تن نے روسی لینڈ سکیپ میں ایسا حسن دریافت کیا تھا جو ان سے پہلے کوئی نہیں دیکھ سکا۔' کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ وہاں تھا ہی نہیں؛ اور لیوتن نے اس کو دریافت نہیں کیا تھا، وہ دھرتی کو اس کی انسانی دین تھی... انسان نے جنگلوں میں برفانی طوفانوں کے زناٹوں اور ہونکاروں، ساگر کی تباہ کن لہروں کے قدیم ناچ، بھونچال اور طوفان کے بارے میں حساس اور خوبصورت لفظوں میں بولنا سیکھ لیا ہے...''

فطرت کے مختلف روپ دیکھ کر میرا سروکار اور میرا ردعمل اس سے بہت الگ ہوتا ہے۔ یہ خیال مجھے عجیب طرح سے بے چین کر دیتا ہے کہ فطرت جہاں جس روپ میں ہے، اسے اسی طرح لفظوں میں لے آنے میں تھوڑی سی کسر اسے کیا سے کیا بنا سکتی ہے۔ تھوڑا سا بے قابو بیان، تھوڑا سا مبالغہ، اور شدت کی تھوڑی سی کمی بھی اسے تباہ کر سکتی ہے۔ اور لفظ؟ وہ ردعمل کو ہی کتنا باندھ سکتے ہیں؟

ایک رات رشی کیش میں گنگا کے کنارے ٹہلتے ہوئے میں نے منگلیش ڈبرال[۲] سے کہا تھا، ''ذرا سوچو کہ ہندی ادب نے اِسے، یہ جو بہہ رہی ہے بغل میں، کتنا تباہ کیا ہے... برباد کر دیا ہے اِسے...'' یہ جاننے کے لیے کہ ادیبوں نے فطرت کے مختلف روپ کس طرح بیان کیے ہیں، یہ جانچنا زیادہ اہم ہے کہ انھوں نے اسے کتنا تباہ کیا ہے۔ گورکی نے وولگا کو برباد نہیں کیا ہے اس لیے وولگا پر ان کا بیان پڑھتے وقت سانس لڑکھڑانے لگتی ہے۔ میخائل پر شوِن، لیوتن، گورکی اور کالی داس آئیں گے، دیکھیں گے غیر دریافت شدہ اور نامعلوم حسن کو، لیکن وہ کبھی کم نہیں ہوگا۔ تو (جوہر) اور چیتنیہ (شعور) کا رشتہ ایسا ہی ہے۔ روپسی بگڑ بہت باریک سمجھ کی توقع رکھتا ہے۔ جس نامعلوم شخص نے اسے نام دیا ہے، اس نے اسے رَکسی بگڑ بننے سے بچایا ہے۔ وہ شاید جانتا تھا کہ وہ کس طرح کے روپ کی طرف کتنا مدھم اور کتنا پائیدار اشارہ چھوڑ رہا ہے۔ اس کے بیان نے فطرت کو تباہ نہیں کیا ہے۔

آگے ایک موڑ پر کچھ شانت ہوئی گوری کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھی گاڑمیل چڑیا سامنے آئی۔ وہ پیچھے بھی گوری کے ساتھ رہی ہوگی، لیکن سامنے نہیں آئی تھی۔ میرا ذہن موٹے طور سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا: ایک پر بار بار اُبھرتا ڈوبتا ماضی حاوی تھا اور دوسرے پر پوری طرح جاگا ہوا حال اور وہ سب جو میں دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا۔ گاڑمیل چڑیا پل بھر میں ماضی کو پھاڑ کر اپنی ساری

---

[۲] منگلیش ڈبرال: معروف ہندی شاعر اور صحافی۔

Scanned with CamScanner

معصومیت کے ساتھ حال میں آ گئی تھی۔ وہ یادر ہنے والی چڑیا ہے۔ اس کے پنکھ کالے ہوتے ہیں، گردن اور سر کا زیادہ حصہ بھی کالا ہوتا ہے، لیکن سر کے بیچوں بیچ ایک چتنک سفید بندی ہوتی ہے۔ باقی بدن گہرا لال۔ گہرا لال اور گہرا کالا ایک دوسرے کی رنگت کو کسی قدر اداس اور دھومل کیے رہتے ہیں۔ سفید بندی گاڑمیل کے پھرتیلے انگوں کے مسلسل تھرکنے کے باوجود ہر وقت ایک سی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن لال اور کالے کا تناسب اور توازن بدلتا رہتا ہے۔ پنکھ پھیلتے ہیں تو پیٹھ کے نیچے دبکا ہوا لال رنگ ظاہر ہوتا ہے، سکڑنے پر پھر دبک جاتا ہے۔ چھاؤں میں آ جائے تو پیٹ کی طرف کا لال رنگ کالے رنگ کی جھائی سے ماند پڑ جاتا ہے، روشنی میں آئے تو وہی لال کالے کے مقابلے میں تیز دکھائی دیتا ہے۔ اِس پار، اُس پار آ جا کر، ندی کے بیچ یا کنارے ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک اڑ کر، وہ کبھی ایک ہی سمت دیکھتے ہوئے، کبھی چاروں طرف گھومتے ہوئے، لگاتار تیزی سے اپنے سکڑے ہوئے پنکھوں کا پچھلا سرا اوپر نیچے ہلاتی رہتی ہے۔ وہ ایک پتھر پر آدھے پون منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھتی، اور جہاں بیٹھتی ہے وہاں بھی تھرکتی رہتی ہے۔ وہ اپنی آواز سمیت ایک اداس پنچھی ہے اور اپنے گردوپیش میں بار بار نمودار ہو کر بہت ہلکی سی اداسی سمو دیتی ہے۔ گاڑ (ندی) سے گاڑمیل کا جنم جنم کا سمبندھ ہے۔

آرام کی قسط پوری کرنے کے لیے جہاں سایہ دار جگہ پسند آئی وہاں گوری کافی نیچے آڑ میں چلی گئی تھی۔ اس کی آواز دب کر ایسی رریاسیارہی تھی جیسے پاتال تک پیٹھ گئی ہو۔ آواز ہی آواز، جس نے پورے علاقے کو بے رکاوٹ بہاؤ کا احساس دے دیا تھا۔ اِس پار اور اُس پار کے غیر معمولی اونچے پربتوں سے ایک ان کہی سی دوری پیدا کرتی ہوئی خاموشی اور ٹھوس ٹھہراؤ دِل کو آوازوں کی روانی سے الگ لے جا رہا تھا۔ وقت کی رفتار جیسے ٹھہر گئی تھی ذہن کی اس تقسیم میں۔ ایکا ایک پنچھی کی آواز ابھری اور دیر تک ماحول میں تیرتی رہی: چوی ی ی ت... چوی ی ی ت... یہ بہت باریک لیکن تیکھی آواز لمحے لمحے بھر کے وقفے سے جیسے سکوت کو اور آوازوں کو پی پی کر ظاہر ہو رہی تھی اور خود کو آوازوں کے بہاؤ کی مخالف سمت میں لے جا رہی تھی، پورے ماحول کو چھید رہی تھی۔ ندی اور پہاڑ، ان دو وِراٹوں کے بیچ ایک موہوم، نادار مخلوق لے کاری کا تضاد (کنٹراسٹ) پیدا کرتے ہوئے نیچے کسی گہری سطح پر اپنے ہونے کی دمک کا اظہار کر رہی تھی اور دونوں وِراٹ اسے سننے پر مجبور تھے۔

صبح ناشتہ کیے بغیر چلے تھے۔ بھوک تیز ہو رہی تھی، لیکن ٹفن کیریئر میں کھانا کم تھا۔ میں نے

Scanned with CamScanner

گوپال سے کہا، ''آگ جلا سکو تو تم دونوں کھالو۔ دونوں کے ناشتے کے لائق ہی ہے یہ کھانا۔ مجھے ناشتے کی عادت نہیں ہے — بوگڑیار میں دیکھا جائے گا۔''

گوپال نے کہا، ''پنچ پال اُڈیار (پنچ پالوں کی گپھا) نزدیک ہے، وہاں سے پانی (گوری) تک جانا بھی بہت آسان ہے۔ وہیں کھائیں گے۔'' مینا نے مجھ سے کہا کہ پاس میں بسکٹ بھی ہیں، میں بسکٹ کھالوں۔

پنچ پال گپھا کی طرف جاتے وقت جنگل سڑک تک آجاتا ہے اور سر اٹھانے پر اکثر شاخیں اور پتے ہی نظر آتے ہیں، آسمان چھپ جاتا ہے کہیں کہیں۔ گوری کے کنارے کنارے جاتے ہوئے یہی ایک جنگل، جنگل کی طرح گھیر لیتا ہے۔ دوسرے جو جنگل اور بیابان ہیں، وہ اس پار یا اُس پار دور ہی چھوٹ جاتے ہیں یا چھترائے ہوئے پاس آتے ہیں۔ میری اور مینا کی گھڑیاں ایک بار بگڑ جانے پر کافی کوشش کے باوجود ٹھیک نہ ہو پانے سے دلّی میں ہی چھوٹ گئی تھیں۔ یہ زحمت وقت کے احساس سے بچے رہنے میں مددگار ہو رہی تھی، لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت بوجھ ڈھوتے گوپال کی بھوک ایسی موج سے زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت ہے۔ جھینگروں کی آواز بھی اشارہ دے رہی تھی کہ دن کا دوسرا پہر چل رہا ہے۔ جنگل کے سناٹے میں جھینگر بج رہے تھے: چر چر چر چر... جھوی ی ی ی ی... جھوی ی ی ی ی... جھوی ی ی ی ی... جھوی ی ی ی ی... جھوی ی ی ی ی... چر چر چر... جھوی ی ی ی ی... جھوی ی ی ی ی... جھوی ی ی ی ی... چر چر چر چر... جھوی ی ی ی ی...

سارا جنگل بج رہا تھا۔ یہ آوازیں ہر طرف سے آآ کر ایک لَے ہو رہی تھیں بار بار۔ صرف ایک ہی آواز الگ تھی اور جیسے خاموشی کو پی پی کر ظاہر ہو رہی تھی: ٹوی ی ی ی ی... ٹوی ی ی ی ی... ٹوی ی ی ی ی... ٹوی ی ی ی ی... یہ آوازیں کبھی دور سے، کبھی پاس سے، اور پاس سے، آگے پیچھے سے، اس طرح شروع ہو رہی تھیں کہ شاخوں اور پتیوں کے علاوہ آوازوں کے تلے بھی ہونے کا احساس اندر کوندھتا رہا۔ پہاڑوں میں لوٹنے پر کبھی کبھی یہ آواز ایکا ایک نمودار ہو کر شہروں اور ان کے سیمنٹ سے آزاد ہو جانے کے احساس کو بہت ہی دھیمی سطح پر تھپکی دیتی ہے۔

پنچ پال گپھا سڑک کے اوپر ہے، جہاں بھیڑ بکری پالنے والے ٹھنڈ اور بارش میں پناہ لے سکتے

ہیں۔ گپھا کے اندر بجھے ہوئے چولھوں پر وقت کا دھیما لمس اور بکریوں کی سوکھی ہوئی مینگنیوں کا جماؤ جتلا رہا تھا کہ مہینے دو مہینے سے وہاں کوئی نہیں رہا ہے۔ آنے جانے والے پنچ پال گپھا میں رکے ہوں تو کھلے میں ہی رکے ہوں گے۔ سڑک کے نیچے سوکھے ہنگال پڑے تھے، جو انھیں وہاں لانے والوں سے باقی رہ گئے تھے۔ میں نے انھیں بٹورتے ہوئے گوپال سے کہا کہ تین پتھر لا کر چولھا بنائے اور آگ جلانے کی کوشش کرے۔ دھوپ میں پڑے رہنے کے باوجود ذرا نم چار پانچ لکڑیاں بھی آسانی سے مل گئی تھیں۔ گوپال کو آگ جلانے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی — گوری کی لہروں کے ساتھ آتے ہوا کے تیز جھونکوں کے باوجود۔ ہنگال جلد سوکھ جاتا ہے اور جلد ہی آگ پکڑ لیتا ہے۔ ہنگال کی لپٹوں سے تپ کر نم لکڑیاں بھی جلنے لگیں۔ مُنسیاری میں 'رائے دینے' کے لیے پڑھے ہوئے ایک مسودے کی یاد آئی، جس میں بار بار یہ ذکر آیا تھا کہ فلاں جگہ تھکا ماندہ ہونے کے باوجود بارش میں یا برف میں کیسے آگ جلا کر کھانا پکایا تھا۔ خیال آیا کہ لکھنے والے نے تکرار نہیں کی ہے؛ جس نے بھوک بھوگی ہو وہی جان سکتا ہے کہ وہ کس طرح کی تکلیف کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ جہاں آگ ناپید ہو وہاں دیا سلائی یا 'پوت' (ایک طرح کی سوکھی اور مسلی ہوئی گھاس جو چقماق اور لوہے کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی باریک چنگاریوں سے آگ کھینچ کر فوراً جلنے لگتی ہے) کھو جائیں یا بھیگ جائیں اور لکڑیاں بھی بھیگی ہوئی ہوں تو اناج ہوتے ہوئے بھی اسے پکانے کی شرط باقی رہ جاتی ہے۔ بھوک تب کیا ہو جاتی ہے جب وہ برداشت کی طاقت کی آخری حد پار کر جاتی ہے؟

ہاتھ میں برتن لے کر میں گوری کی طرف لپکا۔ پانی لانے کی اتنی جلدی نہیں تھی جتنی اسے چھونے اور چکھنے کی جلدی تھی۔ گوری کے پانی کو چھوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ ویسا ہی ہے جیسا تیس بتیس سال پہلے تھا — وہ ہمیشہ ویسا ہی رہے! گوری میں زیادہ تر برف کا پانی ہے — ہلکا دودھیا، جسے پیتے وقت ٹھنڈ سے دانت سُن ہو جاتے ہیں۔ پانی آنتوں سے نیچے اترتا ہے تو نانی یاد آ جاتی ہے۔ اسے پیتے وقت لگ بھگ کِلکارتے ہوئے عورتیں کہتی ہی ہیں، ''ہے آما، دانت کنی گے'' (اوماں، دانت سن ہو گئے)۔ برتن میں پانی دیر تک ساکت رہے تو بہت باریک، گھلنے لائق ریت ناچتے ناچتے تلے بیٹھ جاتی ہے۔

راڑ گاڑی کا علاقہ شروع ہونے پر ایک آدمی اپنی تیس پینتیس بکریوں کے ساتھ نیچے آتا دکھائی

Scanned with CamScanner

دیا۔ وہ پہلا راہی تھا جو لیلم سے راڑ گاڑی تک کا راستہ طے کرنے پر ہمیں ملا تھا۔ وہ بکریوں کے آگے آگے، ہاتھ میں چلم تھامے، تمباکو پیتا ہوا آ رہا تھا۔ تھالہ، منسیاری اور لیلم میں تمباکو پینے کی سہولت نے مجھے تمباکو کا نیا نیا عادی بنا دیا تھا۔ بکری والے کے ہاتھ میں چلم دیکھ کر طلب جاگ گئی۔ میں نے اس سے کہا، ''دوی پھونک مہے لے دیا مہاراج'' (دو کش لگانے کے لیے مجھے بھی دے دو مہاراج)۔ بولی اور لہجے سے وہ بھانپ گیا کہ مجھے چلم دے سکتا ہے — ذات سمبندھ کا شک ہوتا تو وہ 'سیپ' جیسا دکھتے ہوئے بھی مجھے چلم کی بجائے حقہ تھما دیتا۔ ہاتھ میں چلم تھامے میں جلدی جلدی کش لے رہا تھا۔ گوپال بھی امیدوار بنا بغل میں کھڑا تھا۔ بکری والے نے آگے جاتی میری بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے گوپال سے پوچھا، ''جوار جانے چھائی؟'' (جو ہار جا رہے ہو؟) وہ جانچ رہا تھا کہ میری بیوی جا سکیں گی یا نہیں، آگے مسئلہ تو نہیں بن جائیں گی۔ میں نے اس سے پوچھا، ''یو باٹ جے سکلائے باکار؟'' (اس راستے جا سکیں گی بکریاں؟)

''ہاں، کیوں نہیں،'' اس نے کہا، ''خالی بکریاں تو نیچے کے راستے جا سکتی ہیں۔ خالی ہوں تو یہ جہاں آدمی نہیں جا سکتا، وہاں بھی جا سکتی ہیں۔ بوجھ پیٹھ پر ہو تو نہیں جا سکتیں۔'' بکری والا راحت کی طرح آ کر مخالف سمت کو بڑھ گیا تو میں نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا کہ دوپہر کی کھلی ہوئی دھوپ میں راڑ گاڑی بہت زندہ اور اپنائیت بھری دکھائی دے رہی ہے۔ گوری کی سطح چمک رہی تھی دھوپ میں، اور میدان مل جانے سے وہ تھوڑا اچھل کر ہماری طرف کو آ کر مڑتے ہوئے اطمینان سے بہہ رہی تھی۔ ایک چٹان کی جڑ سے مڑتے ہوئے آگے جاتی سڑک کے کنارے چھوٹا سا میدان تھا، جس میں سیاما کی چوڑی ہری بھری پتیوں نے یہاں وہاں کسی قدر شفاف ہو کر زمین کے نزدیک سائے اور روشنی کے ملاپ کو گھنا بنا دیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر سیاما کا جماؤ پالک کی 'باڑی' (چھوٹے کھیت) سا دکھتا ہے۔ اس باڑی میں دو تین جگہ بجھے ہوئے چولھے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اس پڑاؤ میں یہیں خیمے گاڑے جاتے ہوں گے۔ بینا سو ڈیڑھ سو قدم آگے نکل گئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ انھیں یاد نہیں آ رہا ہے کہ راڑ گاڑی کے بارے میں میں نے انھیں ایک دلچسپ قصہ سنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ راڑ گاڑی کی رات بہت ڈراؤنی ہوتی ہے۔ وہاں کے بھوتوں کی حرکتوں کے بارے میں کئی قصے عام ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو یہ قصہ سنایا تھا: دور پہاڑوں سے 'لاگو' (بھوت) کی آواز آتی ہے: ''ایکول چھسی دوکول؟''

Scanned with CamScanner

(اکیلا ہے یا دوسرا بھی ہے کوئی ساتھ میں؟) اور رات کے بھید بھرے سناٹے میں بھوت کی بھیا تک آواز گونجتی ہے: ''اکول چھئی دوکول؟... اکول چھئی دوکول؟... چھئی دوکول؟... چھئی دوکول؟... چھئی دوکول؟... دوکول؟... دوکول؟... کول؟... کول؟... کول؟'' خیمے میں آگ کے سہارے سویا ہوا راہی چونک کر اٹھنے پر اپنے ہوش وحواس درست رکھ سکے تو بھوت کو الو بنانے کے لیے اسے بلند آواز میں جواب دینا پڑتا ہے: ''دوکول چھئی دوکول... '' یعنی دو ہیں جی، دو ہیں، (دوکول میں دو سے زیادہ کے معنی بھی شامل ہیں) اور یہ آواز بھی رات کے سناٹے میں گونج پیدا کرتی ہے: ''دوکول چھئی دوکول... دوکول چھئی دوکول... چھئی دوکول... چھئی دوکول... دوکول... دوکول... کول... کول... کول...'' یہ جواب مل گیا تو بھوت چپ ہو جاتا ہے؛ نہ ملا، یا کہنے والا کہہ گیا کہ وہ اکیلا ہے، تو وہ پہاڑوں سے اتر کر 'تھوڑ' (اڈے) تک آتا ہے اور راہی کو کھا جاتا ہے۔

میں نے گوپال کی آزمائش کی۔ ''سنا ہے کہ یہاں راکھشس ہوتے ہیں۔ صحیح بات ہے؟''

''ہاں ہاں، ہوتے ہیں،'' اس نے شرطیہ لہجے میں مجھے یقین دلایا۔ ''بہتوں نے دیکھا ہے...''

''تیرا سر ہوتے ہیں...'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''سب جوڑے ہوئے قصے ہیں، لوگوں کو الو بنانے کے لیے (اور قصہ گوئی کا مزہ لینے کے لیے بھی)۔'' گوپال نے، جس کے 'انگ' دیوتا آتا ہے (یعنی جس پر بھوت آتا ہے)، آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا: ''رات کو کبھی یہاں اکیلے رہ کر تو دیکھو۔''

راڑ گاڑی سے بوگڑیار کے بیچ ایک جگہ چڑھائی بچانے کے لیے بہت خطرناک پگڈنڈی اور پار کرنی پڑی۔ 'پیرُو' (لینڈ سلائیڈ سے متاثر زمین) پر جمے ہوئے پتھر کھوج کھوج کر انھیں تھامے ہوئے آگے بڑھے تھے۔ وہاں ندی میں گرنے کا نہیں، اوپر سے پتھر گرنے کا خطرہ تھا۔ دن کے تیسرے پہر ہم بوگڑیار پہنچ گئے۔ ڈاک بنگلہ خالی تھا، اس لیے وہاں ٹھہرنے کا بندوبست کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بارہ میل کا سفر طے کرنے میں پچھلے دن سے بہت کم تھکان محسوس کی، لیکن مینا کافی تھک گئی تھیں اور ان کے پیروں کے چھالے بھی زیادہ تکلیف دے رہے تھے۔ خیال آیا کہ میری پیدل چلنے کی پرانی عادت تازہ ہو رہی ہے اور شہروں کی عادت دھیرے دھیرے مر رہی ہے؛ یہاں کی آب و ہوا بھی مارے رہے گی اسے۔ ستانے کی طلب نہیں ہوئی۔ فوراً ہی گوری سے ملنے والی معاون ندی دیکھنے گیا جو پاس ہی گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ سب سے پہلے اس کا غیر معمولی شفاف پن متوجہ کرتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ گہرے پانی میں بھی تہہ میں جمے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اس ندی کو وہاں تک دیکھ آیا جہاں وہ گوری سے ملتی ہے۔ کافی بڑی ہوتے ہوئے بھی گوری اس کا نیلا رنگ کنارے پر ہی دھو ڈالتی ہے، بغیر اپنے جیسا بنائے اندر نہیں آنے دیتی۔ راستے میں جتنے بھی جھرنے اور چھوٹی بڑی معاون ندیاں ملی تھیں، انھیں بھی گوری نے ایسے ہی دھو دیا تھا۔ سوچا کہ جب اتنی بڑی ندی کی نہیں چل رہی ہے تو اوروں کی کیا بساط۔ منسیاری کے نیچے چھوٹی بگڑولوٹ کر میں نے اپنی بہن سے یہ بات کہی تو اس کا چہرہ کھل گیا تھا۔ فخر سے گوری کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا، "مہاضدی ندی ہے دادا یہ۔ جَول جیوی میں جب یہ کالی ندی سے ملتی ہے تو اسے بھی میل ڈیڑھ میل تک دھکیا کر اُس طرف کر دیتی ہے۔ کالی میں اس سے دگنا پانی ہے، لیکن اس پر اُس کا بھی بس نہیں چلتا۔ اُس طرف والوں کو طعنہ دیتے ہوئے 'ملیان' (لڑکے) کہتے بھی ہیں: ندی کی طرف دیکھو، کس کی ندی جیت رہی ہے؟"

شام گھرنے پر بوگڑیار میں سوکوں کے کسی بڑے پڑاؤ کی ساری روایتی نشانیاں اور آوازیں ظاہر ہو گئیں۔ بکریوں کے جھنڈ دن بھر چر کر اپنے گلے کی گھنٹیوں کی 'ٹھن من ٹھن مُن' سمیت چوٹیوں سے نیچے اتر آئے تھے۔ 'انوالوں' (بکری چرانے والوں) کی طرح طرح کی منھ سے نکالی گئی سیٹیاں اور پکاریں — ہواواواولی... آئیاں — بکریوں کو ان کی رفتار برقرار رکھتے ہوئے 'تھوڑ' کی طرف لا رہی تھیں۔ ایک بڑی سی گپھا سے دھواں نکل رہا تھا۔ گپھا کے باہر ایک آدمی کلھاڑی سے لکڑیاں پھاڑ رہا تھا؛ ایک اور آدمی ہاتھ میں پیتل کا بڑا سا برتن تھامے پانی کی طرف آ رہا تھا۔ بکریوں کا بہت بڑا جھنڈ گپھا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید گپھا کے اندر کئی لوگ تھے۔ بکریوں کا اتنا بڑا جھنڈ یہی اشارہ دے رہا تھا۔ گوری سے ملنے والی ندی کے لمبے چوڑے پتھریلے تٹ پر خیموں کی شکل میں تین رین بسیرے بھی نمودار ہو گئے تھے۔ ان کے اندر آگ جل رہی تھی۔ اندھیرا اور گھنا ہونے پر بوگڑیار ایک بہت بڑے خاندان کے سب سے بڑے دم خم اور رعب داب والے بزرگ کی موجودگی کی طرح میرے اندر اتر آیا۔ ہندی کے زور نے 'بوگیار' کو 'بوگڑیار' بنا دیا ہے۔ وہ سوکوں کا بہت پرانا پڑاؤ ہے جو ہر موسم میں حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ تین بڑے پہاڑوں کی جڑ میں بسے اس پڑاؤ میں آندھی طوفان کا خوف نہیں ہے، باڑھ کا ڈر نہیں ہے، پتھر گرنے یا زمین کے کٹاؤ (soil erosion) کی فکر نہیں ہے۔

گھاس لکڑی کی کبھی کمی نہیں رہے گی۔ برفانی ہوا کا اثر بھی یہاں تک آتے آتے مر جاتا ہے۔ اکتوبر کے بعد جو ہار سے نیچے آتے وقت جب اولے برستے ہیں یا برف گرتی ہے تو پالتو جانور ٹھنڈ برداشت نہیں کر سکتے؛ وہ روکے نہیں رکتے اور بھاگ کر بوگڑیار تک آنے کے بعد اپنے مالکوں کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔

رات میں ڈاک بنگلے کے پاس، سڑک کے اوپر جھونپڑی میں نیچے اوپر جانے والے کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ جھونپڑی ٹھہرنے، تمباکو پینے اور آگ تاپنے کا اڈا بھی ہے اور دکان بھی۔ بات چل رہی تھی کہ اسی دن فلاں جگہ پر ملم گلیشئر دیکھنے آئے بمبئی یونیورسٹی کے تین طالب علموں کی اٹیچی کھول کر کسی نے ڈیڑھ سو روپے نکال لیے۔ میں نے بوگڑیار کے پاس ہی ان طالب علموں کو پیٹھ میں جھولا لادے، کندھوں پر برف کاٹنے کی چھوٹی کلھاڑی رکھے، نیچے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جھنجھلا کر میں نے دکاندار سے پوچھا: ''یہاں بھی اب یہ ہونے لگا ہے؟ سنا ہے کہ پہلے تو یہ بہت ایماندار علاقہ تھا۔''

''ایماندار؟'' دکاندار نے کہا، ''چوری ہوتی ہی نہیں تھی کبھی یہاں۔ اسی بوگڑیار میں ہم لوگوں کا لاکھوں کا سامان کھلے میں مہینوں پڑا رہتا تھا۔ اسے چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ اوپر سے ترپال (خیمہ جو پانی اندر نہیں جانے دیتا) ڈال کر رسی سے باندھ دیتے تھے۔ مہینے بعد آؤ، تین مہینے بعد آؤ، سامان ویسا ہی پڑا رہتا تھا۔ کیا مجال کہ کوئی لے جائے... آج میری دکان سے بھی کوئی ایک تھیلا لے گیا۔ کسی مسافر کا تھا۔ اس میں بادام تھے، چینی تھی، ٹارچ تھی... وہ بیچارا کافی آگے جا کر لوٹا تھا یہاں تک اپنا تھیلا کھوجنے... میدانوں جیسا ہو گیا ہے اب یہ علاقہ بھی۔''

میں نے اس سے پوچھا: ''یہاں کے لوگ ہی بدل گئے ہیں یا باہر سے آگئے ہیں ایسی کھوٹی نیت والے؟''

دکاندار کی بجائے کسی اور نے دبی زبان سے کہا، ''کون جانے باہر کے ہیں یا یہیں کے ہیں۔ ترقی ہو رہی ہے — ایسی ہی ترقی ہو رہی ہے...''

رات میں گہری نیند سے جاگ کر میں نے سنا کہ کوئی کواڑ کھول رہا ہے۔ میرے منھ سے کڑکتی ہوئی آواز پھوٹ پڑی: ''کون ہے؟ کون کھول رہا ہے کواڑ؟''

''میں ہوں سیپ،'' گوپال کی آواز تھی یہ۔ ''گرمی لگ رہی ہے۔ میں باہر جا رہا ہوں سونے۔

آپ کواڑ اندر سے بند کر لیجیے...''

غصے سے جھنجھنایا ہوا بدن شانت ہو گیا۔ بینا بھی جاگ گئی تھیں۔ فوراً سمجھ میں نہیں آیا کہ گوپال ٹھیک کہہ رہا ہے یا نہیں... دو تین منٹ سوچنے پر مجھے لگا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ صرف دری چادر بچھا کر اور دو پشمینے اوڑھ کر اندر سویا تھا۔ ٹھنڈے علاقے کا ہوتے ہوئے بھی ٹھنڈ اتنی کم نہیں تھی کہ وہ باہر سوئے۔ میں لپکا، باہر جا کر اندھیرے میں دیکھا کہ وہ برآمدے میں نہیں ہے، ڈاک بنگلے کے اغل بغل میں کہیں نہیں ہے۔ اندر لوٹ کر بات سمجھ میں آ گئی۔ ٹھنڈ برداشت نہ کر سکا تو سونے کے لیے دکان کے اندر چلا گیا ہے۔ وہاں چولھے کے پاس لکڑی کی بنچ ہے، اسی پر سوئے گا شاید۔ جھوٹ بول رہا تھا کہ گرمی ہو رہی ہے۔ سوچا ہوگا کہ ہم فکر مند ہو جائیں گے۔

بستر میں گھسنے پر میں گوری اور اس سے ملنے والی ندی کا 'رریوٹ گھگھوٹ' سنتا رہا کچھ دیر تک، اور پھر سو گیا۔ بوگڑیار میں باڑھ آنے پر بھی ندی ڈاک بنگلے تک نہیں آ سکتی۔

صبح تڑکے گوپال نے ہمیں جگاتے ہوئے کہا کہ آگے راستے میں تین چار جگہ برف ہے۔ اس کی آواز میں اپنی نہیں، ہماری فکر تھی۔ اس نے کہا کہ جلدی روانہ ہونا چاہیے کیونکہ بکری والوں سے آگے جانا ہے۔ بکریوں کے پیچھے چلنے یا ان کے جھنڈ کے بیچ میں سے آگے نکلنے میں بہت الجھن ہوتی ہے۔ گوری سے ملنے والی ندی کا پتھریلا ریتیلا تٹ پار کرنے تک بکریوں کے دو تین جھنڈ آگے نکل ہی گئے۔ ہمیں ان کے جھنڈ سے نکلتے ہوئے چال تیز کرنی پڑی۔ دو جھنڈوں کے پیچھے 'بُھنی کوگروں' (تبتی کتوں) کے بچے چل رہے تھے۔ نسل میں ملاوٹ نے ان کے قد میں کٹوتی کر دی ہے۔ ان دونوں کی عمر تین چار مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ انجان شخص کے پاس آنے پر بغیر غرائے اس کے پیر سونگھتے ہیں، لیکن ایسی ویسی حرکت نہیں کرتے۔ دونوں بچوں نے میرے پیر سونگھے، میری بیوی کے پیر سونگھے، اور نہ جانے کیا نتیجہ نکال کر آگے بڑھ گئے۔ بوجھ ڈھوتی ہوئی بکریاں مجھے بہت بھولی لگتی ہیں۔ وہ ان مسافروں جیسی لگتی ہیں جو خالی ہاتھ نہیں، اپنا یا کسی کا بوجھ لادے ہوئے، کندھوں پر فیتہ کسے، سفر کر رہے ہوں۔ رات دن آدمی کے ساتھ رہنے کے باوجود کچھ بکریاں اتنی پالتو اور لدّو نہیں ہو جاتیں کہ اپنی آزادروی اور فطری پن کھو بیٹھیں۔ آدمی کو قریب آتے دیکھ کر وہ کسی لدّو جانور کی طرح راستہ نہیں چھوڑ دیتیں، ٹھٹھک جاتی ہیں، آگے پیچھے، نیچے اوپر لپکتی ہیں، بدکتی ہیں، ایسی حرکت کرنے لگتی

ہیں کہ لگے ابھی لڑھک جائیں گی چٹانوں پر۔ گوپال اسی مشکل کے بچنے کا تقاضا کر رہا تھا، لیکن پھنس گیا۔ تین جھنڈ پیچھے چھوڑنے کے بعد راستہ کھل گیا۔ میں نے گوپال سے کہا کہ آگے برف ہے، تم جتنا تیز چل سکتے ہو چلو، برف کا علاقہ پار کر کے ہی ہمارے لیے رکنا۔ وہ آگے بڑھا تو میں اس کے ننگے پیروں کے روکھے سوکھے اور چرے ہوئے تلوے دیکھتا رہا کچھ دیر تک۔ برف سے کسی حد تک بچاؤ کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ تیز چلے۔ برف پر ننگے پیر چلنے کی مجبوری میں نے بھی اپنے لڑکپن میں جھیلی ہے۔ برف پر پیر پہلے ٹھٹھرتے ہیں اور ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے اس حد تک بے جان ہو جاتے ہیں کہ ٹھنڈ کے احساس سے پرے چلے جائیں۔ پھر ایک خاص طرح کی جلن شروع ہو جاتی ہے اور سُن پیروں کو جھنجھناہٹ چھیدنے لگتی ہے۔ علاج نہ کیا جائے تو برف سے جلے ہوئے اعضا زخمی ہو جاتے ہیں، ان میں داغ رہ جاتا ہے۔

پیچھے پیچھے ایک ٹھیکے دار آ رہا تھا— پھرتیلا، چال ڈھال میں بھی اور بات چیت میں بھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی کلائی میں گھماؤدار موٹھ کے سہارے لاٹھی جھول رہی تھی۔ نزدیک آ کر اس نے مخالف سمت کو جاتے کسی راہی کو روک کر پوچھا کہ جوہار میں کس گاؤں میں آلو مل سکتا ہے۔ آلو بو لینے کے بعد کسی کے پاس بچ گیا ہوگا یا نہیں؟ پھر اس نے کہا، ''کل رات بوگڑیار میں نیند نہیں آئی۔ بوگڑیار میں ندی کے 'گھگھوٹ' سے مجھے رات بھر نیند نہیں آتی ہے۔''

میں پچھلی شام اس ٹھیکے دار کو بوگڑیار میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی عادت میری پکڑ میں نہیں آئی کیونکہ میرا تجربہ یہ تھا کہ بوگڑیار میں ندی کا 'گھگھوٹ' نیند میں خلل ڈالنے کی بجائے نیند لانے میں مدد دیتا ہے۔ وہ ٹھیکے دار سالوں دوڑتے بھاگتے رہنے کے باوجود اپنی عادت کو نہیں سادھ سکا ہے کیا؟ جان پہچان بڑھنے پر اس نے مجھ سے کہا کہ شہر کی عورتیں یہاں نہیں چل سکتیں؛ آپ کی بیوی کی تعریف کی جانی چاہیے۔ میں نے مینا کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی تعریف کو کیسے وصول کر رہی ہیں۔ کوئی اثر نہیں دکھائی دیا۔ وہ سر جھکائے چل رہی تھیں۔

کچھ دور چل کر ٹھیکے دار نے راستے کے نیچے ایک بڑے پتھر پر ابھر آئی موٹی لکیروں کی ٹیڑھی میڑھی شکل کی طرف لاٹھی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''وہ دیکھیے، کسی زمانے میں سانپ یہاں تک آیا تھا۔ یہاں سے آگے نہیں جا سکا اور اسی پتھر پر جم گیا ہمیشہ کے لیے۔'' پتھر پر جمی ہوئی سانپ کی سی شکل

مقامی افواہ کی بجائے اس احساس کی طرف لے گئی کہ سانپ بچھو جیسے جانداروں کا علاقہ پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اس سے آگے بڑھنے پر ایک کلچونیا (چڑیا) اوپر چٹانوں سے اڑکر نیچے گوری کی طرف جاتے ہوئے کچھ لمحوں کے لیے سڑک کے نیچے پتھر پر بیٹھ گئی — یہ یاددہانی کراتے ہوئے کہ وہ وہاں تک موجود ہے۔ کوّے سے تھوڑا چھوٹا، کالا، پیلی چونچ والا یہ پنچھی وہاں تک دکھائی دیتا ہے جہاں کماؤں کا پھیلاؤ میدانوں کو چھوتا ہے۔ بوگڑیار سے اوپر تک اس کی موجودگی سے مجھے بہت پرانا لگاؤ ہے۔ صبح صبح کلچونیا کی باریک آواز بہت تروتازہ لگتی ہے۔ جوہار سے نیچے آتے وقت تھوڑی دور چل کر جب میں تھک جاتا تھا اور ماں کی پیٹھ پر بیٹھنے کے لیے مچلنے لگتا تھا تو کہیں دور سے آتی ہوئی کلچونیا کی آواز کی طرف دھیان دلاتی ہوئی ماں کہتی تھیں، ''چپ، چپ ہو جا بیٹے! رونا مت، یہاں نہیں روتے...'' (اس طرف یہ عقیدہ ہے کہ روتے ہوئے بچے پر بھوت پریت کا سایہ پڑنے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔) ''سن، سن تو! کلچونیا کیا کہہ رہی ہے: کہہ رہی ہے، کالی چھوں، کلچونی چھوں، بڑے باپ کی بیٹی چھوں...'' کلچونیا کی آواز کی نقل وہ ہندی میں کرتی تھیں۔ ماں کی ہندی کا کسی قدر انوکھاپن اور زیادہ تر صبح ہی بولنے والی کلچونیا کی آواز کی وہ انسانی نقل اور اسے تھالہ (ضلع الموڑا) میں بھی دیکھنے کا تجربہ کچھ اس طرح چھکا دیتا تھا کہ میں چپ ہو جاتا تھا، سو پچاس قدم اور چلنے کے لیے راضی ہو جاتا تھا۔ ماں کی ہندی میری اس وقت تک کی جانکاری کے مطابق پچھڑی ہوئی ہندی تھی۔ تب میں اسکول جانے لگا تھا۔ پتا کی ہندی میرے لیے آدرش ہندی تھی۔

جس علاقے سے ہم گزر رہے تھے، وہاں راستہ دشوار نہیں ہے، وہ چٹانیں دشوار ہیں جنھیں کھود کر راستہ بنایا گیا ہے۔ ایسے علاقوں میں میں اُن انسانوں کے بارے میں سوچتا ہوں جو سب سے پہلے ایک انجانی سرزمین کی کھوج میں نکلتے ہیں اور کسی دیس پردیس کے آخری سرے تک جان کی بازی لگاتے ہوئے جاکر وہاں کے زمینی حالات کو پرکھتے ہیں اور تہذیب کو پھیلاتے ہیں۔ پچھلے برس گنگوتری کی طرف جاتے وقت کسی نے کہا تھا کہ سب سے پہلے وہاں شنکرآچاریہ گئے تھے۔ کون جانے کون گیا تھا! تب کیسے گیا ہوگا جب کوئی راستہ نہیں تھا؟ گوری کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ جوہار کی کھوج میں نکلے ہوئے انسانوں کو اسی نے بتایا ہوگا کہ سمت کدھر ہے: کنارے کنارے جاؤ میرے منبع تک، جہاں تک جاسکتے ہو، جاؤ! پھر بھی کچھ سوال بے جواب رہ جاتے ہیں: ان لوگوں

Scanned with CamScanner

نے ان خوفناک چٹانوں کو کیسے پار کیا ہوگا؟ وقت کی سرحد نے کیسی کیسی رکاوٹیں پیدا کی ہوں گی، زادراہ کیسے ڈھویا ہوگا اور رات کیسے گزاری ہوگی؟ دشوار گذار اور نامعلوم علاقے کی طرف انھیں صرف شدید تجسس ہی لے گیا ہوگا یا جنگ میں ہار جیسی کوئی مصیبت اور جان بچانے کی کوشش؟

راستے پر برف کا پہلا انبار دکھائی دیا تو اس نے سب طرف سے دھیان کھینچ لیا۔ مشکل کا احساس دھیان کے بھٹکاؤ کو روک دیتا ہے۔ پگھلتے پگھلتے کھسکتے کھسکتے چوٹیوں سے سڑک تک آ کر جون کے مہینے تک جمی ہوئی برف گندی تو ہوتی ہی ہے، بے معنی اور بے حیا بھی لگتی ہے۔ برف پر اور جانوروں کے بجائے بکریوں کے کھروں کے نشان نہیں ابھرتے، صرف ان کا میل لپٹ جاتا ہے۔ گوبر، گھوڑوں کی لید، مینگنیوں اور جانوروں کے پیشاب سے بنی گدلی پیلی دھاریاں برف پر راستے کے نشان دکھا رہی تھیں۔ دو دو تین تین راستے بن گئے تھے کہیں کہیں۔ توازن قائم رکھنے پر دھیمی رفتار سے آگے بڑھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پیر پھسل جائے تو نیچے گوری میں گرنے کا ڈر نہیں تھا، کیونکہ وہ بھی برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پھسلنے پر بہت نیچے تک جا کر جیسے تیسے راستے تک لوٹنے کا امکان تلاش کیا جا سکتا تھا۔ آگے آگے جاتا گوپال ہمارے لیے اتنا ہی جوکھم پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

میں نے مینا سے کہا، ''دل کو مضبوط رکھو، کہیں پھسل بھی جاؤ تو گھبرانا مت۔ زیادہ چوٹ نہیں لگے گی...'' پھسلن جہاں زیادہ تھی، وہاں میں انھیں سہارا بھی دے رہا تھا، لیکن وہ یہ جتلا رہی تھیں کہ سہارا دینے سے جھنجھٹ اور بڑھ جاتا ہے۔ آگے راستہ کھل گیا۔ آدھا پون میل چل کر برف کا ایک انبار اور آیا، دو ڈھائی فرلانگ چل کر ایک انبار اور۔ اسے پار کرنے پر گوپال نظر آیا جو سڑک کے کنارے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ اس کے پیروں کا کیا حال ہے۔ ہمدردی نے بھی بھوگتے ہوئے لوگوں کا بہت بگاڑا ہے— یہ سوچا سمجھا نتیجہ بہت پہلے سے میرے ذہن میں جما ہوا ہے۔

گوپال نے کہا، ''برف بس اتنی ہی ہے، آگے نہیں ہے۔'' شاید اس نے مخالف سمت میں جاتے کسی راہی سے پوچھ لیا تھا۔

بوگڑیار سے اوپر گوری اکثر راستے سے تھوڑی دور ہٹ جاتی ہے۔ بوگڑیار تک گوری میں کئی ندیاں، جھرنے اور نالے ملتے ہیں، لیکن گوری کا پانی کہیں بھی بڑھا ہوا یا کم نہیں دکھائی دیتا۔ بوگڑیار

سے نیچے اسی کا خودسر روپ سب سے نمایاں ہے۔ بوگڑیار کے بعد ہی گوری کچھ سمٹ جاتی ہے۔ ایک موڑ پر اچانک لاٹھی تاک کر ٹھیکیدار نے گوری کے اُس پار اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''وہ دیکھیے، وہ ماپانگ دکھائی دے رہا ہے۔ آپ ایسا سمجھیے کہ جوہار اصل میں ماپانگ سے ہی شروع ہوتا ہے۔ دیکھیے، اُدھر وہ 'بھوجان' (بھوج پیڑوں کا جنگل) دکھائی دے رہا ہے۔ جوہار کے جنگل ایسے ہی ہیں، 'ہرایوں ہرایوں' جیسے (کھوئے کھوئے سے)۔ بڑا جنگل آگے نہیں ہے، سب پیچھے چھوٹ گئے۔ تھوڑا آگے جاکر آپ دیکھیں گے کہ وَنس پتیاں (نباتات) بدل گئی ہیں، گھاس بدل گئی ہے، گھاس کا رنگ بدل گیا ہے۔'' ماپانگ میں ڈھلان پر دو تین بنجر کھیت سے دکھائی دے رہے تھے۔ چاروں طرف ہریالی تھی، جس کے بیچ میں ایک سفید خیمہ چمک رہا تھا۔ نیا خیمہ دور سے اجلا چٹا دکھائی دیتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا جھنڈ بھی وہاں کافی پھیل کر چر رہا تھا۔ ماپانگ میں بستی نہیں ہے، وہ 'گواڑ' (چراگاہ) گئے ہوئے بکری والوں کا پڑاؤ ہے۔

وَنس پتیاں بدلنے لگیں تو جنگل ہی نہیں جھاڑیاں اور گھنے پودوں کے قطعے بھی چھٹنے لگے۔ پہلے سے ڈن[۳] کا گمان پیدا کرتے موٹے تنکوں کا سلسلہ اور نیلے، گلابی اور ہلکے بینگنی پھول نمودار ہوئے۔ گوپال نے کچھ ایک پودے نوچ کر سونگھتے ہوئے بتایا کہ ان سے دوا بنتی ہے۔ وہ جوہار میں جڑی بوٹیاں اکٹھے کرنے کا کام کرتا رہا ہے۔ آگے فنز (جسے اُس طرف 'سیتا کے بال' مانتے ہیں) کا پھیلاؤ کھلنے لگا۔ فنز کے باریک اور کومل تنکے ہرے بھی تھے اور سوکھے ہوئے بھی۔ اس آمیزے میں ہریالی، سوکھے تنکوں کی ہلکی پیلی رنگت کے مقابلے میں تھوڑی ہی زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ ہرے پیلے کی ملی جلی رنگت ہرا ہی ہرا دیکھتی ہوئی آنکھوں کو راحت دیتی ہے۔ ماحول کھویا کھویا سا ہو جاتا ہے۔

ہَول پانی (ساتھ ساتھ بہتی دو دھاراؤں) کے پاس ٹھیکیدار ہمیں چھوڑ کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

ٹفن کیریئر میں کھانا ساتھ لے جا رہے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ اسے رِلکوٹ میں گرم کر کے کھائیں گے اور آرام کریں گے، لیکن رِلکوٹ پہنچ کر ارادہ بدل گیا۔

---

[۳] ڈن: لہسن کی پتیوں جیسی گھاس جو سوکھ کر خوشبودار ہو جاتی ہے اور دالوں اور دوسرے کھانوں میں بگھار دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے

Scanned with CamScanner

جول پانی میں ایک آدمی جوہار سے نیچے آتا دکھائی دیا۔ اور نزدیک آنے پر میں نے پہچانا کہ اندر سنگھ ہے۔ حال احوال کے ساتھ ہی میں نے ان سے پوچھا، ''گنگھر میں اور کوئی ہے؟''

چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا، ''کون، نیتو ہے کیا؟'' (نیتو میرا گھریلو نام ہے۔) پھر اپنے چونکنے کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا، ''چہرے سے نہیں، آواز سے پہچانا تمھیں۔ آواز تمھاری اب بھی ویسی ہی ہے۔'' لگ بھگ پندرہ سال کا عرصہ پھلانگ گئی یہ بات، جب نینی تال میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اندر سنگھ کی ماں کو میری ماں نے 'دھرم بہن' مانا تھا۔ اندر سنگھ سچائی، ایمانداری، محنت اور کفایت کے بل پر آگے بڑھنے والوں کی مثال مانے جاتے ہیں۔ سیدھی چال کے ہیں، اس لیے بزرگوں کا پیشہ (بکری پالن) ہی اپنائے ہوئے ہیں۔

رلکوٹ جوہار کے راستے پر پہلا گاؤں ہے — چھوٹا اور اُجڑا ہوا سا۔ پہاڑ کی تلہٹی میں ایک طرف کو سمٹے ہوئے پانچ سات 'پاتھر چھمیں' (چوڑے پتھروں کی چھت والے) مکانوں کی حالت خستہ ہے۔ دو مکانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ بھرا پورا خاندان وہاں ایک بھی نہیں تھا، بچے بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ بچوں کے بغیر بستی بہت غیر آباد لگتی ہے۔ شاید تین چار خاندانوں کے ایک یا دو افراد ہی وہاں کھیتی کے لیے آئے تھے۔ خالی مکان ٹوٹنے کو تیار ہیں۔ گاؤں کے پاس ایک اونچی جگہ پر کچھ کھنڈر ہیں، جو شاید حال کے برسوں میں نہیں بہت پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے۔ رلکوٹ کی دُردَشا دیکھ کر دل کو اس اندیشے نے گھیر لیا کہ دوسرے گاؤں کا بھی یہی حال ہوگا۔ کسی مکان کے آنگن میں بیٹھنے کی خواہش نہیں ہوئی۔

گاؤں کو پیچھے چھوڑ کر ذرا دیر سستانے کے لیے ہم ایک بنجر کھیت پر بیٹھ گئے۔ گوپال نے وہاں سے آگے اونچائی پر دکھائی دیتے سڑک کے ایک موڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مینا سے کہا، ''بہن جی، وہ جو 'دھار' (اونچی جگہ) ہے، بس وہیں تک چڑھائی ہے۔ اس کے بعد میدان شروع ہو جاتا ہے۔'' مینا منسیاری سے رلکوٹ تک تھوڑی چڑھائی پار کرتے کرتے اکتا چکی تھیں۔ وہ میدان دیکھنے کے لیے ترس رہی تھیں۔ انھوں نے جھنجھلا کر کہا، ''جھوٹ بول رہے ہو... یہاں کہاں دھرا ہے میدان؟'' میں نے اپنی اندھی یاد کے سہارے کہا، ''ہیں، آگے میدان ہیں۔ کہیں کہیں فٹ بال کھیلنے لائق، ہیلی کاپٹر اتارنے لائق میدان ہیں۔'' بیوی کی جھنجھلاہٹ برقرار تھی۔ ''آپ کو یہاں کی کتنی

جانکاری ہے یہ میں دیکھ چکی ہوں۔ دودھ کا ڈبا تک تو لائے نہیں کہ یہاں کام آئے۔''

کھنڈر پاس آئے تو سمجھ میں آیا کہ یہ غلط جگہ چننے کے نتائج ہیں۔ جوہار میں اونچی جگہ پر بنے ہوئے مکان یہی جتلاتے ہیں کہ انھیں بنوانے والوں نے اپنے بزرگوں سے سبق نہیں لیا جنھوں نے گاؤں بسانے کے لیے ہر طرف نیچی جگہیں ہی چنی تھیں۔ پچھلے برس مانہ (گڑھوال) میں میں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ اکتوبر کے بعد برف کے طوفان اونچی جگہ پر بنے مکانوں کو زمیں بوس کر دیتے ہیں، اونچے مکانوں پر بھی حملہ کرتے ہیں اگر وہ گہری جگہ پر نہ ہوں تو۔

چڑھائی پار کرتے ہوئے بلی (مور پنکھ کے سے پودے) کی جھاڑیوں پر چار پانچ 'کیا نکاؤ' (جوہار کے کوّے، جو میدانی کوّوں سے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کی چونچ نارنجی رنگ کی ہوتی ہے) منڈلاتے ہوئے نظر آئے۔ وہ ہوا کے بہاؤ کے خلاف پر تولتے ہوئے ساکت رہنے کی کوشش کر رہے تھے اور رہ رہ کر غوطہ کھاتے ہوئے بلی کی جھاڑیوں میں شاید اپنی خوراک ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کی آواز ہوا میں تیر رہی تھی: کوآں...کوآں...کوآں... یہ آواز میرے لیے نئی نہیں تھی، لیکن اس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے اجڑی ہوئی اور اجڑتی ہوئی بستیوں کے درد کو اظہار دے رہی ہے، خالی پن اور غیر آباد پن کو ٹھوس شکل دے رہی ہے۔ ٹھیکے دار نے کہا تھا کہ جوہار ماپانگ سے شروع ہوتا ہے، لیکن مجھے لگا کہ جوہار رلکوٹ سے شروع ہوتا ہے کیونکہ وہاں کی موجودہ حالت کے اشارے یہیں سے ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔

وہ موڑ بھی ہم نے پار کر لیا لیکن ڈھلان اور چڑھائی وہاں بھی موجود تھی۔ گوپال کا تجربہ بھی چکمہ دے گیا۔ گوپال نے صفائی دی: ''ارے اسے (چڑھائی کو) تو میں بھول ہی گیا تھا۔ بہن جی، بس یہی آخری چڑھائی ہے۔ زیادہ نہیں ہے۔ اس کے بعد ختم ہو جائے گی اور ٹولہ (جہاں ہمیں جانا تھا) بھی صاف دکھائی دے گا...'' آگے جا کر گوپال کے تجربے کی سچائی ثابت ہوئی: میدان اس پار نہیں، اُس پار دکھ رہا تھا— گوری کے اُس پار جو بہت دور ہٹ کر نیچے گھاٹی میں بہہ رہی تھی۔ کافی بڑا میدان ہے وہ جس کے کچھ حصے جتے ہوئے تھے اور کچھ حصوں کو تین چار جوڑی بیل جوت رہے تھے۔ نظر فوراً وہاں سے ہٹ کر ٹولہ پر ٹک گئی۔ بڑے پہاڑی سلسلے کی چوڑی اور گہری ڈھلان میں بسے اس گاؤں میں بیس پچیس 'پاتھر چھتیں' مکان ایک طرف اور دس پندرہ مکان، دوسری طرف دکھائی دے

Scanned with CamScanner

رہے تھے۔ مکانوں کے ان دونوں جمگھٹوں کے بیچ سیڑھی نما چوڑے کھیتوں کا پھیلاؤ تھا۔ مکانوں کی دیواروں کا دھندلا پن یہ جتلا رہا تھا کہ ان میں کئی برسوں سے سفیدی نہیں ہوئی ہے۔ کیٹ (سفید مٹی) کی چمک چونے کی چمک کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی، لیکن وہ اتنی دھندلی نہیں ہوتی جتنی دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں خالی خالی نظر آ رہا تھا، لیکن بغل کے اس بڑے میدان میں جو سب سے پہلے سامنے آیا تھا، انسانی شکلیں بیٹھی ہوئی اور چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹولہ میں پانچ چھ خاندان گئے ہیں، یہ اطلاع ملنے پر ہی میں نے منسیاری میں طے کیا تھا کہ جوہار کے سفر کے لیے ہم اسے ہی اپنا 'بیس کیمپ' بنائیں گے۔ انسانی شکلوں نے نظر آ کر اس اطلاع کی تصدیق کر دی۔ اُس پار جانے کا مطلب تھا کہ ہمیں لگ بھگ چار میل اور چلنا ہے۔

اِس پار میدان شروع نہیں ہوا تھا، لیکن چڑھائی ختم ہو گئی تھی۔ پہاڑ پیچھے ہٹ رہے تھے، ان کا گھیراؤ اور جارحانہ پن ختم ہو رہا تھا۔ اِس پار اور اُس پار کی دوری کئی گنا بڑھ گئی تھی، سمتیں کھل رہی تھیں، آس پاس کی زمین پھیل رہی تھی۔ ہوا کا بہاؤ تیز ہونے سے ٹھنڈ بڑھ گئی تھی، لیکن اتنی نہیں کہ گرم کپڑوں پر پشمینہ اوڑھنے کی ضرورت پڑ جائے۔ ٹولہ پہنچنے کے لیے میل ڈیڑھ میل اور آگے جا کر گھاٹی میں اترنا تھا، گوری پار کر کے اُس طرف کی صاف دکھائی دیتی چڑھائی سے بھی نپٹنا تھا، لیکن پڑاؤ دیکھ لینے اور دھرتی اور آکاش کے کھل جانے سے دل کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

ایک اُتار پار کرتے ہی گوری پھر پاس آ گئی۔ گوری اور اس سے ملنے والی چھوٹی سی ندی کے تٹ پر ایک خیمہ دیکھ کر گوپال لپکا۔ دوپہر ڈھلنے میں دیر نہیں تھی لیکن وہ بغیر کچھ کھائے پیے بوجھ ڈھو رہا تھا۔ 'تھوڑ' (اڈا) دیکھ کر اس کا صبر تو مچلتا ہی۔ خیمے کے پاس بیٹھا وہی ٹھیکے دار تمبا کو پی رہا تھا جو ہمیں جول پانی میں چھوڑ آیا تھا۔ گوپال نے اس سے چلم لے کر مجھے دے دی۔ چولھے کے پاس بیٹھا ایک اَدھیڑ شخص روٹی پکا رہا تھا۔ ایک نوعمر لڑکا اس کی بغل میں لوہے کی پرات پر جھکا آٹا گوندھ رہا تھا۔ ٹھیکے دار کو اس تھوڑ تک پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ لڑکا اس مہمان کے لیے دوبارہ آٹا گوندھ رہا تھا۔ ایک اور لڑکے نے گوپال کے ہاتھ سے ٹفن کیریئر لے کر آگ کے نزدیک رکھتے ہوئے کہا، ''چائے بناتے لیکن دودھ نہیں ہے۔ ہم تو 'جیا' (نمکین چائے جس میں گھی ڈلتا ہے) ہی پیتے ہیں۔'' میں نے کہا، ''بنائیے، بغیر دودھ کی ہی بنائیے!'' لڑکے نے چولھے کے ایک طرف چائے کا پانی رکھ دیا۔ تین

Scanned with CamScanner

پتھروں کے چولھے میں انگاروں پر سِنکتی گیہوں کی موٹی موٹی روٹیاں دیکھ کر بھوک کی آنکھیں کھل گئیں۔ تب تک وہ جانے کہاں دبی ہوئی تھی۔ دھیان ہٹانے کے لیے میں خیمے کے پیچھے بیٹھی بکریوں کی طرف دیکھنے لگا جو اطمینان سے جگالی کر رہی تھیں۔

خیمے کے اندر سے نکل کر ایک اور نوجوان نے مجھے بتایا کہ ٹولہ میں اپنے جس سمبندھی کے گھر جا رہا ہوں، وہ تین چار دن بعد نیچے (چھوٹی بگو) لوٹ جائے گا۔ ہم ٹھیک موقعے پر پہنچ رہے ہیں اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ جوہار کے لوگوں کی ایک اس خصوصیت سے میں تب تک بھلی بھانتی واقف ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گاؤں کی ہی نہیں، دوسرے گاؤں کی بھی پکّی خبر دے سکتے ہیں۔ جس علاقے کی آبادی غائب ہو رہی ہو وہاں یہ خصوصیت شاید ابھر ہی جاتی ہے۔ وہ نوجوان ٹولہ کا ہی تھا۔ سرکاری ملازم ہے، ان دنوں چھٹی پر تھا۔ ٹھیکے دار نے کہا کہ کھانا کھا کر وہ آلو کی کھوج میں ماپا تک کی طرف جائے گا اور شام تک ملم پہنچ جائے گا۔

کھا پی کر میں طبیعت سے چلم پی ہی رہا تھا کہ سڑک پر پیچھے چھوٹ گئی بکریوں کا ریوڑ نظر آیا۔ اس وقت بکریوں کی ممکنہ رکاوٹ مجھے بھی کھل رہی تھی۔ ہم فوراً اٹھے، بکریوں کے جھنڈ کو آگے نہ جانے دینے کے لیے۔

اس پار ٹولہ کی سیدھ میں پہنچ کر سوال پیدا ہوا کہ اُس پار جانے کا راستہ کدھر ہے۔ گوری بہت نیچے آڑ میں بہہ رہی تھی۔ سڑک کے نیچے بکریاں چرتی ہوئی دِکھیں تو میں نے گوپال سے کہا کہ 'انوال' (چرواہے) کو ڈھونڈے۔ زمین پر اتر کر ٹہلتے بادلوں کی دھند چھٹ جانے پر ایک انوال نمودار ہوا۔ گوپال نے اسے آواز دی: ''ٹولہ جانے کا راستہ کدھر سے ہے؟ اُس پار جانے کے لیے پل کہاں ہے؟''

اس انوال نے کان پر ہاتھ رکھ کر گوپال کی بات سننے کی کوشش کی، لیکن تیز ہوا میں وہ کچھ نہیں سن سکا۔ اسے دھیرے دھیرے ہماری طرف بڑھتے دیکھ کر گوپال نے دو تین بار پھر آواز دی، لیکن وہ یہی اشارہ دے رہا تھا کہ صاف صاف نہیں سن رہا ہے۔ میں نے کہا: ''سنے گا وہ، نیچے جا کر پوچھو!''

گوپال سڑک پر بوجھ رکھ کر نیچے اتر گیا۔ لوٹتے ہوئے پاس آ کر اس نے کہا کہ اُس پار جانے کا راستہ نزدیک ہی ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کہاں سے نیچے اترنا ہے۔ تھکان زیادہ نہیں تھی، لیکن اُس پار ٹولہ تک کی چڑھائی اور مینا کے بدلے ہوئے مزاج کی آہٹ پا کر سوچا کہ اِس طرف مرتولی پاس ہی

Scanned with CamScanner

ہے، سمبندھی کی آڑ نہ ہوتی تو وہیں جاتے۔

گوپال نے سامنے موڑ کے نیچے چھوٹے سے میدان میں دکھائی دیتے ایک کھنڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ پہلے وہاں ایک ڈاک بنگلہ تھا، برف کے طوفان کی چپیٹ میں آ کر تباہ ہو گیا۔ چھت کی چادر اور لکڑیاں نیچے گھاٹی کی طرف چھٹک گئی تھیں۔ وہ کھنڈر متعلقہ انجینئر مہاشے کے دماغ کا حال بتا رہا تھا جس نے جوہار میں ڈاک بنگلہ بنانے کے لیے کافی ہوادار جگہ چنی تھی۔

گوپال کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہم کھنڈر کی بغل سے نیچے اترے۔ فنز کے پھیلاؤ میں بٹیا (پتھریلا پہاڑی راستہ) کہیں دکھائی دے رہی تھی، کہیں غائب تھی۔ گوپال ایسی اوٹ پٹانگ جگہوں میں بوجھ سمیت اترنے میں ماہر ہے۔ ڈھلان زیادہ خطرناک نہیں تھی اس لیے کہیں بٹیا ٹٹولتے ہوئے اور کہیں دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکتے ہوئے، خالی اندازے سے ہی بڑھ کر ہم گوری تک پہنچ گئے۔ دو بڑے پتھروں کے بیچ گھٹ جانے سے بپھری ہوئی گوری نے صرف چار لکڑیوں پر ٹکے ہوئے پل کا بندھن قبول کر لیا ہے۔ وہ خطرناک پل گاؤں والوں کی دلیری اور مجبوری کا ملا جلا نشان دکھا رہا تھا۔ وہ شاید ہر سال اسے بناتے ہوں گے اور برسات میں نکارہ جائے تو نیچے لوٹتے وقت ہٹا دیتے ہوں گے؛ نہ ہٹائیں تو اکتوبر کے بعد برف اسے توڑ دے گی یا گوری میں ٹھیل دے گی اور دوبارہ دور دور جا کر لکڑیاں جٹانے کا جھنجھٹ سر پر آ جائے گا۔ پل پار کرتے وقت اپنے جوکھم سے زیادہ گاؤں والوں کے جوکھم کا خیال آیا جو اس پر مویشیوں سمیت، بال بچوں سمیت نہ جانے کب سے اِس پار، اُس پار آ جا رہے ہیں۔ اوپر ڈاک بنگلے پر جو پیسہ برباد ہوا ہے اس سے وہاں مضبوط پل بن سکتا تھا، وہاں تک جانے کا راستہ بھی بن سکتا تھا۔

اس پار جا کر گوپال چڑھائی اور بوجھ کے باوجود تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ ٹولہ پہنچنے تک وہ ہم سے آگے ہی رہا۔ گاؤں میں گھسے تو دو تین گھروں سے بچے باہر نکل آئے۔ ایک مکان کی کھڑکی سے دو عورتیں ہماری طرف جھانکتے ہوئے شاید ہمارے بارے میں ہی بتیا رہی تھیں۔ عجوبہ شاید مجھ میں نہیں، میری بیوی میں تھا۔ وہ چلنے میں سہولت کے لیے شلوار قمیض پہنے تھیں۔ اس لباس میں انھیں دیکھ کر تھالہ میں بھی عورتوں نے شک ظاہر کیا تھا کہ کہیں وہ پنجابن تو نہیں ہیں۔ ساڑھی پہنے ہوتیں تو وہاں زیادہ سے زیادہ شہری لگتیں۔ گرم جگہوں میں لوٹ کر اب جوہار کی جوان عورتیں بھی ساڑھی پہننے

لگی ہیں۔ جوہار میں وہ ٹھنڈ کے سبب اور سہولت کے لیے بھی روایتی لباس ہی پہنتی ہیں: گھاگھرا، اس کے اوپر کمبل، کمر سادہ کپڑے کے 'پوگوز' سے بندھی رہتی ہے اور سر پر سفید کپڑے سے بنی 'کھوپی' ڈالے رہتی ہیں۔ 'کھوپی' کا اگلا حصہ ماتھے پر نکا رہتا ہے اور اس پر ہی بیل بوٹے دار پٹی جڑی رہتی ہے۔ کھوپی کا سادہ حصہ پیٹھ کی طرف جھولتا رہتا ہے۔ مردوں کو دیکھ کر عورتیں کھوپی سے ہی 'جھوپی' (گھونگھٹ) ڈالتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں گھاگھرے پر خاص طور سے بُنا اونی کمبل پہنتی ہیں جو کندھا پار کر کے پیٹھ تک جاتا ہے، اور جوان عورتیں کالا زین پہنتی ہیں۔ گڑھوال میں دور دراز کی گرامین (گاؤں کی) عورتوں کا لباس بھی لگ بھگ ایسا ہی ہے۔ جوہار میں کالا زین پہننے کا چلن تیس پینتیس سال سے زیادہ پرانا نہیں ہوگا۔ وہ تب کا نیا فیشن ہے شاید!

ہم مکانوں کے پہلے جھرمٹ سے دوسرے جھرمٹ کے نزدیک پہنچ ہی رہے تھے کہ سب سے آگے کے مکان کا آنگن پار کر ہمارے سمبندھی ہماری طرف آئے۔ گوپال نے انھیں اطلاع دے دی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں گلاس تھا، دوسرے ہاتھ سے انھوں نے ہمیں 'سیو' (پرنام) لگایا؛ جوہاریوں کا سیو سلام جیسا ہی ہوتا ہے، لیکن ہاتھ ماتھے تک نہیں اٹھتا۔ وہ کچھ گھبرائے ہوئے تھے اور 'یانت ڈھگری سار ہے رے، ڈھگری سار ہے رے' (یہاں تو بکری والوں کا سا حال ہے، یعنی خاندان نہیں ہے تو گھر میں خاندان کی ضرورت کی چیزیں بھی نہیں ہیں) کہتے کہتے تیز قدموں سے ان مکانوں کی طرف چلے گئے جنھیں ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ سمجھ میں آ گیا کہ چائے کے لیے دودھ مانگنے جا رہے ہیں۔ لوٹے تو اپنے ساتھ کھانا پکانے کے لیے ایک لڑکے کو بھی لے آئے۔ انھوں نے کہا، "میں بھی کھیت جوت کر ابھی ابھی لوٹا ہوں۔ فٹ بال کا میدان ہے وہ جسے میں جوت رہا ہوں۔ بزرگوں نے وہ میدان گاؤں کے لڑکوں کو فٹ بال کھیلنے کے لیے دے دیا تھا۔ اس وقت کھیتی پر کس کا دھیان تھا؟ کہنے والوں نے کہا بھی کہ کھیل کا میدان کیوں جوت رہے ہو؟ میں نے کہا کہ بزرگوں نے دیا تھا تو دیا تھا... کس لیے دیا تھا؟ اب یہاں لڑکے کہاں ہیں؟" پھر گمبھیر ہو کر انھوں نے مجھ سے کہا، "پر انھوں کے خاندان میں اکیلا میں ہی یہاں آ کر زمین جوت رہا ہوں۔"

میں چپ رہا، اس لیے کہ وہ کان سے بہت کم سنتے ہیں۔ چلا کر کوئی اندرونی بات کہنے میں بہت الجھن ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

رسوئی میں کھانا بنانے میں گوپال بھی مدد کر رہا تھا۔ باہر آنگن سے آواز دے کر کسی کو کچھ سمجھانے کے بعد ایک نوجوان اندر آیا۔ وہ پوری آستین کا خاکی سویٹر اور پاجامہ پہنے ہوئے کافی چست درست دکھائی دے رہا تھا؛ کچھ کچھ شہری سا اور شوقین مزاج۔ میرے سمبندھی نے اس کا تعارف کرایا۔ ''یہ پان سنگھ ہیں، پان سنگھ ٹولیا۔ ہمارے برادر ہیں۔''

پان سنگھ جی نے مسکراتے ہوئے 'سیو' (پرنام) لگا کر پہلے رسوئی کی طرف جھانکا اور پھر ہمارے آس پاس بکھرے سامان کا معائنہ کر کے یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے کہ وہ آدھے گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔

کھڑکی سے میں نے اُس پار اس راستے کی طرف دیکھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ بادل ٹہلتے ٹہلتے چوٹیوں تک چلے گئے تھے۔ فنز کے علاوہ دوسری گھاسوں کے پھیلاؤ میں بھی گاڑھی ہریالی دور دور وہیں دکھائی دے رہی تھی جہاں سیاما کا گھنا جماؤ تھا۔ سیاما وہاں زیادہ اُگتی ہے جہاں اسے مینگنی کی عمدہ کھاد مل جاتی ہے۔ مینگنی وہیں زیادہ جمع ہوتی ہے جہاں بکری والوں نے رین بسیرے بنائے ہوں۔ آنکھ کی سیدھ میں پھیلے پورے منظر میں بکریوں کے کئی ریوڑ کہیں پھیل رہے تھے، کہیں سمٹ رہے تھے۔ مرتولی میں صرف دو تین مکان اور کچھ کھدے ہوئے کھیت نظر آ رہے تھے جو اونچائی پر ہیں۔ باقی مکان اور کھیت پہاڑ کی آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ منسیاری میں سنا تھا کہ مرتولی کے پانچ سو خاندانوں میں سے ایک بھی خاندان جوہار نہیں گیا ہے۔ کچھ خاندانوں کے افراد گئے تھے، زمین جوت کر لوٹ آئے ہیں۔

جوہار میں اب زیادہ تر ایسے ہی کھیتی ہو رہی ہے۔ خاندان سمیت جانے کا جھنجھٹ چھوٹتا جا رہا ہے۔ جو خاندان کسی حد تک کھیتی پر انحصار کرتے ہیں اور جن کے پاس جوہار سامان لے جانے لائق مویشی ہیں، ان کے ایک دو افراد فصل بو کر لوٹ آتے ہیں۔ پھر گوڑائی کے لیے جاتے ہیں اور پھر فصل کاٹنے کے لیے۔ خاص روک ٹوک نہیں ہے کہ وہ اپنے کھیت ہی جوتیں۔ زمین خالی پڑی ہے، جتنا چاہو جوتو۔ جوہار کے بارہوں گاؤں کا یہی حال ہے۔ میں نے اپنے سمبندھی سے کچھ پوچھنا چاہا، لیکن زور سے بولنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ دیکھا کہ پانچ چھ بچے اندر آ گئے ہیں، جیسے گورکی کی تحریروں سے نکل کر آئے ہوں۔ پچھلے برس گڑھوال میں مانہ کے بچے دیکھ کر بھی یہی احساس ہوا تھا کہ

Scanned with CamScanner

وہ گورکی کے کردار ہیں۔ ان کی کھسر پھسر، ننھے ننھے تبصرے اور آپس میں چھیڑ چھاڑ چلتی رہی۔ میرے سمبندھی نے نقلی غصہ دکھاتے ہوئے انھیں ڈانٹا، ''کیا دیکھ رہے ہو؟ کبھی آدمی نہیں دیکھا ہے کیا؟ جاؤ بھاگو یہاں سے!''

دو تین بچے باہر چلے گئے، دو تین تختوں کی آڑ میں ہی دبک گئے۔ تھوڑی دیر بعد باہر گئے بچے بھی لوٹ آئے۔ انھیں ڈانٹنے والا زیادہ تر یک طرفہ باتوں میں اور تمباکو میں الجھا ہوا تھا۔ دو طرفہ باتوں کے لیے مجھے زور سے بولنے کی بہت کم ضرورت پڑ رہی تھی۔

کھانا کھا کر میں گاؤں کا ایک حصہ دیکھ آیا— وہ حصہ جس میں میرے سمبندھی کے سوا اور کوئی نہیں رہ رہا تھا۔ میرے سمبندھی کے مکان سے جڑا ہوا دھرم شالہ کھنڈر بن گیا ہے۔ میرے سمبندھی نے بتایا کہ گاؤں میں دو اور بھی دھرم شالے تھے جو ٹوٹ چکے ہیں۔ پاس کے اور مکانوں کی ٹوٹ پھوٹ نزدیک جا کر ہی زیادہ واضح ہو رہی تھی۔ کچھ کے دروازے اور کھڑکیاں غائب تھیں، کچھ کی ٹوٹ اور سڑ رہی تھیں۔ زمیں بوس ہونے کا انتظار کرتے ہوئے مکانوں کے دروازوں اور گوٹھوں (نچلی منزلوں) میں سیاما کی چوڑی اور صحت مند پتیاں لہلہا رہی تھیں۔ ٹوٹی، آدھی ٹوٹی اور سڑتی ہوئی کھڑکیوں پر گھاس اور کائی جم گئی ہے۔ جو دروازے کھڑکیاں بچی ہیں ان پر لگ بھگ ویسی ہی نقاشی ہے جیسے کماؤں کے سبھی علاقوں میں پرانے مکانوں کے دروازوں کھڑکیوں پر ہے۔ جو مکان بہت پرانے نہیں ہیں، ان کے دروازوں کے محراب کے بیچ میں گنیش اور لکشمی اُکیرے گئے ہیں۔ روایتی نقاشی کی یکسانیت کا ایک خاص سبب شاید یہی ہے کہ کاریگر باہر سے بلائے گئے ہوں گے۔ جوہار کے سَوک لکڑی پر نقاشی کا کام خود نہیں کرتے اور نہ مکان بنانے کے لیے درکار لکڑیاں ہی چیرتے ہیں۔ اس کے خلاف ملنے والی مثالوں کو الگ رکھ کر کہی گئی ہے یہ بات۔ میرے سمبندھی نے بتایا کہ جس مکان میں وہ رہ رہے ہیں، اس سے پیچھے ان کا ایک اور کافی بڑا مکان ہے۔ پچھلے سال سے وہ زیادہ ٹپکنے لگا ہے۔ پہلے وہ اُسی مکان میں رہتے تھے۔

کھیت کی مینڈھ پر لوٹتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نیچے کھیت کے کونے پر تین چار بچے کھیل رہے ہیں۔ پانچ چھ فٹ لمبا راستہ بنا کر اس پر بچھائے گئے پتوں کی قطار کو وہ ہاتھ سے دھیرے دھیرے کھسکا رہے تھے۔ ان کے حساب سے پتے بکریاں تھیں اور ان پر رکھے چھوٹے چھوٹے پتھر

Scanned with CamScanner

'کربچھ' (بوریاں) تھے۔ 'راستے' کے اگلے سرے پر ایک 'میدان' تھا۔ وہاں تک جو 'بکریاں' پہنچتی جا رہی تھیں، ان کے بوجھ اتارے جا رہے تھے۔

ایک اجڑتی ہوئی بستی میں اگلی پیڑھی پچھلی پیڑھی کی نقل کر رہی تھی۔

دیر تک آنگن میں بیٹھ کر میں اندر آ گیا۔ دن کا چوتھا پہر گزر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پان سنگھ جی بھی آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں دو 'دن' (غالیچے جو جوہار میں گھر گھر بنتے ہیں) تھے جنھیں میری بغل میں بچھاتے ہوئے انھوں نے کہا، ''اس پر بیٹھیے!'' پھر انھوں نے اونچی آواز میں میرے سمبندھی سے پوچھا، ''بستر کم ہوں تو لاؤں...''

میرے سمبندھی نے کہا، ''نہیں، بستر ہیں، کافی ہیں۔''

پان سنگھ جی نے کپڑے میں لپٹی ہوئی سُکھائے ہوئے ماس کی مالا[1] میرے سمبندھی کو دیتے ہوئے کہا، ''رات کو مہمانوں کے لیے یہی بنانا۔ میں بھی آؤں گا...'' پھر کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا، ''ہمارے، ایک اور مِتر (دوست) آئے ہیں... ابھی جا رہا ہوں، رات میں آؤں گا...''

رات میں میں نے گوپال کو واسطہ بنا کر اپنے سمبندھی سے ان کے گھر اور گاؤں کے حال چال پوچھے۔ وہ آواز کی بجائے ہونٹوں کی حرکت کو زیادہ سمجھ رہے تھے۔ جوہاری بولی کی میری ادائیگی شاید اتنی درست اور گھریلو نہیں تھی جتنی گوپال کی ہے، اس لیے میرے سمبندھی اُس کی باتیں زیادہ سمجھ رہے تھے۔ مجھے بولتے دیکھ کر انھیں شاید یہ گمان ہو رہا تھا کہ میں 'دیسی' (ہندی) میں بول رہا ہوں۔ ان کا حساب گڑبڑا رہا تھا۔ بات چیت کی اندرونی پرتیں کھلنے لگیں تو معلوم ہوا کہ گاؤں کی آبادی تتر بتر ہو گئی ہے۔ لوگوں کا جوہار سے لگاؤ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اگر تبت سے ختم ہو چکے کاروباری رشتے پھر سے جلائے جا سکیں تو بھی فوراً کایا پلٹ نہیں ہو جائے گا۔ جمے ہوئے لوگ ہلیں گے نہیں۔ جو اجڑ گئے ہیں وہ کیا لے کر تبت جائیں گے؟ تین چار سال تو ٹوٹے ہوئے اور ٹوٹتے مکانوں کو رہنے لائق بنانے میں ہی گزر جائیں گے۔ اچھے 'دار' (مکان بنانے میں استعمال ہونے والی لکڑیاں) بوگڑیار سے نیچے سے لانے

---

[1] جوہار میں گوشت کی بوٹیاں سکھا کر ان کی مالا بناتے ہیں اور رکھ لیتے ہیں سال چھ مہینے کے لیے؛ وہاں کی دھوپ اور ہوا میں سکھایا گیا ماس خراب نہیں ہوتا، اور لذیذ ہو جاتا ہے

پڑیں گے۔ کہاں سے کاریگر آئیں گے، کہاں سے 'پاتھر' (چھت پر بچھانے کے لیے چوڑے پتھر) آئیں گے؟... بکھرے ہوئے لوگوں کے لگاؤ بٹ گئے ہیں، دھندے بدل گئے ہیں، عادتیں بدل گئی ہیں۔ کھیتی اور بکریوں کو 'گواڑ' (چراگاہ) لے جانے کے لیے جو لوگ آئے ہیں، ان میں بھی آپسی شکررنجی ہے، نفرت ہے۔ پستی اور انتشار کے دور میں مایوسیاں اور گرُھن زیادہ نوکیلی ہو جاتی ہے، نیکی اور نیت اجڑنے لگتی ہے۔

پان سنگھ لوٹے تو وہ سرشار لگ رہے تھے۔ ان کی آواز میٹھی اور لیس دار ہو گئی تھی۔ وہ دیوار پر پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئے۔ مجھ سے انھوں نے پوچھا، ''کہاں تک جائیں گے؟ مِلَم تک؟ گلیشئر دیکھ کر ہی لوٹیں گے شاید... جائیے، لیکن کل نہیں، پرسوں۔ کل ہم سواگت کریں گے آپ کا... بکری ماریں گے...''

میرے سمبندھی کا ردعمل جاننا مشکل تھا، اس لیے ان پر حوصلہ افزائی کا دھاوا بولتے ہوئے انھوں نے ایک ہاتھ ہلا ہلا کر کہا، ''کل بکری مارتے ہیں۔ ہم جنگل جا کر لے آتا ہوں ایک بکری... دیکھی جائے گی۔ دوستوں کا سواگت کرنے کا ایسا موقع کب ملتا ہے؟ کمائی دھمائی تو چلتی رہتی ہے۔ کہاں سے آئے ہیں یہ لوگ؟ یہیں کیوں آئے؟ مجھیے کہ یہیں کیوں آئے۔ گنگھر کیوں نہیں گئے، بُرفو کیوں نہیں گئے؟ اپنا سمجھا تبھی تو یہاں آئے ہیں۔ کتنا روپیہ خرچ کر کے آئے ہوں گے؟ ہم ان سے ملنے جائیں تو جا سکیں گے؟ ہزار دو ہزار روپیہ گانٹھ میں باندھ کر جائیں گے تو بھی ان سے نہیں مل سکیں گے...'' اپنی آواز کا مزہ انھیں بھا گیا تھا اس لیے پل بھر رک کر اسے تھوڑا اور ترچھا بناتے ہوئے انھوں نے کہا، ''ہم ان سے ملنا چاہیں تو بھی نہیں مل سکیں گے، سمجھے بھلے مانس! دلّی کی بھیڑ میں 'بھمری' (بھٹک) جائیں گے... کہاں رہا بلند وانی، کہاں رہا مرادآباد، کہاں رہا بریلی اور کہاں رہا دلّی...''

میرے سمبندھی نے دو تین بار سر ہلا کر اس طرح اپنا ردعمل ظاہر کیا کہ جیسے وہ دوسرے دن اسّی سو روپے کا خون کر ہی دیں گے۔ اپنے روزگار کا حال بتاتے ہوئے پان سنگھ جی نے یہ احساس کرایا کہ جیسے وہ اس میں زیادہ مشغول نہیں ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔ وہ اندر سے اس گرد و پیش میں بھی نہیں ہیں جہاں وہ ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کا روزگار میں زیادہ مشغول نہ ہونا لحاتی جوش یا موج کی اپج نہیں ہے۔ لگ بھگ پینتیس برس پار کرنے کے باوجود وہ غیر شادی شدہ ہیں۔ روزگار کو جب چاہیں الگ رکھ سکتے ہیں، جب چاہیں اسے اوڑھ سکتے ہیں۔ جو دنیاداری آس پاس ہے وہ ان کے

لیے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ''دو سو کے لگ بھگ بکریاں ہیں،'' انھوں نے کہا۔ ''نوکروں کو سونپ رکھی ہیں۔ میں بھی دیکھ بھال کرتا ہوں، کرنا پڑتا ہے۔ اپنا کام ہے... زمانہ بدل گیا ہے۔ کوئی دکاندار بن گیا، کوئی پڑھ لکھ کر 'سیپ' (صاحب) بن گیا۔ چھوٹا سیپ، بڑا سیپ۔ ہم کیا بنتے؟ پڑھے لکھے ہوتے تو بنتے... ہمیں تو آخر بکریوں کی پونچھ ہی مروڑنی ہے۔ وہی سیکھا ہے...''

گوپال کا شرمیلا پن اور رہا سہا پرایا پن میری اور میرے سمبندھی کی بات چیت میں واسطہ بن کر کافی اتر چکا تھا۔ ''ہڑک بجانا جانتے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''جانتے ہو تو مانگ لاؤ کہیں سے...'' میں نے یہ سوچ کر ہی اس سے فرمائش کی تھی کہ شوقین مزاج ہے، کماؤں کے اس مقبول ساز کو بجانا جانتا ہی ہوگا۔ اس ساز کی بناوٹ ڈمرو جیسی ہوتی ہے؛ ڈمرو سے تھوڑا بڑا اور لمبا۔ اسے کندھے پر لٹکا کر ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے تھاپ دے کر بجاتے ہیں۔

گوپال اٹھا اور ایک کونے میں چھت کے 'دار' (شہتیر) سے لٹکی ہوئی کوئی چیز اٹھا لایا۔ نزدیک آ کر لالٹین کے اجالے میں اس نے بغیر مڑھے ہوئے ہڑک کا کھوکھل الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے میرے سمبندھی سے کہا، ''اسے کیوں ڈال رکھا ہے کونے میں؟ مڑھواتے کیوں نہیں؟''

ہڑک کے کھوکھل پر باہر اندر سے دھویں کی کالک پتی ہوئی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میرے سمبندھی نے کہا، ''تو نے دیکھ لیا تھا اسے؟ دن میں دیکھ لیا ہوگا۔ بزرگوں کا شوق تھا، انھی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وہ زمانہ کہاں رہ گیا ہے اب۔ اسے مڑھوانے کی کسے فرصت ہے۔''

کھوکھل کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے میں گوپال سے کہا، ''ہٹاؤ اسے! ایسے ہی سناؤ کچھ، گیت ہی سہی، جاگر ہی سہی... 'مالوشاہی'[۵] یاد ہو تو وہی سناؤ...''

گوپال رسوئی سے ایک تھالی لا کر اسے بجاتے ہوئے گانے لگا، لیکن بغیر باجے کے دیر تک جم نہیں سکا۔ ماحول پھیکا پھیکا ہو گیا تھا۔ گانا سننے کی بجائے اسے بند کروانے کی خواہش زور پکڑنے لگی۔ پتا نہیں میرے سمبندھی کتنا سن رہے تھے، کتنا نہیں سن رہے تھے، لیکن گانا بند کروانے کی پہل انھوں نے ہی کی۔ ''اب بلا بند کرو! پان سنگھ اونگھ رہا ہے...''

منڈلی برخاست ہو گئی۔ لالٹین بجھانے کے بعد ایک سونا پن باقی رہ گیا تھا۔ تصور میں کچھ دیر

---

[۵] 'کماؤں کی آلھا اودل' کی طرح مشہور منظوم لوک داستان۔ اس کی کسی قدر تفصیل تعارف میں دی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

تک بڑک کا کھوکھل نمودار ہوتا رہا۔ باہر دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ کھڑکی کی طرف گردن موڑنے پہ نظر سیدھے اُس پار چلی گئی — بہت دور بے آواز بہتی، نظر سے اوجھل گوری کے اُس پار۔ وہاں آگ کے اجالے میں تین خیموں کے دھندلے نشان ابھر آئے تھے۔ رات کی ویرانی بہت گھنی ہوگئی تھی۔ چاروں طرف سناٹے اور نپٹ اندھیرے کے پھیلاؤ کے خلاف آگ کا اجالا اور آدمی کی دلیری...اوپر آسمان میں بادلوں کے پیچھے بجلی کی چمک تیزی سے گھوم گھوم کر کوندھ رہی تھی، یہاں، وہاں، سب طرف۔ وہ کچھ دیر تک تیز رفتاری سے میری نظروں کو دور دور تک نچاتی رہی۔ اکا دکا بادلوں سے بے آواز باہر لپک کر بھی بجلی آنکھیں چوندھیا رہی تھی۔ اچانک کتوں نے آسمان سے خیموں کے دھندلے نشانوں کی طرف دھیان کھینچ لیا۔ نسل کے بدل جانے کے باوجود تبتی کتوں کی اولادوں کی آواز کی بھاری گمک برقرار ہے۔ جانے کس کی آہٹ کو ہدف بنا کر وہ بھونک رہے تھے: ہوانگ...ہوانگ... ہوانگ...ہوانگ...ہوانگ...ہوانگ...ہوانگ...

صبح آکر پان سنگھ جی نے کہا کہ وہ جنگل جا رہے ہیں، ہم چاہیں تو ان کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ ان کی مٹھی میں رتی دبی ہوئی تھی۔ جنگل جانے کا سبب وہ پچھلی رات بتا چکے تھے۔ موسم نکھرا ہوا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا، ”راتپا کے پھول کھلے ہیں ان دنوں؟ نزدیک کہیں ہوں تو ہم بھی چلتے ہیں۔ بگیال تو نہیں جا سکیں گے کیونکہ یہ (مینا) تھک گئی ہیں۔“

پان سنگھ جی نے کہا کہ جہاں وہ جا رہے ہیں وہاں ’راتپان‘ (راتپا کا جنگل) ہی ہے۔ گوپال بھی بغیر کہے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اس دن وہ ہمارے ساتھ پہلی بار بغیر بوجھ کے چل رہا تھا۔ گاؤں کے بغل میں ایک نالہ ہے، جسے پار کرنے پر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کھیتوں کی مینڈھ کے اغل بغل اُگی سیاپال اور شرکتی کی جھاڑیاں سدا موجود کی طرح سامنے آئیں۔ بچپن میں ان کے چھوٹے چھوٹے دانے توڑ کر کھاتے وقت کانٹوں کی پروا نہیں رہتی تھی۔ ان کی جھاڑی میں کبھی چڑیا کا گھونسلہ دکھ جائے تو اور ساتھیوں کو نہ بتانے کی قسم کھانی پڑتی تھی۔ سیاپال اور شرکتی کی جھاڑیوں میں ان دنوں وہ رنگت نہیں تھی جو ان میں پھل آنے پر آجاتی ہے۔ گاؤں کے اوپر دھینو کے پست قد پیڑ بھی ہیں، جنھیں دیکھ کر مجھے سب سے پہلے یہ یاد آتا ہے کہ اس کے بیجوں کو بھالو بڑے چاؤ سے کھاتا ہے۔ بھالو کے گوبر میں دھینو کے بیج دیکھنے پر یہ بات مجھے کسی نے بتائی تھی۔ دھینو کے بڑے بڑے

گول اور گھنے پتے زمین تک پھیلے رہتے ہیں۔ جوہار کے گاؤوں میں دھینو شاید ٹولہ میں ہی ہے۔ وہیں کی آب و ہوا دھینو کے لیے موزوں ہے شاید، لیکن بھالو کے لیے موزوں نہیں ہے۔ جوہار میں بھالو کہیں نہیں ہوتا۔ نہ باگھ ہوتا ہے۔ انسان پر حملہ کرنے والا کوئی جانور وہاں نہیں ہوتا۔ جوہار میں 'راگان' (فر کے جنگل) بھی ٹولہ میں ہی سب سے نزدیک ہیں۔ راگان، راتپان اور بھوجان کی رنگت بنیلے (بن یا جنگل کے) پیڑوں سے الگ ہوتی ہے۔ ان کی کھوئی کھوئی سی، اُنیندی اور خوبصورت رنگت گہری سطح پر اشوک اور سپت پرنی جیسے، باغ باغیچوں میں اُگے ہوئے پیڑوں کی رنگت سے مختلف ہوتی ہے۔ ان کی پر اسرار نزاکت من کو اونچائیوں کی طرف لے جاتی ہے، ہواؤں اور بادلوں کی طرف لے جاتی ہے، آکاش کی طرف لے جاتی ہے۔

جُتے ہوئے کھیتوں میں کھاد بہت کم بچھی ہوئی تھی۔ میں نے پان سنگھ سے پوچھا، ''یہاں لوگ کھیتوں میں زیادہ محنت تو نہیں کرتے... فصل کیسی ہوتی ہے؟''

''جو بوؤ وہ اچھا ہی ہوتا ہے،'' پان سنگھ نے کہا، ''رائی، اُوا، پھاپر، آلو وغیرہ، جو بوؤ وہ ہوتا ہے۔ آلو الٹے ہاتھ سے بوؤ تو بھی ہو جاتا ہے۔ لوگ اب یہاں ایک خاص طرح کا گیہوں بھی بونے لگے ہیں۔ وہ بھی خوب ہوتا ہے... رائی حال کے برسوں میں تین سو روپیہ کوئنٹل (شاید من کہا ہو) تک بِکا ہے... ایسی زمین تو شاید کہیں نہیں ہوگی جہاں بغیر کوشش کیے تین ہی مہینے میں فصل تیار ہو جاتی ہے۔ سَوکوں نے کھیتی کب کی پورے من سے؟ اب لاچاری میں کر رہے ہیں۔ کسان بن گئے ہیں۔ اچھا ہے...'' کچھ دیر تک چاروں طرف دیکھتے ہوئے پان سنگھ جی نے کہا، ''آپ سمجھ رہے ہیں کہ کیسی آب و ہوا ہے یہاں کی؟ یہ جھاڑیاں پودے اور گھاس تو چیت بیتنے پر ہی تھوڑا تھوڑا پنپتے ہیں، اسی لیے یہاں ویسی ہریالی نہیں ہے جیسی آپ نے نیچے دیکھی ہوگی۔ بھادوں کے بعد ٹھنڈ اور برف سے پانی کی ونس پتیاں (نباتات) پہلے لال اور پھر کالی ہو جاتی ہیں۔ کوار کارتک سے چیت تک ساری دھرتی برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ ایسی آب و ہوا ہے یہاں کی۔ تین ہی مہینے میں فصل تیار ہو جاتی ہے۔ بھگوان کی ہی مایا ہے۔'' ڈیڑھ میل تک لگ بھگ کھڑی چڑھائی چڑھ کر ہم بکری والوں کے تھوڑ (اڈے) میں پہنچے۔ چوٹیاں وہاں سے ڈیڑھ دو میل اور اوپر تھیں۔ تھوڑ کی طرف جانے کی بجائے میں لپکا راتپان کی طرف۔ راتپا کے تازہ اور پوری طرح درست پھول بہت کم دکھائی دے رہے تھے، اس لیے اطمینان

Scanned with CamScanner

نہیں ہوا۔ باقی پھولوں کی پنکھڑیاں جھڑ گئی تھیں یا انھیں بکریاں کھا گئی تھیں۔ راتپا کا پھول رنگ میں نہیں، شکل صورت میں بُرانس کے پھول جیسا ہی ہوتا ہے جو کماؤں کا سب سے بڑا جنگلی پھول ہے۔ برانس کے پھول کا رنگ گہرا لال ہوتا ہے، راتپا کا پھول سفید ہوتا ہے۔ پتیاں بھی کچھ کچھ برانس کی سی ہوتی ہیں۔ راتپا کی برانس جیسی ہی گول گول اور آگے سے پھیل کر کھلی ہوئی پنکھڑیوں پر گلابی چھینٹے ہوتے ہیں — کسی پر کم، کسی پر زیادہ۔ چن چن کر کچھ پھول توڑ کر میں تھوڑ کی طرف لوٹا۔ بانہوں میں راتپا کے پھولوں کا اجالا آ گیا تھا۔ وہ تیز خواہش پورے جوش سے تھر تھرا کر تھم رہی تھی جو مجھے کھینچ کر راتپان کی طرف لے گئی.... بہت دنوں سے نہ دیکھے ہوئے پھولوں کو دیکھنے کی ایسی طلب کیا ابھی تک اتنی بچی ہوئی ہے؟... بچپن میں جو ہار سے تھالہ لوٹتے وقت دھرم گھر میں گلاب دیکھنے کے لیے بھی ایسی ہی تیز خواہش، توانائی اور جوش سے کلیجہ کانپنے لگتا تھا۔ قافلہ چھوڑ کر میں آدھے پون میل سے ہی بھاگتا تھا گلابوں کی طرف۔ اس علاقے میں تب شاید صرف دھرم گھر میں ہی گلاب تھے، کہیں اور ہوں گے بھی تو اتنے نہیں تھے۔ ایک کشش یہ بھی تھی کہ جن گھروں کے آنگن کے آس پاس گلاب کھلے رہتے تھے وہاں میں چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پہنے اوکھلی کوٹتی ہوئی یا سوپ (چھاج) میں دھان گیہوں پھٹکتی ہوئی مسلمان عورتوں کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پہنے وہ عورتیں عجوبہ تھیں میرے لیے۔ تب اُس طرف مسلمانوں کی بستی بھی شاید دھرم گھر میں ہی تھی۔ دھرم گھر مجھے جب بھی یاد آتا ہے، گلابوں اور مسلمانوں کی بستی کے ساتھ یاد آتا ہے۔ اتفاق کی بات، جب بھی میں دھرم گھر سے گزرا، مسلمانوں کی بستی میں عورتوں کو ہی دیکھ سکا، مردوں کو نہیں۔ ایک بار میں نے ماں سے پوچھا تھا، ''مسلمان کیسے ہوتے ہیں؟'' ماں نے کہا، ''آدمی جیسے ہی ہوتے ہیں، لیکن ان کی چٹیا نہیں ہوتی۔ وہ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں، جس پر کالے دھاگے کی نقلی چٹیا لٹکتی رہتی ہے۔'' اپنی چٹیا اور نقلی چٹیا کے فرق پر سوچ سوچ کر میں حیران ہو گیا تھا: کیسے عجیب ہوتے ہوں گے مسلمان، جو اصلی چٹیا کے بجائے نقلی چٹیا رکھتے ہیں... اس دیس کے کئی حصوں میں اصلی چٹیا اور نقلی چٹیا سے اوپر جانے میں ہی بہت وقت گزر جاتا ہے۔

بکریاں پان سنگھ جی کی نہیں، کسی اور کی تھیں۔ تھوڑ میں ہمارے علاوہ تین آدمی تھے۔ دو نوجوان اور ایک ادھیڑ۔ ایک نوجوان چائے بنا رہا تھا۔ ادھیڑ شخص میرے ساتھ تمبا کو پی رہا تھا۔ تھوڑی

تھوڑی دیر میں ہم نال کا رخ ایک دوسرے کی طرف کر دیتے۔ پان سنگھ کو تمبا کو بیڑی سگریٹ کی عادت نہیں ہے۔ میں نے ان سے پوچھا، ''بگیال کتنی دور ہے یہاں سے؟''

اوپر لگ بھگ ڈیڑھ میل دور چوٹیوں کے نیچے کی ڈھلان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پان سنگھ جی نے کہا، ''وہاں، وہ ساری پٹی بگیال ہی بگیال ہے۔ اس اونچائی پر بگیال ہی ہوتے ہیں— پہاڑ کے پیچھے بھی ہیں۔ ابھی یہاں سے نہیں پہچان سکیں گے آپ۔ بعد میں بگیالوں کی سنہری گھاس الگ دکھائی دیتی ہے۔ بہت باریک اور کومل ہوتی ہے، جیسے ریشم بچھی ہو...''

جوہار کی فطری خصوصیتوں کے بارے میں بولتے ہوئے جوہاری جذبے کالمس دینے میں کوئی کمی نہیں رہنے دیتے— اُنیندی اور للک بھری باتیں۔ دھرم کے بھٹکاؤ کا عنصر بھی ان کی باتوں میں بہت ہوتا ہے، جس سے فطرت کا حسن مبالغہ آمیز نہیں رہ جاتا۔ بگیالوں کو 'انوال' بھی بکری یا بکری والوں کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بگیالوں میں گھومتے ہوئے وہ آن بانوں (دیوتاؤں کے پہریدار یا گھڑیال بجانے والے) اور آنچریوں (دیوبالاؤں) کے ڈر سے پھول نہیں توڑتے، پانی کے چشموں کے آس پاس جوٹھن نہیں ڈالتے، بانسری نہیں بجاتے۔ لیکن پان سنگھ جی کی باتوں دھرم کی مشغولیت کا عنصر بہت کم ہے، جیسے مادّی مشغولیتوں کا عنصر بھی کم ہے۔ میں نے ان سے پوچھا، ''یہاں باگھ کا ڈر تو نہیں ہے۔ نقصان کم ہوتا ہوگا...''

''باگھ نہیں ہیں،'' انھوں نے کہا، ''لیکن چینگ گو[1] ہوتے ہیں۔ باگھ تو ایک دو بکری مار کر اپنا 'بھاگ' (حصہ) پورا کر لیتا ہے، لیکن چینگ گو اتنا کھاتا نہیں جتنا مار دیتا ہے۔ بکریوں کو مار مار کر دَل دیتا ہے۔ یہاں وِشان[2] بھی ہیں...''

''وِش ہوتا ہے یہاں؟'' میں نے پوچھا۔

انھوں نے کہا، ''ہاں، وِش بھی ہے، نروِشی بھی ہے۔ بکریاں وِش کھا کر مر جاتی ہیں، کچھ بچ بھی جاتی ہیں۔ بے ہوشی میں جھاگ نکلتا ہے ان کے منہ سے... نقصان کے بھی سو بہانے ہیں۔ بکریاں تو

---

[1] میں نے اس درندے کو نہیں دیکھا ہے۔ سنا ہے کہ وہ بھیڑیا جیسا ہوتا ہے۔ آدمی اور سینگ والے بڑے جانوروں پر حملہ نہیں کرتا۔

[2] وہ قطعہ جہاں وِش کے زہریلے پودے اگے ہوں۔

'رکت دھن' (خون کی دولت) ہیں۔''

خیمے کے پیچھے بکریاں جگالی کر رہی تھیں، کچھ اُلسا کر اونگھ رہی تھیں، کچھ کی آنکھیں بند تھیں۔ ایکا ایک دو مینڈھوں کی لڑائی نے سکون اور ٹھہراؤ میں خلل ڈال دیا۔ پہلے دونوں ایک دوسرے کو تاکے، الٹا چلتے ہوئے دس بیس قدم پیچھے ہٹ جاتے اور پھر دوڑ کر پوری طاقت سے ٹوٹ پڑتے ایک دوسرے پر۔ دونوں کے ماتھے اور سینگ کی ٹکر سے زوردار دھماکا ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک یہ جھڑپ تفریح کا سامان کرتی رہی، لیکن بعد میں میں بے چین ہو گیا۔ مینڈھوں کے کان کے پاس سے پیچھے کو گھوم کر مڑے ہوئے سینگوں کا ان کے اس جان لیوا ہنگامے سے کوئی میل نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک عجب تضاد! بکریوں کی جات برداری میں ایسی اوٹ پٹانگ ہنسا مجھے اہنسا کا مخول سا لگ رہی تھی۔ چلم کی نال مانگ کر منھ سے لگاتے ہوئے میں نے اس ادھیڑ شخص سے کہا، ''روکیے انھیں، روکیے! کیوں نہیں روک رہے ہیں؟ مر جائیں گے تو؟''

انھوں نے بڑے اطمینان سے کہا، ''لڑنے دیجیے، دیکھیے تماشا۔ یہ کیا لڑائی ہے! یہ تو دن بھر لڑتے ہیں۔ کھلی جگہ مل جائے تو سو ڈیڑھ سو قدم پیچھے جا کر دوڑتے ہیں سینگ اور ماتھا ٹکرانے کے لیے۔ کبھی کبھی سینگ اکھڑ کر چھٹک جاتے ہیں، ماتھا پھوٹ جاتا ہے۔ ان کے سینگ دیکھو اور غصہ دیکھو! غصے میں ان کی گردن کے بال جھٹکے کھا کھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑائی بند کروانی ہو تو کسی ایک کو آڑ میں لے جا کر چھپانا پڑتا ہے، تب کہیں دوسرا اشانت ہوتا ہے۔''

میں مینڈھوں کی گردن کے بال دیکھنے کی تاک میں تھا، لیکن لڑائی جاری نہیں رہ سکی۔ زمین پر دبوچ گئے ایک مینڈھے نے ہار مان لی تھی اور دوسرے نے دو تین دھکے اور دے کر بس کر دیا۔ میں نے اس ادھیڑ شخص سے پوچھا، ''یہ مینڈھے یہاں کے تو نہیں ہیں، کہاں سے لائے گئے ہیں؟''

''بکری والوں کو نسل سدھارنے کے لیے سرکار نے دیے ہیں،'' اس نے کہا، ''بڑی زبردست نسل ہے... کہیں باہر (پردیس) کے ہوں گے۔''

ٹولہ کے گواڑ (چراگاہ) تک پہنچے سرکاری مینڈھوں کی طرف ایک بار غور سے دیکھتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا، ''مفت میں دیے ہیں یا دام چکانا پڑتا ہے؟''

''مفت میں ہی دیے ہیں۔ مدد ہی سمجھیے۔ لیکن مر جائیں تو لکھ کر بیان دینا پڑتا ہے کہ کیسے

مرے، کب مرے...''

گاؤں لوٹتے ہوئے میں نے مینا سے کہا کہ تیز چلیں، پان سنگھ جی اور گوپال کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ لوگ بکری لائیں گے مارنے کے لیے تو اسے دیکھ کر دل خراب ہوگا۔ مینا کو میری بات جچ گئی کیونکہ میرے اندر جو نیکی پھڑ پھڑا رہی تھی وہ ان کے اندر بھی تھی۔ ماس کھا کر 'اپر تیکنکش ہنسا ہنسا نہ بھوتی' (بالواسطہ تشدد تشدد نہیں ہوتا) جیسی کئی اور بھی نیکیاں میرے اندر پھنسی ہوئی ہیں، جنھیں باہر نکالنا شاید اس جنم میں ممکن نہیں۔ بڑی مجبوری کی صورت حال ہے یہ! اتار کے بعد نالہ پار کر کے کھیتوں کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اوپر اتار میں پچاس ساٹھ قدم آگے گوپال آ رہا تھا، پیچھے پیچھے پان سنگھ جی آ رہے تھے۔ دونوں خالی ہاتھ تھے۔ دل کو کچھ سکون ہوا۔ ڈیرے پر لوٹے تو کچھ دیر بعد پہلے گوپال اندر آیا، پھر پان سنگھ جی۔ منصوبہ تب بھی برقرار تھا۔ پان سنگھ جی نے گوپال سے کہا کہ فلاں بکری والے سے وہ قیمت طے کر چکے ہیں۔ کھانا کھا کر وہ گواڑ چلا جائے اور بکری لے آئے۔ گوپال خوشی سے تیار ہوگیا۔ ماس کھانے کے لیے اس کے ہاڑ ہنستے ہیں۔ کھانا کھا کر وہ فوراً روانہ ہوگیا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد لوٹا تو بھی وہ خالی ہاتھ تھا۔ ''اس بکری والے کو میں ڈھونڈتا رہا، اوپر دھار تک کہیں نہیں ملا،'' اس نے کہا۔ ''بکری چراتے چراتے نہ جانے کس طرف نکل گیا ہے۔''

یہی بات وہ میرے سمبندھی کو بھی بتانے لگا تو میرے منھ سے بے ساختہ نکل گیا، ''اچھا ہوا وہ تمھیں نہیں ملا۔ مارو گولی بکری کو!'' میرے سمبندھی ساری لیلا کے خاموش تماشائی تھے۔ اس قصے کو ختم کرواتے ہوئے انھیں کہنا پڑا، ''اب مت جانا بکری کے چکر میں۔ کھیت جوت کر مجھے جلد سے جلد نیچے لوٹنا ہے۔ یہ (میری طرف اشارہ کر کے) یہاں ہیں، پھر بھی صبح سے دوپہر تک ہل جوتتا رہتا ہوں۔ ایسے جھنجھٹ کی کسے فرصت ہے۔ بچے بھی یہاں نہیں ہیں۔ لیکن پان سنگھ تو پان سنگھ ہی ہے، ہماری سنے گا وہ؟''

''مرلی میں نے بیچ دی ہے سیپ،'' گوپال نے بغیر کسی سیاق و سباق کے اچانک کہا، ''دو روپے میں لی تھی، ڈیڑھ روپے میں بیچ دی...''

''واہ، بڑی اچھی دکانداری کی ہے تم نے،'' میں نے کہا، ''آٹھ آنے کا فائدہ ہوگیا تمھیں!...''

''خراب ہوگئی تھی وہ۔ اس لڑکے نے کہا کہ یہاں اکیلے من نہیں لگتا، مجھے دے دو، میں اسے

Scanned with CamScanner

ٹھیک کرلوں گا...''

''دینا تھا تو دے دیتے، ڈیڑھ روپیہ لینا ضروری تھا کیا؟''

''نہیں سیپ...'' گوپال نے کہا،'' قیمت تو مجھے لینی ہی پڑتی۔ مفت میں دیتا تو اسے میرا دیوتا لگ جاتا۔ میرے اوپر دیوتا آتا ہے۔ مرلی تو اُسی (دیوتا) کی تھی...لوٹتے ہوے چار آنے وہاں چڑھا آیا ہوں، جہاں 'تھار' (ہرن جیسا جنگلی جانور) کے سینگ رکھے ہیں اور 'نیازا' (کپڑے کے رنگین چیتھڑے) چڑھائے گئے ہیں۔ نالے کے پار آپ نے بھی دیکھا ہوگا...''

رات میں طے ہوگیا تھا کہ مِلم جاکر ہم بُرفو لوٹ آئیں گے۔ پُل نہ ہونے کی وجہ سے گوری کے اُس پار گنکھر نہ جاسکیں گے۔ مِلم میں ایسا کوئی شناسا خاندان نہیں ہے جو رات میں تین لوگوں کے لیے بستر کا انتظام کرسکے۔ گوپال سے میں نے کہا،'' دو پشمینے ہیں ہی، اپنے لیے ایک اور تم اِن سے (میرے سمبندھی سے) مانگ لو۔ اور کوئی سامان تم نہیں لے جاؤگے۔ ناشتہ ساتھ لے جانے کا جھنجھٹ بھی ٹال دو، آگے دیکھا جائے گا۔ سات میل مِلم اور پھر برفو تک پانچ میل واپسی — کل بارہ میل۔ ایک دن میں اتنا چل کر کیا کیا دیکھ سکیں گے؟'' میں نے موٹا حساب تیار کیا کہ جیسے تیسے بُرفو تو رات تک لوٹنا ہی پڑے گا کیونکہ دوسرے دن صبح گنکھر جاکر بگیال اور نندا گھونگٹی تو دیکھنا ہی ہے اور رات تک ٹولہ لوٹنا ہے۔ نیچے منسیاری تک بارش کا نہ جانے کیا حال ہے۔ راستہ ٹوٹ گیا تو نہ جانے کتنے دن رکنا پڑے۔ پان سنگھ جی نے کہا کہ صبح وہ بھی ہمارے ساتھ برفو تک جارہے ہیں، وہاں ہمارے لیے مناسب انتظام کرکے لوٹ آئیں گے۔

صبح ہم چلے تو بارش ہوکر تھم چکی تھی، اندیشہ تھا کہ اور ہوگی۔ روانہ ہوتے وقت میرے سمبندھی نے کہا کہ اس پار ٹولہ سے مِلم تک اُس راستے سے نہ جائیں جو تبت سے رشتے کٹنے کے بعد مرمت نہ ہوسکنے اور آواجاہی گھٹ جانے کی وجہ سے اُجڑ رہا ہے۔ بارش میں یا بارش کے فوراً بعد پتھر گرنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ہم اُس پار جاکر آگے اِس پار لوٹیں۔ برفو کے بعد پتھر گرنے کا زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ پان سنگھ جی کندھوں پر ایک تھیلا رکھے ساتھ چل رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ برفو میں وہ ہمیں جن کے گھر میں لے جارہے تھے، وہ ان کے سمبندھی تھے اور میرے بھی۔ میرا سمبندھ جیسے لمبے عرصے تک اندھیری کھوہوں میں بھٹک کر لوٹ رہا تھا۔ اُن کا سمبندھ زندہ تھا۔ جو ہار

کے حالات اب مہمان داری کے لائق نہیں رہ گئے ہیں۔ کون جانے کس کے پاس کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ یقینی نہیں کہ جو سامان لوگ وہاں تک لاو کر لے گئے ہیں اس میں مہمانوں کا کوٹا بھی شامل ہو۔ سنا ہے کہ منسیاری سے ملم تک کا بھاڑا ایک روپیہ فی کلو ہے۔ مہمان آنے کا امکان بھی غائب ہوتا جا رہا ہے۔ پاس میں کوئی دکان تو ہے نہیں کہ موقع بے موقع گئے اور لے آئے۔ پان سنگھ جی کے تھیلے میں یہی میزان تھا، پھر بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ زیادہ ہی احتیاط برت رہے ہیں۔ برفو پہنچنے تک ہم سب زیادہ تر گم سم چلتے رہے۔ میرے اندر برفو لوٹ آنے کی ذمے داری پیٹھ گئی تھی۔

برفو میں گاؤں کی طرف چڑھائی چڑھتے ہوئے پان سنگھ جی نے ماپا کی طرف گھوم کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''سنپتی سوک ماپا میں ہی رہتا تھا۔ کہتے ہیں، اس کے پاس اتنا سونا تھا کہ اسے آنگن میں چٹائیاں بچھوا کر سکھاتا تھا۔ ایک بار سنپتی سوک نے کہا کہ ماپا کا 'سماڑ' (دلدل)، آپ دیکھ رہے ہیں وہ سماڑ، سوکھ جائے گا لیکن میرا سونا ختم نہیں ہوگا۔ اس نے یہ کہا تو کہیں سے ایک بکری آئی اور سکھایا ہوا سارا سونا ایسے کھا گئی جیسے دانہ کھا رہی ہو۔ (ایک بڑے درّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آگے، آپ دیکھ رہے ہیں، اس بڑے نالے تک گاؤں والوں نے اس بکری کا پیچھا کیا، لیکن وہاں سے وہ پر لگا کر نالے کی طرف اڑ گئی...''

میں نے دلدل کی طرف دیکھا، جس پر دور تک شاید سیاما کی ہریالی ہی زیادہ نمایاں ہو کر پھیلی ہوئی تھی۔ 'مالوشاہی' کے کردار سنپتی سوک کے بارے میں یہ قصہ سن کر مجھے یہ ایک بہت پرانا سبق یاد آیا کہ گھمنڈ تو راون کا بھی نہیں رہا۔ پھر خیال ہٹ کر کہیں اور چلا گیا۔ سچ کو سچ کی طرح دیکھنے دکھانے کی میری خواہش اس نقطے پر اٹک رہی تھی کہ کیا سونے کو بھی سکھانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟ 'مالوشاہی' سے مجھے ایک شکایت یہ ہے کہ جنھیں تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا انھوں نے اسے تاریخ مان لیا ہے۔ وہ اندھے عقیدوں اور تفرقے کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بن گیا ہے، کماؤں کے پس منظر میں۔ ماپا کے اجڑے ہوئے سے بیس تیس 'پاتھر چھیں' مکان سنپتی سوک کے بارے میں اس پر اسرار قصے کی دھند سے چھٹ کر اپنی ساری ناداری کے ساتھ نظر کے سامنے آ گئے تھے۔ ماپا میرے لیے ہمیشہ ہی قابل رحم رہا ہے کیونکہ وہاں میری بیوہ بوا (پھوپھی) رہی تھی۔ بہت بھوگا تھا اس نے اس زمانے میں، ہی جب جوہار میں سنپتی سوک ہو سکتے تھے۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہاں لوگ رہتے ہیں یا نہیں ہیں۔ کھیتی لائق زمین کی

کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود کچھ ہی جتے ہوئے کھیت اس پھیلاؤ میں بھٹکے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ ماپا کا آڑا ترچھا ڈھلوان میدان جہاں سے شروع ہوتا ہے، وہاں اِس پار اور اُس پار پیچھے کو ہٹے ہوئے بڑے پہاڑی سلسلوں کے مقابلے میں کھلونے سے دکھائی دیتے ٹیلوں اور ڈھوہوں کی رکاوٹیں بے حقیقت ہو جاتی ہیں اور زیادہ تر بنجر زمین کا، چھوٹے بڑے جھرنوں کا وسیع منظر سامنے آجاتا ہے۔

بُرفو میں اس دو منزلہ گھر کے پاس پہنچتے ہی پان سنگھ جی آگے بڑھ گئے۔ آنگن پار کرتے وقت اس گھر کے اندر باہر ہلچل شروع ہو گئی۔ 'جھونپی' (گھونگھٹ) سے تھوڑا سا منھ ڈھکے ایک بیاہتا جوان عورت پھرتی سے سیڑھیوں پر اتر کر 'گوٹھ' (مکان کے نچلے حصے) میں گئی اور فوراً لوٹ کر ہم سے پہلے سیڑھیاں پار کر گئی۔ اندر جانے تک ہمارے لیے ایک طرف 'دَن' (غالیچے) بچھ چکے تھے۔ بیٹھتے ہی بغل میں بوریوں کے 'بانگ' (ڈھیر) پر نظر گئی۔ پندرہ بیس بوریوں کا ڈھیر تھا وہ۔ ظاہر تھا کہ اس خاندان کے لیے اناج کا پورا انتظام ہے۔ پان سنگھ کا تھیلا غیر اہم ہو گیا۔ پہلے ایک بچی اور پھر ایک ادھیڑ عورت پاس کر بیٹھ گئی۔ مرد لوگ منسیاری گئے تھے۔ کچھ پان سنگھ جی کی باتوں سے اور کچھ اس عورت کی باتوں سے سمجھ سکا کہ وہ میری رشتے دار ہیں۔ رشتے کی ایک کونپل ماں کی طرف سے پھوٹ رہی تھی اور ایک پتا کی طرف سے، اور زیادہ تفصیل جان کر میں اپنی کم معلومات کے لیے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سوچا کہ تفصیل کی طرف مِلم سے لوٹ کر آؤں گا۔ تب تک دبدھا میں تھا کہ انھیں کیا کہوں کہ وہ بولیں، ''چھلادِکا، چک چک آما، تیں کس کے اے گئے یا...''[۵] پھر کچھ بے تکلف ہو کر انھوں نے کہا، ''بہت چھوٹا تھا تو جب میں نے تجھے دیکھا تھا۔ تیری ماں تجھے ترچھی ٹوکری میں ڈال کر اوپر نیچے (یعنی جوہار سے تھالہ، تھالہ سے جوہار) جاتی تھی۔'' پھر انھوں نے (جوہاری بولی میں ہی) کہا، ''کیا نوکری کرتا ہے بیٹا تو؟ ہم نے سنا کہ تو راج دوت (سفیر) ہو گیا ہے...''

''راج دوت؟'' میں چونکا۔ ''یہ کس نے کہا؟''

''ہم سے تو یہی کہا کسی نے...''

۵۔ 'چھلادِکا' عورتوں کا ایک انتہائی اپنائیت بھرا اور زنانہ خطاب ہے جو یادوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ماں کو آما کہتے ہیں، اور ایک اور معنی میں وہ بیٹا بھی ہے۔ یہ خطاب عورتیں چھوٹی عمر کی کسی بھی عورت مرد کے لیے استعمال کر سکتی ہیں۔ وہ پوچھ رہی تھیں: ''تو یہاں کیسے آ گیا؟''

Scanned with CamScanner

''راج دوت واج دوت نہیں ہوں۔ کسی نے ایسے ہی 'پھونک' (گپ) ماردی ہوگی۔ راج دوت تو بہت بڑا افسر ہوتا ہے۔ یہاں آئے گا تو نوکر چاکروں کے ساتھ ڈولی میں آئے گا یا بیلی کاپٹر میں آئے گا... بیلی کاپٹر تو یہاں آتا ہی ہوگا کبھی کبھی؟''

''پھر کیا نوکری ہے تیری؟''

''اخبار چھاپتا ہوں۔ کہاں کیا ہے، کہاں کیا ہورہا ہے، کیا نہیں ہورہا ہے — یہی سب لوگوں کو بتاتے ہیں...''

''بھلے بھئی، بھلے بھئی'' (اچھا ہی ہوا، اچھا ہی ہوا)۔ میرے راج دوت سے اخبار چھاپنے والا ہوجانے پر انھیں کوئی خاص افسوس نہیں ہوا۔ برفو میرے دادا کا گاؤں تھا اس لیے وہ اصرار کررہی تھیں کہ میں پاس ہی اپنے بزرگ کا گھر دیکھ آؤں۔ ''تیرا حصہ یہاں ابھی بھی ہے،'' بڑا ہی بااختیار لہجہ تھا ان کا، جیسے یقین دلا رہی ہوں کہ وہاں جاکر اپنا حصہ مانگنے لگوں تو کوئی ہو بلاّ نہیں ہوگا۔ میں نے کہا، ''مِلَم جانا ہے فوراً۔ وقت ملا تو لوٹ کر دیکھوں گا۔''

ناشتہ، چائے اور تمبا کو کے بعد ہم روانہ ہوئے تو پان سنگھ جی اور وہ ہمارے ساتھ گاؤں کے سرے تک آئیں۔ پیروں تلے آلو کا کھیت تھا، جس میں کہیں کہیں آلو کے نئے اُگے پتے باہر آگئے تھے۔ اوپر ایک طرف الگ دکھائی دیتے مکانوں کے سلسلے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے انھوں نے کہا، ''اوپر کی طرف کے وہ مکان جنگ پانگیوں کے ہیں۔''

جیامکئی ہندی کے زور سے جنگپانگی ہوگیا ہے۔ پتا نہیں اس ترمیم سے یہ لفظ کتنا شُدھ ہوا ہے۔ یاد آیا کہ منسیاری میں شاید گمان سنگھ نے کہا تھا، ''جیامکئی کا مطلب ہے 'جامکیا'، جمع کیے ہوئے۔ جنگپانگیوں [۹] کے پُرکھے کہیں باہر سے آئے ہوں گے تو برفو کے بُرفالوں نے ان سے کہا ہوگا، آؤ، ہمارے گاؤں میں رہ لو ایک طرف، ساتھ رہے گا...'' میں نے اسی انداز میں دل ہی دل میں تعریف

---

[۹] کماؤں کی تاریخ پر نظر رکھنے والے بدری ساہ ٹھُل گھریا کا کہنا ہے کہ کتیور دور کے کھمپاؤں کی شورش کو دبانے کے لیے کتیور کے راجہ نندی دیو نے ہُن دیش پر چڑھائی کی تھی۔ اس مہم میں کامیاب ہوکر کتیوریوں نے امن و امان قائم کرنے کے لیے جو 'جنگ پا' اہلکار مقرر کیے تھے ان میں سَوک بھی شامل تھے۔ جو سوک کتیور دور میں 'جنگ پا' رہے تھے ان کے خاندان کے لوگ 'جنگ پانگی' بھی کہلاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

متعین کی، بُر فال کیا ہوا؟ بُزا اور فال، فال کا مطلب انگریزی کے 'فال' جیسا ہی ہے۔ بُزا بوڑھے کو بھی کہتے ہیں اور وہ ایک احترام کا لقب بھی ہے، فلاں بُزا یعنی فلاں شریمان۔ ہوسکتا ہے کہ یہ یہاں کوئی جانا مانا شخص یا بوڑھا کسی چٹان سے اپنی مرضی سے گرا ہوا۔ 'فال گھالی دی' یعنی اپنی مرضی سے چھلانگ لگادی... نیا گرا فال، اولڈ مینز فال، جنٹل مینز فال... جلدی میں میں برفو کو غور سے نہیں دیکھ سکا۔ وہاں شاید دس بارہ خاندان آئے تھے۔ ٹوٹ پھوٹ کم تھی اور جتے ہوئے کھیتوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ بیوپاری اب کسان بن رہے ہیں... برفو کو پہلے دیکھے کی بہت ہلکی یاد ہے۔ برفو کے لیے میرے دل میں اپنائیت نہیں ہے، احترام ہے۔ وہ رعب داب والا گاؤں رہ چکا ہے، حالانکہ وہاں سے میرے دادا 'نہیں داردرے سم دکھ جگ ماہی' (مفلسی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دکھ نہیں) کی آخری حد سے گزر کر باہر چلے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے خوددار مگر سعادت مند بیٹے سے بھی کہا تھا کہ ''اپنی آل اولاد سمیت کبھی برفو مت لوٹنا۔ میں وہاں سے پتھر پلٹ کر (یعنی کبھی نہ لوٹنے کا قول کر کے) آیا ہوں۔''

آلو کے کھیت کے سرے تک ہمارے ساتھ آ کر پان سنگھ جی اور وہ لوٹ گئیں۔ لوٹتے وقت انھوں نے کہا: ''تو کل نندا گھونگٹی دیکھنے جارہا ہے... نندا گھونگٹی بلجو سے بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔''

برفو سے بلجو کے سرے تک فنز سے ڈھکے ڈھلان میں سڑک کے نیچے اوپر دس پندرہ گز کی دوری پر چھوٹے چھوٹے گلابی اور ہلکے بینگنی پھولوں کے گھیرے بھی شامل ہو گئے تھے۔ ہزار ڈیڑھ ہزار چھوٹے چھوٹے پھولوں کا زمین سے چمٹا ہوا گھیرا۔ نزدیک سے ان گھیروں کا رنگ واضح ہوجاتا ہے، لیکن دور سے غائب ہوجاتا ہے۔ اس پار ماپا سے گنگھر کے قریب تک پہاڑوں کی قطاریں کہیں ٹوٹی ہوئی ہیں، کہیں ایک کے بعد ایک جڑی ہوئی۔ کہیں ان پر پیڑ اور ونس پتیاں پٹی ہوئی ہیں، کہیں مٹ گئی ہیں۔ کہیں نیلی کھلی جگہ ہے، کہیں کندرے (پہاڑیوں کے درمیان خشکی کے قطعے)، کھوہ اور درّے ہیں اور ان میں سمایا ہوا اندھیرا ہے۔ جھرنے کھوئے کھوئے سے، جو بے شمار بوندوں میں بکھر کر ہی نیچے نالوں تک گر پاتے ہیں۔ ماپا کے سب سے بڑے 'چھیُو نگ' (جھرنے) کا پانی بھی ان دنوں بغیر ٹوٹے، مسلسل نالے تک نہیں گر پارہا تھا۔ پانی کے گچھوں پر گچھے ہی چوٹی سے جھڑ رہے تھے۔ نیچے ڈھلوان بڑے میدان کی طرف ویرانی تھی اور بیراگ پیدا کرنے والی اداسی۔ اس ماحول نے یہاں کے آدمی کو طرح طرح کی کتھائیں اور لوک کہانیاں دی ہیں اور دیتا رہے گا۔ وہ یہاں کے رہنے والے

Scanned with CamScanner

کوڑ راتا ہے، موہتا ہے، بے سُدھ کر دیتا ہے۔

دوری زیادہ ہونے کے باوجود میں ماپا گاؤں میں اس دھرم شالے کے آثار کھوجنے کے لیے نظر دوڑاتا رہا جہاں ایک رات میرے پتا مجھے سیتارام بابا کے درشن کے لیے لے گئے تھے۔ وہ جوگی مشہور تھا جو ہار میں۔ اُن دنوں ہم بوا (پھوپھی) کے گھر گئے ہوئے تھے۔ ماں لگ بھگ ڈیڑھ سال تک بیمار رہ کر ٹھیک ہو رہی تھیں۔ پتا طرح طرح کی دوائیں آزمانے کے ساتھ ساتھ 'گھٹیلی' اور 'جاگر' (دیوتا جگانے کا عمل، جس کا چلن کماؤں میں آج بھی کم نہیں ہوا ہے)، جھاڑ پھونک، منتر تنتر کے پھیر میں پڑ گئے تھے۔ پہلے ان پر وشواس نہیں کرتے تھے، لیکن ماں کی بیماری سے کاروبار ٹھپ ہو جانے پر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ سیتارام بابا پر ان کا عقیدہ تب بھی تھا جب وہ 'گھٹیلی' یا 'جاگر' میں رات گزارنے والے اپنے خاندان کے لوگوں پر بگڑتے تھے۔ دھرم شالے میں سیتارام بابا کے درشن کے خواہشمندوں سے کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ماں کی بیماری کا حال سن کر بابا نے نو دس سال کے اپنے چیلے کا تعارف کراتے ہوئے کہا، ''آپ اسے لے جائیں، یہ ٹھیک کرے گا آپ کی پتنی کو۔''

پتا کے ساتھ میں نے بھی سیتارام بابا کے چیلے کو غور سے دیکھا۔ اس کی بہت دھندلی یاد باقی رہ گئی ہے: گورا، انگریز جیسا، چمکتی آنکھیں، گھنگھریالے بال، جو شاید بار بار راکھ ملے جانے کی وجہ سے ہی لال ہو گئے تھے۔ بولتے وقت ہر جملے کا کوئی نہ کوئی لفظ اس طرح اس کی زبان پر اٹک جاتا تھا کہ اسے چھڑانے کے لیے ہونٹ کھینچ کر گول ہو جائیں، آنکھیں مچ جائیں۔ ایک بھورے رنگ کے چولے سے اس کا پورا بدن ڈھکا ہوا تھا۔ پتا نے فوراً یقین نہیں کیا کہ وہ نو عمر لڑکا ایک مشکل بیماری کا علاج کر سکے گا۔ جانچنے کے لیے انھوں نے اپنے مختلف زبانوں کے علم کا استعمال کیا۔ پہلے چند ایک جملے شاید انھوں نے تبتی بولیوں میں بول کر پوچھا کہ کیا وہ ہندی میں ان کے معنی بتا سکتا ہے۔ صحیح جواب پا کر پتا نے گدّیوں (بھیڑ پالنے والوں کی ایک خاص برادری) کی بولی میں، گڑھوالی اور دارما و بیاس کی بولیوں میں، پنجابی میں بھی کچھ پوچھا تھا۔ درست جواب پا کر پتا مطمئن ہو گئے، وہاں موجود لوگ متاثر ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ وہ ننھا جوگی انتریامی (سب کچھ جاننے والا) ہے۔ بابا نے مسکراتے ہوئے کہا، ''کل صبح یہ آئے گا آپ کے ساتھ۔ پھر اپنی پتنی کو لے چلو کیلاش۔ ساتھ ساتھ چلیں۔ مانسرور میں نہائے گی تو سارا کپٹ، کسی کا کھلایا ملایا نکل آئے گا۔ اپنی کُل (خاندانی) دیوی کا ساز و سامان (مورتی، سنگھاسن، چھتر، گہنے،

Scanned with CamScanner

شنکھ، گھنٹی وغیرہ) بھی لے چلنا مانسرو ور میں اشنان کروانے کے لیے۔''

گفتگو ختم ہو گئی، جس کا مطلب تب میں صرف یہی نہیں نکال پایا تھا کہ پتا ضدی ہیں، جلدی کسی کا لوہا نہیں مانتے: میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ گفتگو عام گفتگو نہیں ہے، وہ دو نوں (عالموں) کے درمیان گفتگو ہے جسے میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ اس گفتگو کو 'بحث' کہنے کے لیے درکار علم نہ رکھتے ہوئے بھی میں بحث کے طرز اور اس کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا۔ علم عمر سے بڑا ہے، سوال پوچھ کر علم کی پرکھ کی جاسکتی ہے، بھکتی اور تجسس میں فرق ہے اور میرے پتا میں بھکتی سے تجسس کی مقدار زیادہ ہے، یہ سب میں اس حالت میں بھی سمجھ سکا تھا ایک اثر کی طرح، لیکن تب میں ایسے اثرات کا لفظی اظہار کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا شاید۔

اچانک کسی کی تنہا آواز میں کیرتن شروع ہو گیا، میرے لیے ایک اچرج کی طرح۔

''گوپال جے جے، گووند جے جے۔''

کورس: ''گوپال جے جے، گووند جے جے''

''رادھا رمن ہری، گووند جے جے۔''

''رادھا رمن ہری...''

اس رات پہلی بار سنے گئے کیرتن کا عجب لطف تھا۔ میں مسحور تھا منجیروں کی آواز سے، اس چمٹے کی آواز سے جس پر پیتل کے جھانجھر جھلملا رہے تھے۔ چولھے اور آگ سے واسطہ رکھنے والے چمٹے اور اس چمٹے کے فرق پر بھی مجھے تعجب تھا۔ 'جے جے' کا مطلب میں سمجھ رہا تھا، لیکن یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ گووند اور گوپال کی جے جے کیوں بولی جارہی ہے؟ بہت دنوں تک سوچتا رہا اس مسئلے پر۔ میرے گاؤں میں گوپال اور گووند نام کے شخص تھے: جن کی جے جے بولے جانے کا کوئی تک نہیں تھا۔ تب وہ کیا کوئی اور گووند اور گوپال ہیں؟ کرشن سے میں تب بھی متعارف تھا کیونکہ ان کی ایک تصویر ہمارے گھر میں ٹنگی ہوئی تھی اور ماں نے بتایا تھا کہ جنم اشٹمی انھی کی یاد میں منائی جاتی ہے، جس دن جوہاری آلو کی نئی فصل پر ہاتھ لگاتے ہیں۔ کرشن کی وہ تصویر یہ بھی جتلاتی تھی کہ ایک بڑی تہذیب قائم ہے کہیں، جہاں تک میرے پتا ہر برس جاتے ہیں اور جہاں ویسی تصویر بن سکتی ہے۔ مجھ میں ایک گہرا تجسس تھا اس تہذیب کے لیے۔ کرشن کے دوسرے ناموں سے متعارف ہونے تک جوہار بہت دور

Scanned with CamScanner

اور بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔

صبح ماں کے علاج کے لیے سیتارام بابا کا چیلا آیا تھا۔ منتر پڑھتے وقت بھی وہ ہکلا رہا تھا اکثر۔ ماں اسے 'بالو بھگوان' (بالیشور) ہی کہنے لگی تھیں۔ دوسری سطح پر وہ یہ بھی سوچتی تھیں کہ وہ ننھا جوگی صبح پو پھٹنے سے پہلے اکیلے ندی تک جا کر کیسے نہاتا ہوگا جو ہار میں؟ نہانے کے بعد اس کے بال کون سنوارتا ہوگا؟ وہ ماں کیسی ہوگی جو اتنے سندر بالک کے بغیر رہ لیتی ہے؟...

سیتارام بابا کب تک تھے، کب سے نہیں رہے، کسی نے نہیں بتایا۔ لیکن اس سال کیلاش کی یاترا سے لوٹ کر ماں نے بتایا تھا کہ سیتارام بابا اپنے چیلے کے بال سنوارنے کے لیے ہمیشہ جھولے میں کنگھی رکھتے تھے۔ سیتارام بابا کی جٹا بہت لمبی تھی۔ وہ خود دھیان لگائے بیٹھے رہتے تھے کنارے پر، اور جٹا پہنچی رہتی تھی مانسرور میں...

بوندا باندی شروع ہوئی اور پھر بند ہوگئی۔ تن پر لپٹے پشمینے تھوڑا بھیگے اور پھر سوکھ گئے۔ بلجو میں تین چار گھروں سے ہی دھواں نکل رہا تھا اس بھیگے بھیگے موسم میں۔ آنگن اور کھیتوں میں بھی تین چار آدمی ہی دکھائی دیے۔ سارے مکان سڑک کے نیچے ہیں۔ سرسری طور پر دیکھنے پر تباہی ظاہر نہیں ہوئی۔ جس سڑک پر ہم چل رہے تھے اس پر سامنے اُس پار گنگھر سے کئی بار لاماؤں اور ان کے ہنکاروں (تبتی بکریوں) کی قطار گزرتے دیکھنے کی یاد بہت واضح ہے... ہنکاروں کی قطار کا پہلا سرا نظر آتا تھا تو دوسرا سرا نہیں نظر آتا تھا، پھر دوسرا سرا نظر آتا تھا، پہلا چھپ جاتا تھا... تالیاں بجا کر "ہنتی ائی گے، ہنتی ائی گے" (لاما آ گئے، لاما آ گئے) کہتے ہوئے ہم بچے دوڑ کر کھلی جگہ پر آ جاتے تھے تاکہ آنکھ کی سیدھ میں گزرتے ہوئے ہنکاروں کی قطار کو جی بھر کر دیکھ سکیں۔ 'فیونگ تور' (اون کی بنی غلیل جس کے بیچ میں پتھر رکھنے کے لیے چوڑی پٹی جڑی ہے) کی پھٹاک چٹاک چٹی ی ی ی... اس پار صاف سنائی دیتی تھی۔ فیونگ تور کی آواز سے ڈر کر یا پتھر کھا کر آڑی ترچھی چلتی بکریاں قطار میں آ جاتی تھیں... فیونگ تور سے چھٹے پتھر کی آواز اتنی دور نہیں سنائی دیتی تھی۔ فیونگ تور سے چھٹے پتھر سے آواز آتی ہے: ہواں، واں، واں، واں، واں...

گنگھر اس پار اونچائی پر ہے، لیکن بلجو کے برابر نہیں۔ بغل میں پاچھو کی ندی ہے اور اس کے تٹ کے پار پاچھو بھی گنگھر کے برابر کی اونچائی پر بسا ہے۔ پچیس تیس پست قد مکان اس طرف گنگھر

Scanned with CamScanner

میں، تمیں چالیس اُدھر پاچھو میں۔ گنگھر کے سرہانے پہاڑ پر جتنا بڑا اراتپان (راتپا کا جنگل) ہے، اتنا بڑا شاید اور کسی گاؤں کے نزدیک نہیں ہے۔ دونوں گاؤوں کے نیچے گوری کے تٹ تک جتے اَن جتے کھیتوں کا سلسلہ ہے۔ یاد آیا کہ رلکوٹ میں بینا میدان دیکھنے کے لیے بے چین ہوگئی تھیں۔ میں نے گنگھر کے نیچے کھیتوں کی طرف ایک ہاتھ کی سیدھ لے جا کر کہا، ''دیکھو کتنا بڑا میدان ہے۔ فٹ بال کی کتنی ٹیمیں اس میں کھیل سکتی ہیں!''... پاچھو کی ندی کی سیدھ میں آ کر نندا گھونگٹی کی طرف دیکھا، وہ بادلوں میں پوری طرح چھپی ہوئی تھی۔ نیچے پاچھو کی ندی اور اس کا تٹ، گوری اور اس کا تٹ اُس اداسی کو پونچھ دیتا ہے جو پیچھے ہے۔ پاچھو ندی کا اجلا پانی میدانی چال سے سیدھا، رکے بغیر گوری کے اجلے پانی کی طرف جاتا ہے۔ دونوں ندیوں کا 'سیوٹ' ماحول کے اندر کے ماحول کی طرف لے جاتا ہے متواتر۔ مُنسیاری سے مِلَم تک گوری گنگا کا 'کے بھلور یواڑ' (کیا ہی سندر پتھریلا ریتیلا تٹ) وہیں ہے جہاں اس کی پاچھو کی ندی سے ملاقات ہوتی ہے۔

آگے سڑک کے نیچے ایک خیمہ دکھائی دیا۔ خیمے کے آگے تین افراد کھانا پکا رہے تھے۔ بغل میں تبتی نسل کی یاد دلاتا ایک کالا کتا بندھا ہوا تھا۔ میں نے گوپال سے کہا، ''چلو، تھوڑ میں چلتے ہیں۔ چائے تمبا کو پئیں گے۔''

گوپال نے کہا، ''نہیں، چلتے ہیں آگے۔ اب مِلَم میں ہی پئیں گے۔ یہ ابھی ابھی تھوڑ میں آئے ہوں گے، تھکے ہوں گے۔ ایسے میں ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے...'' گوپال کی باتیں میرے ذہن میں نہیں بیٹھ رہی تھیں لیکن میں مخالفت نہیں کر سکا۔ تھوڑ میں نہ جانے کہاں رکھے ٹرانزسٹر سے کوئی فلمی گیت رریار ہا تھا۔ سوکوں کے تھوڑ میں ٹرانزسٹر اور فلمی گیت؟ من اکھڑ گیا۔ چائے تمبا کو کی طلب بجھ گئی۔

آگے وہ علاقہ شروع ہوا جسے نزدیک سے یا دور سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جوہار میں رہتے ہوئے اس طرف جانے کی جو للک رہتی تھی، وہ کب غائب ہوئی، یاد نہیں ہے۔ وشال پربت کی تلہٹی میں بسا مِلَم گاؤں واضح ہو رہا تھا۔ آنکھ کی سیدھ میں بائیں طرف سے دائیں طرف ترچھی بہہ کر سیدھی ہوتی گوری کے تٹ تک زیادہ تر اَن جتے اور خالی کھیت اور پھر کچھ اونچائی پر بسے گاؤں کے 'پاتھر چھمیں' مکانوں کی اگلی قطار دکھائی دے رہی تھی۔ چند ایک الگ تھلگ مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ دوری اتنی برقرار تھی کہ میدان کے پیچھے ڈھکے ہوئے مکان صاف دکھائی دیتے رہیں۔ جوہار میں بھارت کے

Scanned with CamScanner

آخری گاؤں مِلَم نے نزدیک آکر مجھے پہلے یہ احساس دیا کہ جیسے بستی اور تہذیب کے آثار اس سے آگے نہیں ہوں گے۔ آگے انسان نہیں ہوں گے، صرف اجاڑ ہوگا، برف سے عاری پہاڑ اور پھر ہمالیہ ہوگا، بلکتے ہونکتے برفانی طوفان ہوں گے۔ لیکن شعور فوراً اس اندرونی احساس سے الگ ہوگیا— نہیں، آگے ہمالیہ کے پیچھے بھی انسان ہیں اور ان کی تہذیب ہے۔ صدیوں تک انسان اِس پار، اُس پار آتے جاتے رہے ہیں۔ یہ انت انت نہیں ہے، نظر کا دھوکا ہے۔ انسانوں سے انسانوں تک یہاں سے ایک اور سفر شروع کیا جاسکتا ہے۔ مِلَم تک جاتی نظر کو روکنے میں ناکام عجیب عجیب ڈھوہوں اور ٹیلوں کے بیچ چھپتی، ظاہر ہوتی ہوتی ایک چھوٹی سی ندی نزدیک آ رہی تھی۔ اور نزدیک آنے پر گوپال نے کہا کہ وہ 'گوانکھ گاڑ' (گوانکھ ندی) ہے، جو تبت سے آ رہی ہے۔ گوانکھ ندی سرحدوں سے بے خبر ہماری طرف آکر گوری سے مل رہی تھی۔ اس کا پانی بھی گوری کے پانی جیسا ہی تھا— دودھیا، اجلا پانی۔

مِلَم بہت سُونا اور ہلکی بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ میدان پار کر کے بستی کی طرف جاتے ہوئے ہم تھوڑا بھٹکے اور پھر ایک بنگالی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ دودھ کی بڑھیا چائے پیتے ہوئے رِتوِک گھٹک [1] سے جوہار تک کئی موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ مختصر اور اڑتی اڑتی باتیں۔ انھوں نے کہا، ''زندگی یہاں سخت نہیں ہے، 'بہوت نرم' ہے۔ اِن کی بولی بار بار بنگلہ کی یاد دلاتی ہے۔ مجھے بہت سے لفظ یاد ہوگئے ہیں، جو بنیادی طور پر بنگلہ لفظوں جیسے ہی ہیں، لیکن بولنے والے انھیں تھوڑا کھینچ کر یا گھما پھرا کر بولتے ہیں۔ کیسا اتفاق ہے، بنگالی کلچر کا اندرونی پہلو یہاں محفوظ ہے— ریت رواجوں میں، بولی میں، سجاوٹ میں... آپ یہاں پہلے بھی کبھی آئے تھے؟... میں بھارت کے کئی حصوں میں رہا ہوں— کماؤں میں بھی بہت گھوما ہوں، لیکن ایسی مماثلت میں نے اور کہیں نہیں دیکھی... یہاں کوئی تکلیف ہو تو بتانا... رِتوِک گھٹک سے آپ ملے تھے؟ پریس والے ایسے لوگوں سے

---

[1] رِتوِک گھٹک (Ritwik Ghatak) معروف بنگالی فلم ساز اور ادیب۔ وہ ۱۹۲۵ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں کلکتہ میں وفات پائی۔ انھوں نے کل آٹھ فیچر فلمیں اور گیارہ مختصر اور دستاویزی فلمیں بنائیں۔ وہ ایک اور عظیم بنگالی فلم ساز ستیہ جیت رے کے ہم عصر تھے، لیکن اپنے اسلوب میں ان سے بالکل مختلف ہوتے ہوئے انھوں نے اپنا منفرد مقام بنایا۔ (ا۔ک۔)

Scanned with CamScanner

مل سکتے ہیں... میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا..."

اتم سنگھ سیانا ملم کے سبھاپتی (مکھیا) ہیں۔ ہم انھیں ڈھونڈ رہے تھے کیونکہ منسیاری میں، پھر ٹولا اور برفو میں پکی خبر مل گئی تھی کہ وہ ملم میں ہی ہیں۔

ایک دبکے ہوئے سے مکان کے اندر ہم ایک بوڑھے شخص سے ملے، لیکن فوراً ہی کسی معاملے پر ان کی گوپال سے حجت ہوگئی۔ مجھے بڑی الجھن ہوئی کہ شروعات ہی غلط ہو رہی ہے۔ جلدی ہی بات کھل گئی کہ وہ اتم سنگھ سیانا نہیں ہیں، گوپال ہمیں کہیں اور لے آیا ہے۔ باہر آکر میں نے اس سے کہا، "تم اتم سنگھ سیانا کے پاس لے جا رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو؟ مذاق مت کرو، ہمیں لوٹنا ہے برفو تک۔"

اس نے کہا، "میں راستہ بھول گیا ہوں۔ یہیں کہیں ایک مندر ہے، اس کی بغل میں ہی اتم سنگھ سیانا کا مکان ہے۔ میں انھیں پہچانتا ہوں۔" گاؤں کے بیچ میں تین چار گلیارے ہیں، جن میں کبھی اوپر اور کبھی نیچے جاتے ہوئے ہم نے سرسری نگاہ سے لگ بھگ آدھا گاؤں دیکھ لیا۔ آرام کے بعد گاؤں دیکھنے کے ارادے کے باوجود مکانوں کی بے حساب ٹوٹ پھوٹ نے نظر کو باندھ لیا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ وہ گلیارے میں کھڑی رہ کر گوپال کو دیکھتی رہیں کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ میں تب تک اس خستہ حال بستی کو دیکھ لوں۔ مکانوں کے 'دار' (شہتیر) غائب تھے، پاتھر ٹوٹ رہے تھے، دروازے کھڑکیاں غائب تھیں۔ ٹوٹتے ہوئے گھروں کے اندر تک سیاپال اور ہِزگتی کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں گھسی ہوئی تھیں، کھوہ بنے دروازوں کے تلے سیاما کے پتے لہلہا رہے تھے۔ کیا ہو گیا ہے گاؤں والوں کو؟ کہاں چلے گئے سب؟ پچھلے سولہ برس میں ہی ملم کا یہ حال ہو گیا؟ میں ان رئیسوں کے مکان دیکھنے کو بیتاب تھا جن کے چرچے سنے تھے، لیکن پہلے بتانے والے کو کھوجنا تھا۔ مینا نے کہا کہ گوپال بلا رہا ہے۔ اسے سیانا جی کا مکان مل گیا شاید۔

اتم سنگھ سیانا جی کا مکان مندر کے پاس ہی ہے۔ کافی پرانے ٹھاٹھ کا ہے، لیکن اپنے مالک کی دیکھ ریکھ میں شاید بہت دن بچا رہے گا اس اجڑتی ہوئی بستی میں۔ اندر ایک طرف کو دکان ہے، جس کی گدی پر بادامی رنگ کا ہاتھ سے بُنا کوٹ پہنے، گھٹنوں پر پشمینہ ڈالے، پینتیس چالیس برس کا ایک گیم شحیم شخص بیٹھا تھا۔ رنگ گورا، بدن نرم، للاہٹ بھرا اور کالی مونچھیں ہونٹوں کی طرف گھومی ہوئی۔ کُل ملا کر وہ کھادی بھنڈار کے کسی اہلکار جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ گوپال نے تعارف کرایا۔ تعلق بڑھانے

Scanned with CamScanner

کی ضرورت نہیں پڑی۔ سیانا جی نے کہا، ''فلاں بُوا (شری مان) کے لڑکے ہیں آپ؟...میں تھالہ میں آپ کے مکان میں رہا ہوں کئی مہینے...ابھی ہے وہ مکان؟''

میں نے کہا، ''دال چاول تول دیجیے، برتن دیجیے۔ کھانا کھا کر گلیشیئر دیکھنا ہے اور آج ہی برفو لوٹنا ہے۔'' انھوں نے گوپال سے کہا، ''تو جا، رسوئی میں نوکر ہے۔ اس سے چاول چڑھانے کے لیے کہہ دے۔ تو نیچے کھیتوں سے سبزی کے لیے 'پھوپری' توڑ لا...تو نے کھایا ہے کبھی؟ نیچے والوں (جو جوہار نہیں آئے ہیں) کو 'ٹنک' (طلب) لگا ہوگا اس کا...''

گنو کی پتیوں جیسے خود بخود اگنے والے 'پھوپری' کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا، ''بڑی صحت بخش سبزی ہے یہ...ایک ہی پودے سے ہزاروں بیج پیدا ہوتے ہیں۔ مہینوں توڑ کر کھاتے رہو، لیکن اگلے سال لوٹ کر دیکھو تو کھیتوں میں پہلے جیسا ہی دکھائی دیتا ہے...''

پھوپری کا پہلے سے جانا پہچانا حال سن کر یاد آیا کہ جوہار میں تو روگی کا روگ بڑھانے والی چیزیں بھی بڑے قاعدے سے ہضم ہو جاتی ہیں۔ ماپانگ سے ملم تک جوہار پر نیچے کا موسم لاگو ہوتا ہے نہ اوپر (ہمالیہ کے پار) کا۔ پندرہ بیس میل تک کی سیدھ میں یہ علاقہ نرالا ہی ہے۔ بادی اور بلغم ختم کرنے والی ہومیوپیتھی کی کئی دوائیں اپنے لیے ساتھ لے گیا تھا، ان کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہاضمے کی طاقت اوّل درجے کی ہو گئی تھی...

اچانک مینا نے کہا، ''آٹھ آنے کی مونگ پھلی خریدو!''

''مونگ پھلی؟ اس موسم میں...'' دلّی میں جاڑوں میں ہی مونگ پھلی کھانے کی طلب ہوتی ہے کبھی کبھی، لیکن ملم میں جون میں مونگ پھلی کھانے کی طلب مجھے بھی ہو گئی۔ ملم کا وہ دن دلّی میں جنوری کے کسی بارش کے دن جیسا تھا۔ میں نے سیانا جی سے کہا، ''آٹھ آنے کی مونگ پھلی تول دیجیے۔'' سیانا جی نے ملم میں آٹھ آنے میں دلّی سے زیادہ مونگ پھلی دے دی۔

نیچے رسوئی میں کھانا کھا کر سیانا جی کے پاس لوٹے تو دیکھا کہ ہماچل پردیش کا ایک 'گدی' (بھیڑ پالنے والا) ان سے خط لکھوا رہا تھا۔ ''لکھ دے کہ اگلے مہینے سے تو اپنی بکریوں کا انتظام کر لینا۔ میں یہاں نہیں رہ سکوں گا، کسی 'ہور' آدمی کو بھیج...''

چراگاہ کی کشش سے اب ہماچل پردیش سے بھی بکری والے بڑے بڑے ریوڑ لے کر جوہار آ

رہے ہیں۔ کماؤں کے 'پدماروں' (زمینداروں، کسانوں) نے بھی اب بھیڑ پالن کا دھندا اپنالیا ہے۔ وہ بالکل سوکوں کی طرح پیٹھ پر 'دن' (غالیچے) میں لپٹا اپنا بستر لادے، ہاتھ میں چلم تھامے ''ہووو... ای ی ی... آ یاں...'' کہتے ہوئے ریوڑ ہانکتے ہیں۔ وہ بھی خیمے میں رہنے کے عادی ہو گئے ہیں اور ان کے آگے پیچھے بھی تبتی کتے چلتے ہیں۔ میں نے سیانا جی سے پوچھا ''یہ ملم کو کیا ہو گیا ہے؟ بڑا نام سنا تھا بچپن میں۔ پانگتی، مرموال، دھموت، جنوال، راوت، یہ سب 'راٹھ' (قبیلے) کہاں چلے گئے؟''

سیانا جی نے کہا، ''گاؤں آپ نے دیکھ لیا ہے؟ ابھی اور دکھاتا ہوں... اجڑے نہیں ہیں سب، پھیل گئے ہیں، منسیاری، جول جیوی، ڈیڑی ہاٹ، دھار چولا، پتھوراگڑھ، باگیشور، الموڑا، رانی کھیت، نینی تال، ہلدوانی تک۔ ہم ہی جمے ہوئے ہیں یہاں۔ دیکھو کب تک چلتا ہے...''

تھل، ڈیڑی ہاٹ اور منسیاری میں کئی 'جنگی' (بڑی) دکانیں دیکھتا ہوا آیا تھا... پانگتی اینڈ سنز... پانگتی پستک بھنڈار... راوت بھوجنالیے...

کچھ سوچتے ہوئے سیانا جی نے گوپال سے کہا، ''انگریزی راج میں یہ الموڑا ضلعے کا سب سے بڑا گاؤں تھا۔ ابھی بھی سرکاری کاغذات میں کہیں ساری تفصیل مل جائے گی... بنجر کھیتوں میں، میدانوں میں، گواڑ (چراگاہ) میں چاروں طرف ہماری بکریاں، گھوڑے اور خچر، کیسے کیسے گھوڑے اور خچر دکھائی دیتے تھے۔ گلیارے تم نے دیکھ لیے ہوں گے گاؤں کے بیچ میں، ان گلیاروں میں گھوڑوں خچروں کا جھنڈ آ جانے سے راستہ رک جاتا تھا تو منٹوں میں پیٹھ پر تانبے کا گھڑا لادے پانی بھرنے کے لیے گوری کی طرف جاتی بیس پچیس عورتوں کی قطار کھڑی ہو جاتی تھی راستہ کھل جانے تک۔ ایسی چہل پہل تھی یہاں!'' مجھ سے انھوں نے کہا، ''اب آپ یہاں کبھی ستمبر میں آیئے۔ جو رونق باقی رہ گئی ہے اسے تبھی دیکھ سکیں گے... ابھی تو سب سوکھا سوکھا سا ہی ہے۔ بگیالوں میں 'کول کیو' (برہما کمل) تبھی کھلتے ہیں۔ جہاں جہاں کھیت ہیں، سب ہرے پیلے (رائی کے کھیت) ہو جاتے ہیں۔''

سیانا جی جوہار کے ماضی کے ساتھ تھے اور اس کے حال کے ساتھ ہیں۔ وہ جوہار کے حال کے نمائندوں میں سے ہیں، صرف ماضی میں رہنے والے نہیں ہیں۔ ماضی میں رہنے والے وہ ہو گئے ہیں جو جوہار نہیں جا رہے ہیں اور حال سے منھ چھپانا چاہتے ہیں۔ یہ ماضی کا بکھان کرتے کرتے ابھی تھکے نہیں ہیں: ''جب ہم جوہار جاتے تھے... جب ہم منسیاری پہنچتے تھے... جب ہم ہن دیش (تبت)

جاتے تھے.... جب ہم بن دیش سے لوٹتے تھے.... جب ہم مال (میدانوں کی طرف) جاتے تھے... جب ہم آسام، کلکتہ، بمبئی اور کراچی کا مال (تبت میں) گیانم، ہنکلا کوٹ، گرتوک اور لہاس (لہاسا) پہنچاتے تھے۔ جب ہم ہُنّی بنجیاتے (لاماؤں سے لین دین کرتے) تھے...'' اپنے سفر میں مجھے ایک یاد رہنے لائق شخص چھوڑی بگڑو میں ملا تھا، جس نے دکھتی رگ دبا دیے جانے پر پوری طاقت سے ماضی کو رد کیا۔ ''ہمیشہ 'گھٹ کا بھاگ' (چکّی والے کا حصہ) اُگاہ کر کھانا اچھا نہیں ہوتا ہے مہاراج۔ کیا تھا بن دیش کا بیوپار؟ ایک چھوٹا سا چوڑا پتھر لائے اور اسے بیچ سے توڑ کر دو کر دیا۔ اون کا تاگا لپیٹ کر ایک ہُنّی نے رکھ لیا اور ایک سوک نے رکھ لیا۔ یہ (علامتی) شرط نامہ ہو گیا کہ جب تک کیلاش کی برف ختم نہیں ہوتی، جب تک مانسرو ور کا پانی نہیں سوکھ جاتا، تب تک ہماری دوستی قائم رہے گی اور ہم دونوں اپنے سامان کی ادلا بدلی کرتے رہیں گے... کسی نے وعدہ خلافی کر دی تو عدالت میں کسی گواہ کی ضرورت نہیں، وکیل کی ضرورت نہیں، صرف یہ دیکھ کر فیصلہ ہو جاتا تھا کہ پتھر کا جو ٹکڑا ہُنّی کے پاس ہے اور جو سوک کے پاس ہے وہ وہاں سے ملانے سے ٹھیک مل جاتا ہے یا نہیں جہاں سے وہ توڑ کر دو کر دیا گیا ہے۔ دونوں ٹکڑے مل گئے تو مدعی جیت گیا۔ قول نہ نبھانے والے کو 'باپ باپ' کر کے جرمانہ بھرنا پڑتا تھا۔ نہ کیلاش کی برف سوکھے، نہ مانسرو ور کا پانی سوکھے۔ اس بیوپار میں فائدہ ہی فائدہ تھا، لیکن ہم نے کیا کمایا؟ آٹھ آنے مہینہ 'تنخواہ' ملتی تھی مجھے۔ میرے باپ نے پانچ روپے مہینہ میں زندگی بھر کسی کی بکریاں چرائیں۔ رات دیکھا نہ دن دیکھا، دھار (چوٹی) دیکھا نہ گاڑ (ندی) دیکھا، کچا کھایا، پکا کھایا، بچوں کی بربادی الگ۔ مرتے کھپتے رہے... اب جو ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔ کم سے کم بچے تو پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے دن تو کٹ گئے جیسے کٹنے تھے۔ مہاراج، آپ نے دیس پردیس جا کر پڑھا، لیکن ہمارے یہاں ایسے بھی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے بکریاں چراتے ہوئے بریانٹھ (شاخیں کاٹنے کا ہتھیار) پر لکھ کر پڑھا ہے اور کیسے کیسے سَیپوں (صاحبوں) کا جبڑا آسمان کی طرف کر دیا... ہم ان میں سے بھی نہیں ہوئے...'' منسیاری میں گمان سنگھ پنچ پال نے بھی کہا تھا، ''فلاں بُڑا کا نام سنا ہوگا آپ نے؟ جب اس کے جانور راستہ گھیر لیتے تھے تو غریبوں کو گھنٹہ آدھا گھنٹہ چلنے کی جگہ نہیں ملتی تھی... آج کہاں گئی وہ رئیسی؟ ایک دن اس کے پوتے کو دیکھا تھا۔ جتنا سامان بھاڑے پر سامان ڈھوتے خچر کی پیٹھ پر تھا اس کا چوتھائی اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے تھا... لپک رہا تھا خچر کے پیچھے پیچھے۔

میں فوٹو کھینچنا چاہتا تھا، لیکن کیمرے کی ریل ختم ہو گئی تھی۔ میں تو راوت جی، ہمیشہ ان رئیسوں کے خلاف رہا ہوں...''

سیانا جی نے کچھ سال پہلے کے اس حادثے کا ذکر کیا جس میں نیدرلینڈ کی کچھ لڑکیاں ملم گلیشر پر چڑھتے ہوئے حادثے کا شکار ہوئی تھیں۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود برف کی دراڑوں میں دھنسی ان کی لاشیں بھی نہیں ملی تھیں۔ سیانا جی نے کہا، ''ایک لڑکی کے سمبندھی ہیلی کاپٹر سے یہاں آئے تھے، یہ دیکھنے کہ وہ جگہ کیسی ہے، جہاں لاش بھی نہیں مل رہی ہے۔ بہت اوپر جا کر دھنسی تھیں وہ لڑکیاں... آپ چاہیں تو نزدیک سے ہی گلیشیر پار کر سکتے ہیں۔ وہاں دیکھیے گا، پار جانے کا راستہ مل جائے گا آپ کو۔ پار جا کر رات تک گنکھر پہنچ جائیں گے۔ اُس پار راستہ خراب نہیں ہے، میدان ہی میدان سمجھیے۔ ہمت ہار جائیں تو صرف دیکھ کر لوٹ آئیں۔ بُرفو آج نہیں پہنچ سکیں گے آپ، یہیں رہ لیں رات میں...''

میں نے کہا، ''گلیشیر پار کرتے ہیں لوگ؟''

''وہاں جا کر جانچ کیجیے،'' سیانا جی نے کہا، ''ہماری عورتیں تو جاتی رہتی تھیں۔ گلیشیر پار کر کے جنگل سے گھاس لکڑی لاتی تھیں۔'' گوپال سے انھوں نے کہا، ''پار جا سکو تو ایک چھوٹی سی ندی بھی ہے...''

''وہ ندی جو اُس طرف دکھائی دیتی ہے؟ پانی زیادہ نہیں ہے اس میں؟''

سیانا جی نے طنزیہ لہجے میں کہا، ''کیسا جوان ہے تو؟''

میں راشن کا پیسہ دینے لگا تو سیانا جی نے کہا، ''نہیں، ہم آپ سے پیسہ نہیں لیں گے۔''

ایک عجیب بات میرے منھ سے نکل گئی۔ ''مونگ پھلی کے پیسے تو لے لیجیے۔''

سیانا جی کی آنکھیں میری آنکھوں سے ٹکرائیں اور وہ بڑے ہی سیانے پن سے اپنی مونچھوں کے ساتھ مسکرائے۔ ''اچھا، مونگ پھلی کے پیسے لے لوں گا آپ سے...''

سڑک گاؤں سے آگے جا کر بیٹر کی طرف بڑھتی ہے۔ پتھروں کی بھرمار ہے چاروں طرف۔ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ قریب ایک میل چل کر ہم سے پچیس تیس قدم آگے جاتا گوپال ایک موڑ پر ٹھٹکا اور سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ پاس جا کر میں نے پوچھا، ''کیا ہوا؟'' فوراً

Scanned with CamScanner

اٹھ کر اس نے ہاتھ کی سیدھ دے کر کہا، ''وہ دیکھیے ، وہ جو گھانگل (پتھروں کا چٹا) ہی گھانگل دکھائی دے رہا ہے وہیں ہے گلیشیئر۔ جہاں سے گاڑ (ندی) باہر آ رہا ہے وہیں گلیشیئر کا منھ ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے سیپ...'' آخری جملہ اس نے ایسے کہا جیسے وہاں سے آگے نہیں جائے گا، ہمیں وہیں سے لوٹنا پڑے گا۔

سامنے جو دکھائی رہا تھا وہ کچھ لمحوں تک واضح نہیں ہو سکا۔ پھر جیسے فوکس پر آ گیا۔ ایک ڈراؤنا منظر سامنے تھا۔ گوری جہاں سے باہر آ رہی تھی، وہیں ایک بہت بڑے دائرے پر نظر ٹک گئی۔ وہ دائرہ آگے سے آری سے کٹا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ برف کی موٹی موٹی پرتوں کی سیدھی آڑی ترچھی دراڑیں آگے سے اس دائرے کے سپاٹ اور چوڑے تھوتھے پر لپٹی ہوئی ہماری طرف جھانک رہی تھیں۔ کیا ایسی ہے گوری کا دہانہ؟ دہانے کے اغل بغل برف کی چٹان کھلی ہوئی تھی، اوپر سب طرف جلے اور زنگ لگے لوہے کے رنگ کے چھوٹے بڑے چٹے ہی چٹے تھے۔ میں فوراً یہ نہیں سمجھ سکا کہ گلیشئر ویسا نہیں ہے... برف کا ویسا رنگ تو ہو ہی نہیں سکتا جیسا دہانے کے علاوہ سب طرف پھیلا ہوا تھا۔ وہ رنگ یہ گمان پیدا کر رہا تھا، جیسے پاس ہی بھیلائی جیسا لوہے کا بڑا کارخانہ ہے اور اس کا کچا مال اور کباڑا برسوں تک اس جگہ کھلے میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ بیہڑ سنسان اور وہ ڈراؤنا منظر... میں بھی ڈر گیا تھا لیکن کچھ لمحوں تک ڈر کا سبب نہیں بھانپ سکا۔ پھر حواس لوٹے کہ صرف منظر ہی ڈراؤنا ہے، وہ ہمیں کھا نہیں جائے گا۔ ایک وہم ہے جو ڈرا رہا ہے۔ ایکا ایک سامنے آ جانے سے دل ہل سا گیا تھا۔ لیکن گوپال تو ایسے آگے آگے چل رہا تھا جیسے وہ پہلے بھی وہ گلیشیئر دیکھ چکا ہے۔ دیکھ چکا ہے تو دوبارہ دیکھ کر اتنا کیوں ڈر رہا ہے؟ میں ان ہیجانی لمحوں میں پوچھنا بھول گیا کہ گوپال نے پہلے بھی وہ گلیشیئر دیکھا ہے یا نہیں؛ بعد میں بھی بھول گیا۔ میں نے تب یہی محسوس کیا کہ گوپال کا ڈر دھارمک (مذہبی) قسم کا ہے... شاید سوچ رہا ہو جیسے کوئی دکھائی نہ دینے والی شکتی اسے کھوہ کے اندر کھینچ لے گی، جو گوری کا دہانہ ہے۔ ایسے خیالات تب میرے تصور سے بھی ٹکرائے تھے، جب دل پر سکون نہیں ہو پایا تھا۔ ان انجانے لمحوں میں صورت حال پر قابو پانے کے لیے جن باتوں سے میں نے کام لیا وہ عجیب و غریب تھیں: ''گلیشیئر گلیشیئر ہے، راکھشس نہیں ہے... مرد مونچھ والا ہو کر ڈرتا ہے؟ ہو گیا، بس، دیکھ لیا تجھے...''

خواہش ہوئی کہ گلیشیئر کے منہ پر ٹکٹکی لگائے آگے بڑھوں، کہیں وہ دیکھتے دیکھتے اور نہ پھٹ جائے آگے سے، کہیں وہ جلے ہوئے اور زنگ کھائے لوہے کے سے چٹے نہ کھسکنے لگیں۔ یہ ممکن نہیں تھا، کیونکہ پیر رکھنے کی زمین دیکھنی تھی، سڑک اس بیہڑ میں غائب ہو گئی تھی۔ ہمیں اوبڑ کھابڑ زمین میں کبھی نیچے کبھی اوپر جاتے ہوئے، نالے پار کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ گلیشیئر کے قریب دو تین تالاب بھی ہیں بالشت دو بالشت گہرے۔ ان کی سطح تھر تھرا رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی لہریں ہلکی ہوا کے رخ کے ساتھ ایک سے دوسرے سرے کی طرف بڑھتے ہوئے کپکپا رہی تھیں۔ پانی میں وہ مدھم اچھوتا پن تھا جو انسانوں اور جانوروں سے دور رہ گئے پانی میں ہوتا ہے۔ دہانے کے قریب جا کر دیکھا کہ برف کی چٹانوں سے باہر آتی ہوئی گوری بہت خوفناک ہے۔ دہانے کے اندر وہ رہ رہ کر کسی زندہ جاندار کی طرح پہلے جھٹکے سے پیچھے جا رہی تھی اور پھر پوری طاقت سے اندر نہ جانے کہاں کہاں برف کی چٹانوں سے ٹکرا کر اچھلتی، دہاڑتی، جھاگ اگلتی باہر آ رہی تھی۔ دل پھر بے چین ہو رہا تھا، لیکن میں نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ برف کی چٹان پر پتھر ہی پتھر تھے، چٹوں پر چٹے۔ وہ جلے ہوئے زنگ کھائے لوہے کا سا رنگ ان لال، کالے اور پیلے پتھروں کا ہی تھا۔ گلیشیئر کے دہانے کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ کر میں نے بیوی سے ایک ایک لفظ پر وزن دیتے ہوئے کہا، ”دیکھو مینا، دل ڈر گیا ہو تو یہیں سے لوٹ جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اسے ہم پار کریں ہی۔ یہ دراڑیں تم دیکھ رہی ہو اور پتھروں کے چٹے بھی۔ ایسی ہی دراڑیں اوپر گلیشیئر پر نہ جانے کتنی ہیں۔ ممکن ہے کہ کہیں پیر پھسل جائے اور ہم میں سے کوئی دراڑ کے اندر سما جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دیکھ ہی نہ سکیں کہ کہیں کوئی دراڑ مٹی اور پتھروں سے اس طرح ڈھکی ہوئی ہے کہ پیر رکھتے ہی اندر دھنس جائیں۔ گلیشیئر پر جو لوگ چڑھتے ہیں ان کے پاس طرح طرح کے اوزار ہوتے ہیں، کیلیں اور رسیاں ہوتی ہیں، برف کاٹنے کا کلھاڑا ہوتا ہے، ہمارے پاس کیا ہے؟ فقط خالی ہاتھ ہیں۔ ملم کی عورتیں اس پر چڑھتی ہوں گی کبھی، انھیں معلوم ہوگا کہ کہاں سے اُس پار جانا سب سے آسان ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم وہ جگہ ڈھونڈتے رہیں۔ آگ، پانی، برف، فطرت کے کسی بھی ایسے ہیبت ناک روپ کے ساتھ شیخی بھری چھیڑ خانی نہیں کرنی چاہیے۔ تم سوچ سمجھ کر طے کرو کہ گلیشیئر پار کرنا ہے یا یہیں سے لوٹنا ہے۔ فیصلہ تمھیں ہی کرنا ہے۔ میں ضدی ہوں، لیکن اپنی ضد کی خاطر کسی اور کی جان لینے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ کسی کو کچھ ہو گیا تو کون آئے گا یہاں ہمیں بچانے؟“

Scanned with CamScanner

مینا کھڑی چپ چاپ سن رہی تھیں۔ منھ پھیر کر آگے بڑھتے ہوئے انھوں نے بالکل سہج انداز سے کہا، ''چلو، دیکھتے ہیں کہاں تک چڑھ سکتے ہیں اس پر۔'' چڑھائی شروع ہوگئی۔ کچھ دور تک میں ناحق دیکھتا رہا کہ کہیں بکریوں کے کھروں کے نشان نظر آئیں گے۔ سخت زمین اور پتھروں پر وہاں کہاں کھروں کے نشان نظر آتے؟ کنارے کنارے سے جانا چھوڑ کر ہم گلیشیئر کی طرف مڑ گئے۔ گوپال آگے آگے جا رہا تھا، کیونکہ مجھے مینا کو سنبھالتے سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ میں نے گوپال سے کہا کہ وہ کہیں بھی جلد بازی نہ کرے۔ گلیشیئر پر راستے کا نشان کہیں نہیں تھا۔ گھانگل ہی گھانگل... ایک چٹے پر چڑھ کر اترے تو دوسرا چٹا سامنے... فولاد کی طرح سخت برف کی دراڑ کبھی دور سے نظر آجاتی، کبھی اچانک پیروں کے برابر میں، منھ کھولے۔ کہیں کہیں پر ان دراڑوں میں آدمی تو کیا گھوڑے خچر بھی سما سکتے ہیں۔ خبردار رہنے میں تھوڑی سی کوتاہی نیدرلینڈ کی ان لڑکیوں کی تقدیر کے حوالے کر سکتی ہے۔ ہلکی ہلکی سرسراہٹ کبھی آگے سنائی دیتی، کبھی پیچھے۔ آہستہ آہستہ پگھلتی برف کی دراڑوں میں مٹی اور چھوٹے پتھر دھیرے دھیرے کھسک کر جھڑنے کی آواز تھی وہ۔ ''گل''، جو ہاری بولی میں گلیشیئر کا مترادف یہ لفظ کتنا موزوں ہے... اس بولی میں گلنا لفظ میں پگھلنے کا مطلب بھی شامل ہے... گل اس برف کو بھی کہتے ہیں جو جم کر گلیشیئر کی برف جیسی ہی سخت ہو جاتی ہے۔ گل لفظ گلیشیئر کا مقامی روپ نہیں ہے۔ ہمت جٹا کر میں نے ایک دراڑ کے پاس کان لے جا کر سننے کی کوشش کی کہ اندر سے کیسی آواز آرہی ہے۔ گلیشیئر کے اندر بھید بھرا سناٹا تھا۔ مینا چٹے کے پیچھے جوتے کے اندر گھسے کنکر نکال رہی تھیں، دیکھ لیتیں تو شاید جھلاتیں اس بھیانک گلیشیئر میں میری فضول ہمت آزمائی پر۔ پتھروں کا چٹا، چٹے پر چٹا، کہیں کہیں ایسا ٹھوس کہ خیال ہی نہ رہے کہ نیچے برف ہے... اتار، پھر چڑھائی، اتار، پھر چڑھائی، کہیں پیر ہی پیر استعمال ہو رہے تھے اور کہیں ہاتھ پیر دونوں۔ پتھروں کا لمس بہت بنیادی، بہت قدیم ہوتا ہے۔ آگے آگے جاتا گوپال کہیں چھپ جاتا، کہیں ظاہر ہو جاتا۔ ہم کافی آگے آگئے تھے۔ مینا سے پوچھنے کی ضرورت ہوئی کہ وہ لوٹنا تو نہیں چاہتیں، لیکن لوٹنا بھی آسان نہیں رہ گیا تھا۔ ان لمحوں میں گوپال بے فکر کھڑا بیڑی پیتا ہوا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا ڈر غائب ہو گیا تھا، شرپا تین سنگھ ہو گیا تھا وہ۔ رفتار تیز ہوگئی۔ پھر وہی، چٹے کے آگے چٹا، دراڑ، کبھی دور کبھی قریب پیروں کے پاس۔ اور آگے جا کر یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ سرا قریب ہے جہاں ہم جا رہے

Scanned with CamScanner

ہیں یا وہ سرا جہاں سے ہم چلے تھے۔ فریب نظر... ایک اونچے چٹے پر چڑھ کر اوپر دیکھا۔ جہاں تک نظر جا رہی تھی وہاں بادل تھے۔ گلیشیر کے اوپری سرے کا کوئی انت نہیں تھا... دنیا میں تیسرے نمبر پر، ایشیا میں سب سے بڑا... اندر بہہ رہی گوری اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ گوری کو یہ کیسا بے انت، متواتر بہاؤ دے رہا ہے۔ بھی گلیشیروں پر کیا ایسے ہی پتھر ہوں گے؟ جغرافیہ کی کتابوں میں آج تک گلیشیر کے بارے میں تفصیل سے کیوں نہیں پڑھا! ملم کے رہنے والوں کے لیے یہ کتنا گھریلو ہے... سیلانیوں کو فقط پنڈاری گلیشیر کیوں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے؟ شاید وہاں تک پہنچنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ سیلانی زیادہ آئیں گے تو شاید یہ اتنا جنیلا (جنگل بھرا) نہیں رہ جائے گا۔ سمندر کی تہہ سے کتنا اونچا ہوگا؟ یہ اعداد و شمار والے جانیں۔ ایسے اعداد و شمار ان سیلانیوں کے پاس زیادہ ہوتے ہیں جو خیمے کے اندر جا کر، خیمے سے باہر آ کر، یا شیر کی بیچاری کھال پر چڑھ کر فوٹو کھنچواتے ہیں۔ اپنی فوٹو چھپوانے کے لیے سفر کرنے والوں کا ناش ہو! یہ اتنے پتھر یہاں کہاں سے آئے؟ ستمبر کے بعد شاید یہ پتھر برف سے ڈھپ جاتے ہوں گے۔ برف ہی برف دکھائی دیتی ہوگی۔ مئی جون میں پتھر اوپر آ جاتے ہوں گے اور برف نیچے بیٹھ کر سخت ہو جاتی ہوگی۔ کنارا پاس آ گیا، اور پاس، اور پاس... قریب ایک گھنٹے میں ہم دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تھے اور گوری بائیں طرف چلی گئی تھی۔ دہانہ زاویہ بدل جانے کے باوجود ویسا ہی بھیانک دکھائی دے رہا تھا، لیکن آتما پھول کی طرح ہلکی ہو گئی تھی... مینا کی تعریف میں مجھے جو سوجھا وہی منھ سے پھوٹتا رہا۔ ’’گریٹ! فاتح تم ہو! ہم کچھ نہیں ہیں...‘‘

پتھروں کی بھرمار وہاں بھی تھی۔ کوئی بٹیا بھی نہیں ملی، لیکن پیروں کے نیچے ہمیشہ کی جانی ہوئی زمین تھی۔ گوپال کی چال ہم سے بہت تیز ہو گئی۔ دیر تک ارد گرد کے بے آباد اور سنسان ہونے کا خیال ہی نہیں رہا، لیکن شام گھرنے کے آثار ظاہر ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ مینا ڈر رہی ہیں۔ ان کے پیروں کے چھالے اب بھی تکلیف دے رہے تھے۔ وہ بار بار پچھڑ رہی تھیں اور تھکان اور تکلیف کے باوجود گھبرائی ہوئی سی میرے برابر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گوپال کو آواز دینا بے معنی تھا کیونکہ وہ آواز کی پہنچ سے باہر جا چکا تھا۔ میں نے طے کیا کہ رفتار نہیں بڑھاؤں گا چاہے گنگھر آدھی رات کو ہی پہنچوں۔ مینا سے میں نے کہا، ’’ڈر رہی ہو تو آگے آگے چلو۔ آہستہ آہستہ چلو۔ میں پیچھے ہی رہوں گا۔ بھوت پریت سب تصور کی پیداوار ہے۔ آدھارا کھشس تو میں ہی ہوں۔ اصلی موت سے

تو ہم نپٹ چکے ہیں۔ آدم خور جانور یہاں نہیں ہوتے، ڈکیت اور لفنگے بھی نہیں ہوتے۔ اندھیرے کے آثار اور سناٹا ہی تمھیں ڈرا رہا ہے شاید۔ اور کوئی فکر مت کرو۔ گنگھر تک راستہ خطرناک نہیں ہے۔ یہ تم مِلَم آتے وقت اُس پار سے دیکھ چکی ہو، سن چکی ہو۔ گنگھر تین ساڑھے تین میل سے زیادہ نہیں ہے۔ تین چار خاندان وہاں ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ تین آدمی ہیں ہم، اندھیرے میں بھی چل سکتے ہیں۔'' مینا کو کچھ اطمینان ہوا۔ ان کی خاموشی ٹوٹی۔ گوپال ملم کی سیدھ میں اس ندی کے پاس کھڑا تھا جسے ہمیں پار کرنا تھا۔ ڈھلان میں اس چھوٹی ندی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ پہلے ہم جہاں تک جا سکتے تھے وہاں تک ڈھلان پر اوپر چڑھے، اس خیال سے کہ ممکن ہے اوپر کہیں پانی دو تین حصوں میں بٹ گیا ہو اور بیچ بیچ میں پتھر ہوں۔ پتھروں پر چھلانگ لگاتے ہوئے ہم وہ ندی پار کر سکیں گے۔ لیکن ایسی جگہ کہیں نہیں ملی۔ میں ہکا بکا تیز بہاؤ کو دیکھتا رہا۔ اچانک گوپال نے کہا، ''نیچے جاتے ہیں۔ میدان میں اس کا بہاؤ اتنا تیز نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا، ''بڑی زوردار بات کہی ہے تم نے۔ میری تو بدھی ہی گم ہوگئی ہے۔ ندی کو ہمیشہ وہاں سے پار کرنا چاہیے جہاں میدان ہو...'' نیچے دو تین جگہ میں نے محسوس کیا کہ ہم اسے پار کر سکتے ہیں، لیکن گوپال نے کہا، ''بہاؤ یہاں بھی تیز ہے۔ پانی بڑھ گیا ہے۔ گل کا پانی شام کو ایسے ہی بڑھ جاتا ہے۔ ہم پانی میں اترے اور پیر ٹھنڈ سے سُن ہوگئے تو نہ آگے جا سکیں گے نہ پیچھے جا سکیں گے، بہہ جائیں گے۔''

گوپال مجھ سے زیادہ مقامی باشندہ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہاؤ جانچنے کے لیے دو تین پتھر ندی میں ڈالے۔ وہ تھوڑا بہہ کر ڈوب گئے۔ گلیشیر کے پانی کی گہرائی دکھائی نہیں دیتی۔ کیسا مسئلہ بن گئی ہے اتنی چھوٹی ندی۔ بند پانی کا تیراک ہوتے ہوئے بھی میں ہردوار میں دوسروں کو بہتے پانی میں تیرتے دیکھ کر گنگا میں کود گیا تھا۔ تھالہ جاتے ہوئے پتا کے کندھے پر بیٹھ کر روچھال پار کرنے کی یاد آئی جو اُس سے کئی گنا بڑی ندی تھی۔ ایک جگہ میں نے کہا کہ پانی میں اتر کر پانی کی جانچ کرتا ہوں، تیرنے والے کو وہ کہاں تک بہائے گی، لیکن ٹھنڈ سے نمونیا کی بھی نوبت آ سکتی ہے۔ بیوی کا چہرہ اتر گیا۔ سوچا کہ پانی میں اترا تو وہ ڈر کر شور مچائیں گی اور میری ہمت مچل جائے گی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں گوری بہہ رہی تھی۔ اس کے دوسرے کنارے پر ملم دکھائی دے رہا تھا۔ ہم تٹ پر تھے۔ نہ اس پار جا سکیں نہ اُس پار۔ ملم لوٹنے کا مطلب تھا، رات کو گلیشیر کے حوالے ہو جانا۔

Scanned with CamScanner

تو کیا اس تٹ پر رات بھر پڑے پڑے ٹھنڈ سے مر جائیں؟ گلیشیئر پار کرنے کی صلاح دے کر آج مروا دیا اتم سنگھ سیانا نے۔ ملم کی طرف آواز دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ گوری کی آواز اسے نگل جاتی۔ ہم کچھ آگے بڑھے کہ شاید کوئی گنجائش دکھائی دے جائے۔ تھوڑی دور جا کر جان بچانے والے اتفاق کی طرح ندی کے پار ایک خیمہ نظر آ گیا، لیکن اس کے اندر اور آس پاس آدمی نہیں تھے۔ تھوڑی دیر ہم اس خیمے کو ہی دیکھتے رہے۔ پھر پیچھے سے بکریاں نمودار ہوئیں، آدمی نہیں۔ میں نے گوپال سے کہا، ''اور آگے جا کر دیکھو۔ شام کا وقت ہے۔ تھوڑ میں لوٹتی بکریوں کے پیچھے آدمی ضرور ہوگا۔''

بیس تیس قدم آگے جا کر اس نے کہا، ''ہاں، ہے۔'' ہم اس آدمی کے پاس آنے کا انتظار کرتے رہے۔ وہ ظاہر ہوا تو گوپال نے پوری طاقت سے آواز دی: ''یہاں آ، یہاں آ، ندی کی طرف آ!'' اس چھوٹی ندی کی آواز ہی گوپال کی آواز کو پی گئی۔ وہ آدمی سمجھ گیا کہ گوپال چلّا رہا ہے اور ہم کس مصیبت میں ہیں۔ وہ آواز کے دائرے میں آیا تو میں نے آواز دی: ''رسّی ہے رسّی؟ رسّی لے کر آیئے!'' مجھے یہ ترکیب سوجھ رہی تھی کہ اُس طرف رسی کا ایک سرا وہ پکڑے گا، اِس طرف دوسرا سرا میں۔ گوپال سے کہوں گا کہ رسی پکڑ کر مینا کو سہارا دیتا ہوا پار چلا جائے، پھر رسی کے سہارے میں بھی چلا جاؤں گا۔ میں نے اپنی بات دہرائی۔ پاس آ کر سر ہلاتے ہوئے اور ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے اس نے کہا، ''اوپر تو چلیے۔'' کچھ آگے جا کر اس نے نظر سے بہاؤ کی جانچ کی اور پاجامہ اتار کر مضبوط قدموں سے ندی پار کر کے وہ ہمارے پاس آ گیا۔ لگ بھگ دو منٹ میں وہ اُدھر سے اِدھر آ گیا تھا۔ یہ تھی اُس ندی کی طاقت اور ٹھنڈ کی حقیقت!

گوپال نے پاجامہ چڑھایا اور پانی میں مضبوط قدم رکھتے ہوئے پھرتی سے وہ بھی ندی کے پار چلا گیا۔ پینٹ اتار کر میں نے اسے جوتوں پر لپیٹا اور ندی کے دوسرے کنارے کی طرف پھینک دیا۔ اُس آدمی اور میں نے مینا کو سہارا دیتے ہوئے ندی پار کی۔ مصیبت سے نپٹ کر سوجھ نہیں رہا تھا کہ اس آدمی کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں۔ صرف کپکپی ہو رہی تھی۔ اس ادھیڑ بن میں میں گوپال پر جھلّایا۔ ''کتنی ٹھنڈ تھی؟ مر گئے ہم؟ بڑا جانکار بنا پھرتا ہے۔ ڈرپوک کہیں کا!''

تھوڑ میں کچھ دیر بیٹھے۔ مجبوری میں بغیر دودھ کی چائے پلاتے ہوئے اس آدمی نے کہا،

Scanned with CamScanner

''زیادہ تھک گئے ہو تو رات میں یہیں رہ لیجیے۔ ترنت کھانا بناتا ہوں۔ بستر ہے ہی۔ ویسے گنگھر زیادہ دور نہیں ہے، ڈھائی میل ہوگا۔ راستہ بھی اچھا ہی ہے۔ آگے جہاں دو راستے ملتے ہیں وہاں سے اوپر پاچھو کی اور جائیے۔ ہو سکتا ہے کہ پاچھو سے کوئی ساتھ چل کر نیچے پل تک پہنچا دے۔ نیچے سے اندھیرے میں اندازہ نہیں ہوگا، آپ پریشان ہوں گے۔''

میں نے کہا، ''نہیں، رکیں گے نہیں۔ گنگھر ہی جاتے ہیں۔'' تعارف ہوا تو پتا چلا کہ وہ چِتا کی طرف سے مجھے جانتا ہے۔ ہماچل پردیش کے کسی گدّی کی بکریاں چراتے ہوئے اس نے پینتیس بکریاں جوڑ لی ہیں۔ پچاس بکریاں جوڑ کر وہ خودکفیل ہو جائے گا۔ ایسا مضبوط آدمی ابھی تک خودکفیل نہیں ہو پایا تھا۔

پاچھو کی سمت جاتے ہوئے جھُٹپٹا اندھیرے میں بدل گیا۔ جھٹپٹے سے اندھیرا زیادہ اپنائیت بھرا محسوس ہوا کیونکہ وہ واضح تھا، نظر کو دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ سناٹے میں جھینگر بھی نہیں بج رہے تھے۔ یاد نہیں کہ وہ جوہار میں ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ جگنو ہوتے ہیں، لیکن وہ بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ ٹولہ میں دکھائی دیے تھے۔ اُس بکری والے کی ہدایت کے مطابق ہم صحیح جگہ سے پاچھو کی سمت مڑ گئے۔ اندھیرے میں ڈوبا پہاڑ پاس آیا تو پتھر گرنے کا اندیشہ کسمسایا، لیکن زیادہ نہیں۔ جلد سے جلد پڑاؤ تک پہنچنے کی خواہش نے اسے داب لیا تھا۔ میں نے اچانک طے کیا کہ رات پاچھو میں ہی رہیں گے۔ مینا بہت تھک گئی ہیں، پھر بھی چل رہی ہیں۔ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کسی آدمی کو پل تک پہنچانے کی تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ پاچھو کی ندی کا پل ابھی بھی ویسا ہی ہو جیسا پہلے دیکھا تھا۔ ٹولہ کے پل اور اس میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس رات میں جوکھم اٹھانا ٹھیک نہیں ہے۔ چاروں طرف جھاڑیاں تھیں۔ پیر تلے کا راستہ دکھ رہا تھا، آگے نہیں۔ اچانک مینا نے کہا، ''گھومنے والے بنے ہو، لیکن ایک ٹارچ تک نہیں خریدی۔ دِلّی لوٹ کر میں سب سے پہلے ایک بڑی سی ٹارچ خریدوں گی۔''

گلیشیئر اور ندی پار کر کے انھوں نے اپنی دھاک جمائی تھی۔ میں نے طنز کا مزہ لیتے ہوئے کہا، ''ٹارچ ہی نہیں، ایک اچھی سی برساتی بھی خریدنی ہے۔ چھاتے کا یہاں کی ہوا میں کوئی کام نہیں۔ پشمینے نہ ہوتے تو درگت ہو جاتی۔''

''ہاں،'' مینا نے کہا، ''اب آئی عقل!''

میں نے گوپال سے پوچھا: ''پاچھو میں کسی کو جانتے ہو؟'' اس نے کہا: ''ہاں، للت سنگھ پنچ پال کو جانتا ہوں۔ بڑا پریمی آدمی ہے۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ نیچے منسیاری میں رہتے ہیں۔'' اندھیرے میں چلتے چلتے پیروں تلے کھیت آ گئے، ان جتے کھیت۔ گوپال ٹھٹکا۔ ''سیپ، گاؤں آ رہا ہے۔ یہاں کتے ہوں گے۔ کاٹنے آئیں گے۔''

''ہٹ، پیچھے ہٹ!'' میں نے کڑکتی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔ ''کتے آئیں گے تو میں بھگت لوں گا انھیں۔ پاگل کتے ہیں کیا یہاں؟ یہ آدمیوں کی بستی ہے یا حیوانوں کی؟''

گوپال ڈانٹ کھا کر پیچھے ہٹ گیا تو میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ عجیب آدمی ہے، گلیشیر پار کرتے وقت بے فکر ہو کر بیڑی پیتا رہتا ہے، لیکن ایک چھوٹی سی ندی سے اس کی جان کانپتی ہے۔ خطرناک راستوں پر پیٹھ پر بوجھ لادے لپکتا ہے، راکھشس سے نہیں ڈرتا، کیونکہ اس کے اَنگ دیوتا آتا ہے؛ کتے سے ڈرتا ہے۔ ہاں، بلجو میں کتے سے ڈر کر ہی اس نے کہا تھا کہ تھوڑ میں نہیں جاتے چائے تمباکو پینے... تھوڑ میں بیٹھے لوگ تھکے ماندے ہوں گے، ان کا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہوگا... ایسا پاجی!

پہلے دو تین مکان اندھیرے میں ڈوبے ہوئے پاس آئے۔ پھر ایک اور مکان پاس آیا جس کے اندر مٹی کے تیل کے لیمپ کی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ آنگن کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے آواز دی: ''اندر کوئی ہے؟ للت سنگھ جی کا مکان کدھر ہے؟''

اندر سے ایک عورت کی آواز آئی۔ ''کوئی نہیں ہے...'' میں نے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا، ''آپ تو ہیں۔ باہر آیئے۔ ہم بھی یہیں کے آدمی ہیں۔ آدمی دیکھ کر آپ کو کیا ڈر لگتا ہے؟''

وہ باہر کو نکلی ہوئی پتھر کی سیڑھی تک آئی اور نیم اندھیرے میں ہاتھ گھما کر اس نے کہا، ''پیچھے چلے جایئے، للت سنگھ جی کا مکان پیچھے ہے۔''

میں نے کہا، ''ایسے مت بتایئے۔ ہمیں پہنچایئے للت سنگھ جی کے مکان تک۔ یا کسی لڑکے کو بھیجئے ہمارے ساتھ۔ گاؤں میں آدمی آئیں تو تکلیف اٹھانی چاہیے... پاچھو میں رہ رہی ہو، جنگل میں نہیں رہ رہی ہو...'' میں واقعی ڈکٹیٹر بن گیا تھا اس وقت۔ کیونکہ جوہار میں یہ ہو نہیں سکتا کہ باہر یا اندر کے لفنگے عورتوں کو ڈرا سکیں۔ یہ بات بندوق برداروں کے دماغ میں بھی بہت پہلے دھانسی جا چکی

Scanned with CamScanner

ہے۔ میرا دماغ جھنجھنا رہا تھا کیونکہ بیوی کو جلد سے جلد آرام اور بھوجن دینا بہت ضروری تھا۔ اس کے علاوہ گمان میں یہ بھی تھا کہ جوہار میں میں جہاں بھی جاؤں تہذیب آزاد، نڈر اور توانا ہو کر للکتی ہوئی میری طرف آئے۔

وہ عورت اپنے مکان کے پیچھے تک ہمارے ساتھ آئی۔ پھر ایک لڑکا آگے آگے چلنے لگا اور وہ لوٹ گئی۔ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے اور خالی تین چار مکانوں کے آگے پیچھے گھومتے ہوئے ہم نے ایک آنگن پار کیا۔ پہلے وہ لڑکا اور پھر ہم تینوں لگ بھگ آدھا جھک کر دروازے سے اندر گھسے۔ اندر سے طرح طرح کی لیس دار، لچھے دار آوازیں آ رہی تھیں۔ مٹی کے تیل کے لیمپ کے مدھم اجالے میں پہلے دھواں ہی دھواں دکھائی دیا، بیڑی، سگریٹ اور تمباکو کا، پھر اس چھوٹے سے کمرے کی سرحد اور بکسے، تھیلیاں، بوذیاں، اونی کپڑے اور بستروں کی تہہ۔ گوپال کو پہل کا موقع دیے بغیر میں نے پتا کا نام لے کر اپنا تعارف کرایا۔ آوازیں بند ہو گئیں۔ ''فلاں کا لڑکا ہے تو؟ یہاں کیسے آ گیا؟ ارے تو یہاں کیسے آ گیا؟ میرے پتا کے دوست کا بیٹا!'' یہ للت سنگھ پنچ پال کی آواز تھی۔

گوپال نے مداخلت کی کوشش کی تو للت سنگھ جی چلائے، ''چپ، تو چپ رہ! میں تجھے نہیں جانتا۔ میں تجھے مُنسیاری میں جانتا ہوں، یہاں نہیں جانتا...'' میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے انھوں نے کہا، ''آ، میرے پاس آ کر بیٹھ تو۔ ارے کیسے آ گیا یہاں؟ میرے پتا کے دوست کا لڑکا! دونوں بوڑھوں کی نہیں، بزرگوں کی بہت دوستی تھی بھلے مانس!''

للت سنگھ جی کے برابر میں ہماچل پردیش کا ایک اونچے قد کا گدی بیٹھا تھا۔ وہ بھی کچھ پی رہا تھا۔ اس کی گود پر دونوں کہنیاں ٹکائے چار پانچ سال کی ایک لڑکی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چہرہ صاف دکھائی نہ دینے کے باوجود میں بیوی کے ہاؤ بھاؤ سے بھانپ گیا کہ اس ماحول سے ایکا ایک سامنا ہونے سے وہ گھبرا گئی ہیں۔ میرے لیے وہ ماحول اجنبی نہیں تھا، کیونکہ جوہار میں وہ گھر ہی کیا جہاں گھر میں بنی کچی شراب اور دارو سے مہمان کا سواگت نہ ہو۔ میں صرف رسم نبھانے کے لیے ایسی مہمان داری قبول کرتا رہا، اس لیے نہیں کہ میں پارسا قسم کا آدمی ہوں، بلکہ اس لیے کہ دارو سے میری تیزابیت بڑھ جاتی ہے۔ وہ گدی سلیقے سے اٹھا اور للت سنگھ جی کو نئے مہمانوں سے نپٹنے کا موقع دے کر باہر چلا گیا۔ لڑکی وہیں رہ گئی تھی۔ للت سنگھ نے گدیوں کی بولی کی نقل کرتے ہوئے اس سے پوچھا، ''کہاں

Scanned with CamScanner

ہے تیری ممی؟'' اس لڑکی نے ایک بار دروازے کی طرف انگلی اٹھائی، دوسری بار میری بیوی کی طرف۔ للت سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ ہے تیری ممی؟ شیطان کہیں کی!'' مجھ سے انھوں نے کہا، ''یہ (گدی) میرا دوست ہے۔ آج میں نے اسے دعوت دی تو کہنے لگا، میں تو نخالص مڑوے کی روٹی کھاؤں گا، لا جہاں سے لاتا ہے... اس نے سوچا ہوگا یہاں چاول مل جائے گا، گیہوں مل جائے گا، مڑوا کہاں ملے گا! یہ تو جاڑا ہو، گرمی ہو، رات میں بھی بھات ہی کھاتے ہیں۔ کیسا چھل رہا تھا مجھے! میں نے کہا کہ تجھے مڑوے کی روٹی ہی کھلاؤں گا، نخالص مڑوے کی۔ یہ للت سنگھ کا گھر ہے، مذاق نہیں ہے۔''

میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوے انھوں نے کہا، ''تجھے میں جو کی روٹی کھلاؤں گا۔ نخالص جو کی۔'' میری بیوی کی طرف دیکھتے ہوے انھوں نے کہا، ''آ گئے نا آپ اُڈیار (گپھا) کے اندر؟ یہ گپھا ہے گپھا! للت سنگھ کی گپھا! سب ملے گا یہاں، مڑوا، جو... ابھی آپ کو جو کی روٹی کھلاتا ہوں۔''

میری طرف دیکھ کر انھوں نے پھر وہی جملہ دہرایا، ''تو کیسے آ گیا یہاں؟ اچھا، ایسا کرتے ہیں کہ جب تک کھانا بنے تب تک تو انگریزی میں بات کر اور میں تبتی میں جواب دیتا ہوں، تا کہ سمجھ میں نہ آئے کہ دوسرا کیا کہہ رہا ہے۔ بول، انگریزی میں بول۔ 'واٹ ڈو یو ڈو' ہی تو کہتے ہیں؟ تبتی میں کہتے ہیں...''

اس کیفیت میں بھی انھیں احساس تھا کہ وہ ماحول ہمیں راس نہیں آ رہا ہے۔ شاید اس لیے انھوں نے موقعے کی مناسبت سے کہا، ''میں نندا دیوی کا دھامی[1]... نندا دیوی کا دھامی، دُرگا کا دھامی، مہا کالی کا دھامی۔ میں بھی کالی ہی ہوں، مہا کالی ہوں... کالی کے بھکتوں کا گھر ایسا ہی ہونا چاہیے...'' نشہ اور اتر گیا تو ایک اور بات سامنے آئی۔ ''میری کوئی اولاد نہیں ہے نیتر! لیکن تین گھوڑے ہیں، بیل ہیں، گائیں ہیں، مرغیاں ہیں، اور یہ ہے...'' انھوں نے پاس بیٹھے کتے کے کندھے پر تھاپ دی۔ پھر کتے سے کہا، ''ہاتھ ملا، چل ہاتھ ملا اِن سے، بے کوف!''

کتے نے بے دلی سے میرے ہاتھ میں پنجہ دے کر ہٹا لیا۔ ''ہاں، تو میں کہہ رہا تھا... میری کوئی اولاد نہیں ہے، لیکن یہ تو ہے۔ لوگوں نے کہا کہ دوسری شادی کر لوں۔ میں نے کہا، نہیں، نہیں کروں گا

---

[1] دھامی: گوں والوں کا تسلیم کردہ پجاری؛ برہمن نہیں، برہمن تو وہاں صرف منتر وغیرہ پڑھتا ہے دیو پوجن کے وقت۔

Scanned with CamScanner

دوسری شادی۔ یہ لوگ سمجھتے نہیں ہیں کہ عورت کیا ہوتی ہے۔ عورت کو یہ کیا سمجھیں گے! ارے، ماں کی کوکھ میں نو مہینے تو ہر آدمی رہ لیتا ہے۔ اصل آدمی وہ ہے جو عمر بھر عورت کی کوکھ میں رہے، جنم جنمانتر تک... میرا منسیاری کا مکان جل گیا ہے حال ہی میں۔ کسی بچے سے بھول ہوگئی۔ بچے سے کیا کہیں! کچھ دن بعد منسیاری لوٹ کر سدھاروں گا، جو بچ گیا ہے اسے۔''

میں نے چاہا کہ للت سنگھ جی کو پاچھو کے زمانۂ حال تک لاؤں لیکن وہ اتنا ہی آئے: ''بڑا خراب زمانہ آ گیا ہے بیٹر... 'او میری ساس، تو بڑی کشل ہے، پانی تو لے ہی آئی ہے، اب چولھا بھی لیپ دے' والا زمانہ آ گیا ہے یہ!''

کھانا آیا۔ بھات اور ماس — جو کی روٹیاں نہیں۔ پھر ہمیں اپنا سارا بستر دے کر للت سنگھ جی یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے کہ وہ تھوڑی دیر گدی کے ساتھ بیٹھیں گے۔ انھوں نے ہمیں ٹوکنے اور تکلف ظاہر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

صبح منھ اندھیرے بستر میں لیٹے لیٹے دیکھا کہ سامنے دیوار سے پیٹھ ٹکائے تین لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ میں اٹھا تو کسی نے فوراً کہا، ''گنگھر سے مکھ آئے ہیں۔'' میں نے مکھ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''اتنی جلدی کیسے آ گئے؟''

''کل رات۔ ٹارچ مانگ کر یہاں آئے تھے۔ میں ذرا جلدی آ گیا۔ بعد میں کہیں چلے جاتے تو بڑی دقت ہو جاتی۔ کل میں نے فلاں سے کہا تھا کہ آپ اس طرف آئے ہیں تو اپنی جنم بھومی دیکھے بنا نہیں لوٹیں گے۔'' مکھ کا چہرہ ظاہر ہوا۔ کافی خشک چہرہ ہو گیا ہے، حالانکہ عمر پینتیس چھتیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔

للت سنگھ جی اور ان کے گھر کے دو تین افراد ہمیں گاؤں کے چھور تک پہنچانے آئے۔ پاچھو ابھی زیادہ تباہ نہیں ہوا ہے۔ للت سنگھ جی کا وہ روپ اتر چکا تھا جو رات میں دیکھا تھا۔ وہ کم گو اور شائستہ ہو گئے تھے۔ گاؤں کے چھور پر ایک گلیارے میں دیوار کے سہارے کھڑی تین چار عورتیں ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ صبح صبح وہ عجوبہ بھی شاید مجھ میں نہیں، میری بیوی میں تھا: سوک کی بیوی ہو کر بھی شلوار قمیض پہنتی ہے، پنجابن جیسی!

پاچھو کا پل ویسا ہی تھا جیسا میں نے اسے تیس بتیس سال پہلے دیکھا تھا۔ چار پانچ موٹی

لکڑیوں کا تانا اور شاخوں اور بیل کی جھاڑیوں کا بانا۔ تٹ پار کرنے کے بعد بھوج کے پیڑوں کی طرف خود بخود سر اٹھ گیا۔ پہلے بھی انھیں وہیں دیکھا تھا۔ یاد آیا کہ تھالہ میں فلاں نے بھوج پتر اور کول کٹو (برہما کمل) لانے کے لیے کہا تھا۔ ''جس کے گھر میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں، اس پر جادو نہیں چلتا...'' میں نے سڑک کے کنارے اوپر جا کر تنوں سے بھوج پتر اکھاڑے۔ چاقو نہیں تھا، ہوتا تو انھیں قاعدے سے اتار سکتا۔

ہلکی چڑھائی چڑھ کر ہم گنگھر میں اس جگہ پہنچے جہاں میرے جوہار کے زمانے میں تین چار بڑے بڑے پتھر پڑے رہتے تھے۔ بڑی عمر کے لڑکوں میں کبھی کبھی ان پتھروں کو اٹھانے کا مقابلہ ہوتا تھا اور ہم پاس کھڑے تماشا دیکھتے تھے۔ بڑے لڑکوں سے نظر چرا کر کبھی کبھی ہم بھی زور آزماتے تھے، لیکن وہ پتھر ہم سے صرف ہل کر رہ جاتے تھے۔ وہیں تبت جاتے سوکوں کو وداعی دینے کے لیے گاؤں کے ڈوم تھوڑی دیر بیٹھ کر نگاڑے دموے بجاتے تھے۔ بغل میں دیکھا تو ڈمیوڑ (ڈوموں کی بستی) کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ چھتیں غائب تھیں، جیسے پنجرے ٹوٹنے پر پنچھی اڑ گئے ہوں... کیسی توہین سے لدی زندگی تھی اُن آدمیوں کی۔ ان کی بستی کا وہ حال دیکھ کر دل سے جیسے ایک بہت بڑا پتھر ہٹ گیا۔ جن گھروں میں آدمی اتنی شرمناک اور شکست خوردہ زندگی جی سکتا ہے انھیں تو اجڑنا ہی چاہیے، جیسے بھی اجڑیں۔

یہیں اسی بستی میں نہ جانے کس مہینے میں صبح قریب چار ساڑھے چار بجے نوبت سنائی دیتی تھی۔ آنکھ کھل جائے تو میں دھیان سے نوبت سنتا تھا۔ یاد نہیں ہے کہ نوبت کی دھن کیسی ہوتی ہے، اب اتنا ہی یاد ہے کہ اس میں کہیں دور لے جانے کی کشش ہوتی ہے۔ نگاڑوں دموؤں کی ایک دھن یاد ہے۔ پہلے نگاڑا بجتا ہے: بُرڈُنگ... بُرڈُنگ... بُرڈُنگ... بُرڈُنگ... اور بیچ سے دموؤں کی سنگت چھوٹتی ہے: گوتی... گوتی... گوتی... بُرڈُنگ... بُرڈُنگ... گوتی... گوتی... گوتی... گوتی... بُرڈُنگ... بُرڈُنگ... گوتی... گوتی... گوتی... بُرڈُنگ... بُرڈُنگ... اور گونج ٹوٹ کر کہیں الگ ڈرت ہوتی رہتی ہے۔ ڈُنگ آ... ڈُنگ آ... ڈُنگ آ... ڈُنگ آ...

یہ آواز بڑی قدیم آواز ہے۔

گلیارے کی بغل میں ہی ایک دھرم شالہ آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کیلاش مانسرور کے

Scanned with CamScanner

زمانے میں اس میں رہنے کے لیے، کبھی کبھی جوگی آتے تھے، باہری مہمان بھی۔ مکھ مجھ سے آپ آپ کہہ رہا تھا، میں بھی اسے آپ آپ ہی کہہ رہا تھا۔ لڑکپن کے اس دوست کا پورا نام جاننے کا مجھے کبھی دھیان ہی نہیں آیا، تب بھی نہیں جب اسے جوہار چھوڑ دینے کے دس بارہ برس بعد دیکھا، اِس بار جوہار جا کر بھی نہیں۔ مکھ گاؤں کے پردھان کا بیٹا ہے۔ اب اس کا سب سے بڑا بھائی پردھان ہو گیا ہوگا، چاہے جہاں بھی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ کشتی میں میں مکھ سے ہار جاتا تھا لیکن ایک شام میں دو بار جیت گیا اور تیسری کشتی برابری میں چھوٹ گئی۔ وہ ہم دونوں کی آخری کشتی تھی...

ہم پردھان کے گھر کے آگے کچہری [1] میں بیٹھے۔ کچہری میں نیچے پاتھر بچھے ہیں اور بیٹھنے کے لیے ایک طرف سے ڈیڑھ دو فٹ اونچی نیم دائرے کی شکل کی دیوار ہے۔ مکھ نے چلم بھر کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ بیوی اور گوپال اندر چلے گئے۔ ماضی میں کچہری میں بیٹھنے والوں میں سے کسی کا چہرہ یاد نہیں آ رہا تھا، مٹا مٹا سا گروہ ہی تصور میں اپنا عکس ڈال رہا تھا... دو آدمی اور آئے اور پرنام لگا کر بغل میں بیٹھ گئے۔ اب گاؤں کے چار آدمی کچہری میں بیٹھے تھے: گجے سنگھ، درگا سنگھ، مکھ اور نیتر سنگھ... گاؤں کا کوئی اور آدمی (مرد) گاؤں میں نہیں تھا۔

پچیس تیس ثابت ٹوٹے مکان اِدھر اُدھر... کچہری سے گاؤں کا آدھے سے زیادہ اندرونی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے جوہار کے زمانے کی سمت دیکھنا چاہا، لیکن یاد کا سلسلہ کہیں سے نہیں جڑ رہا تھا۔ میں ساتھ ساتھ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کھیتوں میں کہیں سے لاکھوں ٹڈی آ گئے ہیں اور ہم بچوں نے انھیں مار مار کر ڈھیر لگا دیا ہے جگہ جگہ۔ اِدھر میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا ہوں، ماس کی بوٹیاں دھوپ میں سوکھ رہی ہیں۔ ماں ہاتھ میں کھانے کا بیال (بڑا کٹورا) جما کر کہتی ہیں، ''یہیں بیٹھ کر کھا۔ کوّے آئیں تو انھیں شکار (گوشت) مت کھانے دینا۔'' اُدھر ایک عورت ڈوَنی (لکڑی کے ایک خاص طرح کے لمبوترے برتن) میں رائی ڈال رہی ہے اور جھاگ دار سنہرا تیل نکل رہا ہے... وہ لڑکا... وہ جس کی ماں اس کے بالوں کی عجیب سی لٹیں بنا کر باندھ دیتی تھی، کیا نام تھا اُس کا؟... ماں سے میری ایک پٹائی کے لائق حرکت کا راز جان کر بٹن بٹن کھیلتے وقت ہار جانے پر کہتا تھا، ''لا میرے بٹن، نہیں تو وہ بات تیری ماں سے کہہ دوں گا۔'' بٹن لے لے کر اس نے مجھے سال ڈیڑھ سال تک

---

[1] کچہری یعنی وہ اڈا جہاں فرصت ملنے پر مرد بیٹھ کر اُون کاتتے ہوئے بات چیت کرتے تھے۔

بلیک میل کیا تھا... ایک دن ایک صاحب آیا، نندا گھونگٹی اور بگیال دیکھنے... چہرہ کیسا تھا اس کا؟ صرف اس کے سر کے سولا ہیٹ اور ٹھڈی کے اُس حصے کی ہلکی پرچھائیں ابھر رہی ہے جہاں ہیٹ کی پٹی اٹکی رہتی ہے... اس گھر کے سامنے لاما کو بیٹھے دیکھا تھا جو بغل میں اناج کے ڈھیر سے نالی (پہاڑ کا اناج بھرنے کا پیمانہ) بھر بھر کر الگ رکھتے ہوئے عجیب سی آواز میں گنتا جا رہا تھا: گجے گجے گجے گجے گجے، بجے بجے بجے بجے... (یہ صرف اس آواز کی نقل ہے: ایکا ایکا ایکا ایکا، دُوا دُوا دُوا دُوا دُوا...)... نندا اَشٹمی کو رات بھر ڈھسک چاچری (اجتماعی ناچ اور گانے) کا دور چلتا تھا۔ گیت کا ایک جھما کا پہلے مردوں کی جھومتی ہوئی قطار سے اٹھتا تھا، اور پھر دوسرا جھما کا عورتوں کی قطار سے۔ ان جھماکوں میں سے ایک ہی بے آواز سطر بھٹک کر لوٹ سکی: ''کتیورا کی سَیلا بواری، مار جھپک!'' (کتیور کی سیر کر رہی ہے، بہو، موج کر!) اور پتا کا چہرہ؟ صرف بڑی بڑی، ہونٹوں کی طرف گھومی ہوئی مونچھیں، پگڑی، اور پھر کئی سال بعد گاندھی ٹوپی، باقی چہرہ غائب... آواز کی بھی یاد نہیں، صرف آواز کا اثر باقی ہے... ایک رات جنگل میں خیمے کے باہر آگ کے پاس بندھے گھوڑے اور بیل دیکھ کر ٹُھل باگھ (بڑا باگھ یعنی شیر) بہت نزدیک آ کر دہاڑنے لگا تو انھوں نے ایسا ہا کا لگایا تھا کہ سارا جنگل گونجنے لگا، پیڑوں کے پتے تھر تھرانے لگے۔ ٹُھل باگھ چپ ہو گیا۔ ٹُھل باگھ کی آواز سے بھی بڑی آواز سن کر ہمارا ٹُھل باگھ کا ڈر غائب ہو گیا...

ایک بھی عکس واضح نہیں ہو رہا تھا۔

کچہری کے نیچے ایک سیدھ میں بجڑے ہوئے خستہ حال مکانوں کی طرف دیکھا۔ بیچ میں دو منزلے پر جھوگول (لمبی فراک) پہنے ایک دو ڈھائی سال کی لڑکی باہر کو نکلی ہوئی پتھر کی سیڑھی تک آئی اور پھر اندر کو چلی گئی۔ دوبارہ آئی اور اندر چلی گئی۔ نیچے گوبر کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس پر مکھیاں نہیں بھنک رہی تھیں۔ (جوہار میں مکھیاں نہیں ہوتیں؛ جونک، پسّو، کھٹمل بھی نہیں ہوتے۔) گوبر کے ڈھیر کے پیچھے تین گوٹھوں کا منھ کھلا ہوا تھا۔ ان کے دروازے جانے کب کے ٹوٹ چکے تھے... ایک اور غیر واضح عکس... انھی میں سے ایک گوٹھ (مکان کے نچلے حصے) میں ایک رات ماں کے ساتھ میں تب گیا تھا جب ہمارے ساتھ کھیلنے والا ایک لڑکا مر گیا تھا... میں ماں کی بغل میں بیٹھا تھا۔ کئی عورتیں رو رہی تھیں۔ ماں چپ تھیں۔ اُس لڑکے کی ماں بال پھیلائے بَین کر رہی تھی۔ اس رات میں نے پہلی بار

میں نے محسوس کیا کہ رونا بَین سے الگ ہے۔ بَین کا انتہائی نقطہ تب شروع ہوتا ہے جب آنسو ختم ہو جاتے ہیں اور آواز باہر نکالتے وقت پھیپھڑے تھکنے لگتے ہیں... تصور میں اس لڑکے کا چہرہ واضح نہیں ہو رہا تھا، صرف کھلے ہوئے ہونٹوں کے بیچ چمکتے بھنچے ہوئے دانتوں پر خیال اٹکا رہا... ماں اُس لڑکے کا نام لے کر کہا کرتی تھی، ''دیکھا تو نے، کتنی جلدی اٹھ جاتا ہے، کتنا چست ہے۔ ایک تو ہے، جو گھام (دھوپ) آنے تک بستر میں پڑا رہتا ہے...'' یہ واقعہ الفاظ دیے بغیر زندہ نہیں ہوگا۔ اس لڑکے کی ماں بَین کر رہی تھی: ''ہے آماں ں ں، تیئں کاں نھئی گے چھے (او بیٹے، تو کہاں چلا گیا...) میرے لاڈلے بیٹے، تجھے اب کہاں دیکھوں گی... تیرا بولنا کہاں سنوں گی... نہیں نہیں، یہ اولاد میری ہونے والی اولاد ہی نہیں تھی... نہیں بیٹے، تو میرا ہونے والا ہی نہیں تھا... تو میری کوکھ جلانے کے لیے ہی پیدا ہوا تھا، تبھی تو اتنا چست تھا، گورا، اجلا اور تندرست تھا... بیٹے، تبھی تو تو کبوتر کی طرح بولتا تھا...''

اس رات میں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ مرنے کے بعد لوٹنا نہیں ہو سکتا... کیا ایسی کوئی شکتی نہیں ہے جو اس دھرتی کا یہ دکھ مٹا سکے؟ کیا کوئی بھی اُپائے نہیں ہے؟ آدمی اتنا مجبور ہے؟... یہ بین کیسے بند ہوگا؟ اس رات میں یہ بھی جان گیا تھا کہ ایک کا دکھ دوسرے تک کتنا پہنچ سکتا ہے۔

بارش شروع ہو گئی۔ میری خاموشی ٹوٹنے کا انتظار کرتے کرتے درگا سنگھ جا چکے تھے۔ مکھ گوٹھ کے آگے کھڑا اپنی بیوہ بھابی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ صرف گجے سنگھ پاس بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔ انھوں نے کہا، ''چلیے، اندر بیٹھتے ہیں۔''

مکھ سے میں نے کہا کہ کھانا کھا کر میرے ساتھ بگیاں کی طرف چلے۔ نندا گھونگٹی بھی دیکھنی ہے۔ اس نے کہا، ''بارش ہو رہی ہے۔ یہ جلدی تھمنے والی نہیں ہے۔ نندا گھونگٹی کی جڑ تک پہنچنے کے لیے صرف ڈھائی تین میل چلنا پڑتا ہے، لیکن وہاں آج بادل ہی بادل ہوں گے۔ کچھ نہیں دیکھ سکیں گے آپ۔ بگیاں بھی اِن دنوں ویسے رنگیول (رنگیلے) نہیں ہیں جیسے ستمبر میں ہوتے ہیں۔ کول کنو (برہما کمل) ستمبر میں ہی کھلتے ہیں۔ میں آپ سے ایک دن اور رکنے کے لیے کہتا، کل موسم کھل جاتا تو نندا گھونگٹی تک جاتے، لیکن میں مُنسیاری جا رہا ہوں۔''

''کل ہی؟''

''ہاں، ایک گائے تھی، مرگئی۔ اچھی بھلی تھی، دیوڈوش سے چٹ پٹ ہو کر مرگئی۔ دن میں تین بار دودھ دیتی تھی۔ کبھی تین سیر کبھی ڈھائی سیر... '' (اچھی نسل کی پہاڑی گائے ہی اتنا دودھ دیتی ہے۔) ''... خرابی یہ تھی کہ انجان آدمی کو مارنے جاتی تھی۔ اب منسیاری جا کر دیوتا پوجن ہے۔ تین چار سو روپے کا خرچ ہے یہ۔ دیوڈوش تو دور کرنا ہی ہے۔ یہاں آتے ہی نندا دیوی کی بھی پوجا کر دی...''

میں نے کہا، ''اکیلے ہی؟ پہلے تو سارا گاؤں پوجتا تھا ستمبر اکتوبر میں۔''

مکھ نے کہا، ''یہاں آتے ہی اکیلے پوج دیا۔ بھومی (زمین) ہی اُسی کی ہے۔ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے اسی کی سیوا ہونی چاہیے۔ جب تک اس کی سیوا نہ کرو، من بھاری رہتا ہے۔''

''بکریاں کہاں ہیں؟''

''دو نوکر ہیں،'' مکھ نے کہا۔ ''گواڑ لے گئے ہیں... '' یاد آیا کہ مجھے بھوج پتر کے ساتھ کول کپُو (برہما کمل) بھی تھالہ لے جانا ہے۔ مکھ سے مانگا تو اس نے چھت کی دار میں کھونسا ہوا ایک سوکھا کول کپُو دیتے ہوئے کہا، ''لیجیے، بس یہی ایک بچا ہے۔''

میں نے ہاتھ میں لے کر اس نج بج کول کپُو کو غور سے دیکھا۔ صرف تین چار سوکھی ہوئی پنکھڑیاں تھیں جو ذرا سی بے احتیاطی سے چورا ہو سکتی تھیں۔ بیچ کا وہ حصہ بجھے ہوئے کوئلے جیسا ہو گیا تھا جہاں پراگ ہوتا ہے۔ اس جرجر (شکستہ) کول کپُو کو میں نے احتیاط سے ایک کپڑے میں لپیٹ کر رکھ لیا۔ تازہ کول کپُو کی یاد آنے پر لمحہ بھر کے لیے اندر اُجالا کوندھتا ہے اور دوسرے ہی لمحے آتما کوملتا سے بھر جاتی ہے۔ یاد میں پورا پھول نہیں آتا— فوٹو دیکھ کر بھی نہیں۔ فوٹو کا پھول کول کپُو کے احساس سے محروم چھوڑ دیتا ہے۔ میں کول کپُو کی مہک کو بھی بھول گیا ہوں۔ جوہار میں اس پھول کی جتنی عزت ہے اتنی دنیا میں کہیں بھی شاید ہی کسی اور پھول کی ہوگی۔ نندا اشٹمی سے ایک دو دن پہلے نندا کا دھامی اور اس کے ساتھی نہا دھو کر، برت رکھ کر، پیٹھ پر ٹوکری لٹکائے، کول کپُو توڑنے کے لیے بگیال کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں وہ انتظار کرتے ہیں کہ کسی پھول کے اندر بھونرا بیٹھے تو پنکھڑیوں کو اس طرح باندھ دیں کہ بھونرا اندر ہی رہ جائے۔ یہ رسم پوری ہونے پر ہی دھامی اور اس کے ساتھی اَور پھول توڑتے ہیں۔ بگیال جاتے اور وہاں سے لوٹتے ہوئے دیوتا بار بار ان کے انگ سے ظاہر ہونے کے لیے کسمساتا ہے، لیکن وہ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر تھر تھر کانپتے ہیں، رونگٹے کھڑے

Scanned with CamScanner

ہو جاتے ہیں، خون کے دوران کی تیزی سے ان کے چہرے کا رنگ بدلتا رہتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، ماتھے کی سلوٹیں گہری ہو جاتی ہیں۔ کول کیو لادے ہوئے وہ گاؤں کے قریب پہنچتے ہیں تو لوگ باجے گاجے کے ساتھ جا کر ان کا سواگت کرتے ہیں۔ پہلا پھول (بھونرے سمیت) نندا دیوی کو چڑھایا جاتا ہے، باقی پھولوں میں سے زیادہ تر سارے گاؤں میں بٹ جاتا ہے۔ نندا اشٹمی کو ہی رسم کے مطابق کول کیو توڑ سکتے ہیں، جوہاری اس کے سوا سے کبھی نہیں توڑتے۔

مکھ رسوئی کی طرف چلا گیا تو گجے سنگھ نے کہا، ''ایک تکلیف دینی تھی آپ کو۔ میرا لڑکا چار سال پہلے (شاید تین سال کہا ہو) سڑک بناتے ہوئے مر گیا تھا۔ کیا اخبار میں چھپ سکتا ہے کہ وہ ایسے ایسے مرا، ایسا ایسا آدمی تھا؟''

میں نے کہا: ''اب خبر کی طرح تو نہیں چھپ سکتا۔ اتنے سال پہلے کی بات ہے... سڑک بنتے وقت کیا پتھر سے دب گیا تھا؟''

''سرنگ بچھا کر سب دور چلے گئے۔ میرا لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اور سرنگ پھوٹ گئے، لیکن ایک نہیں پھوٹا۔ جانے کیسی مت بگڑ گئی کہ وہ سرنگ کے پاس جا کر دیکھنے لگا کہ کیوں نہیں پھٹ رہا ہے۔ وہ جانچ ہی کر رہا تھا کہ دھماکا ہوا۔ چھینٹے چھینٹے ہو گیا تھا... میرا آخری لڑکا تھا وہ۔ ایک لڑکا اس سے پہلے مر گیا تھا... کیا یہ اخبار میں نہیں چھپ سکتا؟''

''چار سال پرانی بات ہے... پہلے یہاں سے کسی نے خبر بھیجی ہوتی تو شاید چھپ جاتی...''

ایک اور بات کے سلسلے میں گجے سنگھ نے میری رائے جاننی چاہی۔ ''بہو چلی گئی ہے دوسرے گھر۔ ساتھ میں اپنی لڑکی کو بھی لے گئی ہے۔ میری پوتی، وہ میرے بیٹے کی ایک ہی نشانی تھی۔ کیا قانون میری مدد نہیں کر سکتا کہ وہ میرے پاس آ جائے؟ اپنی پوتی کے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ ہمیشہ اس کی یاد آتی رہتی ہے...''

میں نے کہا: ''اس معاملے میں قانون آپ کی کیا مدد کر سکتا ہے؟ بچی تو ہے نہیں کہ آپ کی بہو آپ کے ہی ساتھ رہے۔ بیٹی پر آپ سے زیادہ اسی کا حق ہے۔ مقدمے بازی کے چکر میں مت پڑیے گا۔ کوئی کھاؤ قانون باز پٹواری سٹواری خالی آپ کے روپے اینٹھتا رہے گا اور اگر عدالت جانا پڑا تو گھر کا کام دھندا بھی چوپٹ ہو جائے گا۔''

Scanned with CamScanner

گجے سنگھ سر جھکائے دیر تک چپ رہے۔ پھر اسی معاملے پر کچھ کھودنے کی گنجائش دیکھنے کے لیے انھوں نے کہا، ''آپ دیس پردیس دیکھے ہوئے آدمی ہیں۔ کوئی نہ کوئی اُپائے تو ہوگا... کیا کچھ نہیں ہوسکتا؟''

''ایسا کوئی اُپائے نہیں ہے بھائی صاحب! دل مضبوط رکھیے۔ اور کیا اُپائے ہوسکتا ہے؟''

گفتگو ختم ہوگئی۔ بھاری قدموں سے اٹھ کر باہر جاتے ہوئے انھوں نے کہا، ''کیا لے جائیں گے آپ یہاں سے؟ کیا دیں؟ گھر میں کوئی ہوتا تو پٹھون (تحفہ) بنا دیتا۔ کھیتوں میں تھوڑا ڈن (لہسن کی پتیوں جیسی خوشبودار گھاس جو سکھا کر دالوں اور دوسرے کھانوں میں بگھار دینے کے لیے استعمال ہوتی ہے) توڑ لاؤں؟''

میں نے کہا، ''نہیں، رہنے دیجیے۔ کچا ڈن لے جائیں گے تو سکھائے گا کون؟ ہم تو کل ہی منسیاری لوٹ جائیں گے۔ بغیر سکھائے راستے میں وہ سڑ جائے گا۔''

گھوم کر تھوڑا جھکے ہوئے وہ سیڑھیوں کے نیچے اتر گئے۔ پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ کھانا رسوئی میں لانے میں مکھ اپنی بھابی کی مدد کر رہا تھا۔ ہم تینوں نہ چاہتے ہوئے بھی مہمانوں کی طرح بیٹھے اسے دیکھتے رہ گئے۔ دل میں ضرور یہ بات آرہی تھی کہ یہ کام اس کا نہیں ہے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے مکھ سے پوچھا، ''کیا گجے سنگھ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟''

''بڑھاپے میں اکیلے رہ گئے ہیں بیچارے۔ لڑکا سڑک بناتے ہوئے مر گیا تھا۔ شاید آپ کو بتا رہے تھے... ایسا ہوسی (زندہ دل) اور رونقی لڑکا تھا کہ کیا بتائیں۔ گاتا تھا، ناچتا تھا۔ ہولی، رام لیلا، کوتکوں (میلوں) میں جہاں پہنچ جائے وہیں رونق آجاتی تھی۔ اُس کے بنا سب سُونا سُونا ہوگیا ہے۔ ہمارے گاؤں میں اب ایسا کوئی لڑکا نہیں ہے...''

میں نے کہا، ''یہاں کی رونق تو ویسے ہی ختم ہوگئی ہے۔ آپ شاید منسیاری کی بات کر رہے ہیں... کیا گجے سنگھ جی کو معاوضہ ملا تھا؟''

''ہاں، شاید آٹھ ہزار روپے ملے تھے۔''

مینا سے میں نے کہا، ''نندا گھونگٹی رہ گئی۔ ایسی بارش میں چلنے کی ہمت کر سکو تو چلیں فوراً۔ ٹولہ جلدی پہنچ جائیں گے۔ یہ بارش تو اب شاید شام تک نہیں تھمے گی۔ سستی آگئی تو دو تین گھنٹے یونہی برباد

ہو جائیں گے۔"

مینا نے کہا، "چلیے، چلتے ہیں۔"

گاؤں کے چھور تک مکھ ہمارے ساتھ آیا۔ ایک کھیت پر گجے سنگھ جی زمین کھود رہے تھے۔ اس موسم میں ان کا کھیت پر جانا ضروری نہیں تھا، یہ مجھ پر واضح تھا۔ شاید اندر کے سناٹے سے پیچھا چھڑانے کے لیے کھیت پر آ گئے تھے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ جلدی ہی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ جو ہار سے باہر جا کر انھیں جوانی میں بھی دیکھا تھا۔ کڑوی سے کڑوی بات پی جاتے تھے۔ ایسا شانت سبھاؤ مجھے پریشان کر دیتا تھا۔ انھیں ہمیشہ ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے دیکھنے کی یاد ہے۔ اُس دن بھی وہ یہ بات کہتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ "اے ڈی ایم سیپ آئے تھے پچھلے برس (شاید دو تین سال پہلے کہا ہو)۔ کہہ رہے تھے، گجے سنگھ، گنگھر میں باسٹھ (شاید پینسٹھ کہا ہو) ایکڑ زمین ہے، لیکن رقم (لگان) دینے والا کوئی نہیں۔ کم سے کم کچھ تو ملنا چاہیے... میں نے کہا، یہاں کتنے لوگ آئے ہیں، یہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ خالی ہاتھ ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ دستور ہی سہی، میں نے سوا پانچ روپے ان کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ہنس رہے تھے بیچارے..." ہماری طرف منڈیر پر آ کر گجے سنگھ نے کہا، "جا رہے ہو آپ؟ جائیے... منسیاری میں اور تھالہ میں جو بھی ملے اسے گاؤں کا حال بتا دیں۔"

سڑک پر پہنچا کر مکھ لوٹ گیا۔ جُتے ان جُتے کھیت پیچھے چھوٹ گئے۔ بارش دھیرے دھیرے تیز ہو گئی، اور تیز۔ ہم پشمینہ لپیٹے اور اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے چپ چاپ چل رہے تھے۔ ماپا کی طرف جاتے ہوئے ہوا منھ پر آتی ہے، کبھی کبھی ہونٹ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں اور سانس کے بجائے ہوا اندر جاتی ہے۔ سانس کچھ لمحوں تک لوٹتی ہی نہیں ہے۔ پان سنگھ جی نے ماپا کے میدان کا ایک سرا پار کر کے بُرفو کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا، "یہ ہوا ابھی پیچھے ہے، اس لیے تنگ نہیں کر رہی ہے۔ آپ جب لوٹیں گے تو سیدھے منھ پر آئے گی اور کہیں کہیں چلنا مشکل کر دے گی۔" میدان، ڈھلان اور نالہ... پھر میدان، ڈھلان اور نالہ... پیچھے مڑ کر دیکھا، گنگھر چھپ گیا تھا، صرف اس کے سرھانے پہاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ منھ پر ہوا کے ساتھ بوندوں کی بوچھار آ رہی تھی، باریک باریک بوندوں کی بوچھار ... اس سفر میں منگلیش ڈبرال کو ساتھ آنا تھا، لیکن وہ دلّی میں آنے کی تیاری کرتے کرتے ذرا زیادہ ہی شاعر ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا، "نے ٹی وِٹی (nativity) بڑی چیز ہوتی

ہے راوت۔ بُری چیز علاقائیت ہے... ''اس گرد و پیش نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا ہوگا... یہ ہٹ جائے تو میری حساسیت کتنی باقی رہ جائے گی؟... چہرے پر بوندوں کی بوچھار، ہوا کے اندر ہوا، خالی پن کے اندر خالی پن، بارش کے اندر بارش... یہ سفر ہے یا واپسی؟ یادوں کے اندر سے زیادہ تر مرے ہوے، بچھڑے ہوے لوگوں کی ہی یاد آ رہی تھی۔ اُس نوجوان کا نام پوچھنا ہی بھول گیا... اپنی آپ بیتی کے دوسرے حصے، میری یونیورسٹیاں، میں گورکی نے ایک ایسے نوجوان کا ذکر کیا ہے جو دل سے شاعر تھا اور مچھلی پکڑنے کے بہانے رات رات بھر وولگا کے کنارے بیٹھا رہتا تھا... وہ نوجوان فنکار تھا جو آخرکار مارنے کے لیے دھوکا دیتی ہوئی سرنگ کے پاس جا کر مرگیا۔

The fruitless thought of what I might have been, haunting me ever, will not let me rest
A cold north wind has withered all my green
My son is in the West.
— *Christina Rozetti*

I look
After and before
And pine for what is not...
I fall upon the thorns of life
I bleed.
— *Shelley*

گوری کے اُس پار بُرفو میں اُس گھر کو دیکھ کر خیال آیا کہ پچھلے دن ہمیں وہاں لوٹنا تھا۔ انھوں نے کل ہمارا انتظار کیا ہوگا اور آج بھی۔ اس بارش میں وہاں جانے کا مطلب تھا ایک میل کا پھیرا اور کم سے کم ایک گھنٹے کی دیر۔ بیوی کا صبر لڑکھڑا رہا تھا۔ گوپال میل ڈیڑھ میل آگے چلا گیا تھا۔ اسے روک کر اُس پار پیغام بھجوانے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ پشمینے بھیگ کر ٹپک رہے تھے اور اندر کپڑوں میں بھی پانی پیٹھ گیا تھا۔ دل میں خالی پن تھا اور کہیں ایک پھسلن بھی، ورنہ میں ان سب رکاوٹوں کو لانگھ کر

وہاں جاسکتا تھا...

بارش نے ٹولہ پہنچنے تک ساتھ نہیں چھوڑا۔

مُنسیاری لوٹتے وقت جوہار نے ہمیں نکھری ہوئی الوداع کہی۔ صبح کھلی دھوپ میں 'لھاپاک بن کٹی' کے علاوہ ٹولہ سے دکھائی دینے والی ساری چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ آنگن پر آ کر دیکھا کہ مرتولی کی بغل کے بڑے پہاڑی سلسلے کے پیچھے بائیں طرف تھوڑا سا جھکی ہوئی، برف سے سفید دو چوٹیاں ٹولہ کی سمت جھانک رہی ہیں۔ ان چوٹیوں کی روشنی نے سحرزدہ کر دیا۔ میں نے اشارے سے اپنے سمبندھی سے پوچھا: کیا نام ہے ان چوٹیوں کا؟

انھوں نے کہا، "نندا گھونگٹی یہی ہے۔ سمتیں کھل جائیں تو میرے گھر کے آنگن سے اسے کبھی بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

میں ٹھگا سا نندا گھونگٹی کی طرف دیکھتا رہا۔ بائیں طرف کو تھوڑا سا جھکی ہوئی، نندا گھونگٹی کی دو چوٹیاں ٹولہ سے اجلے گھونگھٹ سی دکھائی دیتی ہیں: ایک آگے اور دوسری اس کی آڑ میں، گردن تھوڑی اور جھکائے ہوئے جھانکتی ہوئی سی، پیچھے۔ سب طرف نیلا آکاش اور بیچ میں دو گھونگھٹوں کا اجالا... نظر ہٹا کر دوبارہ دیکھا، دھوپ اور نیلے پن کی جھائی برف کی آب کے ساتھ حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوئی... نظر ہٹا کر بیچ کے کسی نقطے کو غور سے پھر دیکھا، برف کی آب سے ویسی ہی ہنستی ہوئی چمک پھوٹ رہی تھی جیسی روشنی کی زد میں آئے صاف شفاف دانتوں سے پھوٹتی ہے۔ دوسرے نقطے پر دیکھا، پھر وہی۔ تیسرے نقطے پر دیکھا، پھر وہی... نظر ہٹا کر پھر دیکھا تو نندا گھونگٹی کا عکس نظر سے پرے جا کر آتما کے اندر آ گیا۔ نندا گھونگٹی بلجو سے کچھ اور دکھائی دیتی ہوگی، پاس جا کر کچھ اور۔ نندا گھونگٹی اس دھرتی پر ہو کر بھی اس دھرتی کی نہیں لگتی... پنچ چولی کی سب سے اونچی چوٹی اسی دھرتی پر ہے لیکن وہ بھی اس دھرتی کی نہیں دِکھتی۔ نندا گھونگٹی کی سیدھ میں پاچھو تک پہاڑوں کی قطار پر کہیں برف نہیں تھی لیکن پاچھو کے پہاڑ کے اوپری حصے پر جگہ جگہ تازہ برف کے گالے بکھرے ہوئے تھے۔ جوہار میں اس اونچائی پر کبھی کبھی جون میں بھی برف گرتی ہے۔ پہاڑی سلسلے کے بائیں سرے پر 'لھاپاک بن کٹی' بادلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بادل صرف وہیں تھے۔ لھاپاک بن کٹی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ 'بن کٹی' شاید 'بن کوٹ' (کلھاڑی) سے بنا ہے۔ ممکن ہے کہ لھاپاک بن کٹی کی چوٹی

کلھاڑی جیسی ہو یا کلھاڑی والے آدمی جیسی۔ وہ چوٹی ایسی دکھائی دیتی ہو جیسے کندھے پر کلھاڑی رکھے کوئی شخص کھڑا ہے یا کہیں جا رہا ہے۔ ہمالیہ کی بہت سی چوٹیاں انسانی شکل کی ہیں، کچھ جزوی طور پر بے شکل، کچھ پوری طرح بے شکل۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لھاسپاک بن کٹی کی چوٹی محض کلھاڑی کی دھار جیسی ہی ہو...

بگیال چھوٹ ہی گئے۔ پچھلے سال گڑھوال میں کیدار ناتھ چھوٹ گیا تھا۔ گنگا کے منبع سے لوٹتے ہوئے کسی نے کہا تھا، ''اس سال بدری ناتھ ہی دیکھ آیئے، کیدار ناتھ دیکھنے کے لیے پھر کبھی آیئے۔'' کہیں جاؤ تو کچھ نہ کچھ ایسا چھوڑ ہی دینا چاہیے کہ دوبارہ لوٹنے کی خواہش بنی رہے۔

بوگڑیار جاتے وقت ماپانگ سے بارش شروع ہوئی تو راستے بھر نہیں رکی۔ بوگڑیار کے پاس سڑک پر جمی برف پر پتھر گرے ہوئے تھے، موت کے احساس کی طرح۔ ان پر مٹی اور گھاس کا رس پُتا ہوا تھا جو یہ جتلا رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی سڑک پر آئے ہیں۔ آگے ایک گپھا کے اندر سڑک کی مرمت کرنے والے مزدور بیٹھے تھے۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ بارش بند ہو تو وہ جا کر سڑک پر گرے پتھر ہٹائیں۔ بوگڑیار کے پاس ہی اوپر پتھر گرنے کی ہلکی آواز سے میں چونکا۔ بہت اوپر تین چار پتھر تھوڑی دور تک ہلکے ہلکے لڑھکتے ہوئے آئے اور جمے ہوئے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر تھم گئے۔ ایک دم نقلی منظر ہو گیا تھا وہ۔ یہ بھی نہیں جتلا سکا کہ پتھر کیسے گرتے ہیں۔ بوگڑیار میں بھی رات دیر تک موسلا دھار بارش کو سنتا رہا۔ صبح چائے پینے کے بعد دکان سے لوٹ کر گوپال نے کہا، ''سیپ، آگے راستہ ٹوٹ گیا ہے۔ میٹ (مزدور) وہاں سڑک بنانے کے لیے اکیلا ہی چلا گیا ہے...''

پہلے دن میں نے اُس مزدور کو دیکھا تھا۔ وہ ٹولہ سے ہی ہم سے پہلے چلا تھا۔ راستے میں ہم اُسے پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے آ گئے تھے۔ اُس بارش میں بیمار بوڑھا باپ اور بیمار بیوی اس کے ساتھ تھی۔ سات اٹھ برس کا اس کا لڑکا کبھی خود چل رہا تھا کبھی باپ کے کندھوں پر بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔ ساتھ میں دو بیل بھی تھے۔ میں نے گوپال سے کہا، ''تم جا کر مزدور کی مدد کرو۔ ہم تب تک کھانا بناتے ہیں۔''

قریب دو گھنٹے بعد گوپال نے لوٹ کر کہا، ''راستہ بن گیا ہے۔ ہم تو جا سکیں گے، لیکن مزدور کے خاندان کو رکنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ بیل ہیں۔ بیلوں (یعنی پہاڑی بیلوں) کے جانے کے لائق سڑک تبھی بنے گی جب سڑک سدھارنے والے آ جائیں گے۔ مزدور نے ان کا کام ہلکا کر دیا ہے۔ وہ

Scanned with CamScanner

ابھی وہیں ہے۔"

ہم فوراً روانہ ہوئے۔ لگ بھگ ایک میل دور ہم اُس جگہ پر پہنچے جہاں چٹان کھسکنے سے قریب دس بارہ گز سڑک ٹوٹ گئی تھی۔ سیدھے نیچے بوکھلائی ہوئی گوری بہہ رہی تھی۔ اُس ٹوٹے ہوئے حصے میں تازہ کٹی ہوئی لکڑیاں، شاخیں اور ہرے پتے بچھے ہوئے تھے۔ خطرناک سیدھے ڈھلان — گوری تک جاتے ہوئے ڈھلان — کے ایک ابھرے حصے پر پیر جمائے، مزدور نے گز ڈیڑھ گز تک میری ٹانگوں کو اپنے مضبوط ہاتھ کا سہارا دیا۔ سوچا ہوگا کہ کہیں پیر لکڑیوں کے بیچ نہ پھنس جائے، پتوں کے پردے کی وجہ سے۔ پھر اس نے اسی طرح میری بیوی کو بھی سہارا دیا تھا۔ اس لمس نے سیدھے آتما کو چھولیا تھا... ہم دوسروں کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ممنونیت کیوں محسوس نہیں کرتے؟

... وہ ٹوٹا ہوا حصہ پار کیا تو گوپال نے کہا، "ہم سے پہلے ہلکارا (ڈاکیہ) جا چکا ہے۔" پھر سڑک کے اوپر دیکھتے ہوئے اس نے کہا، "وہ ان پکھانوں (چٹانوں) سے گیا تھا۔ مزدور نے چٹان پر چڑھ کر اسے بھی ہاتھ کا سہارا دیا تھا۔"

ڈاکیہ ہم سے آگے چلا گیا تھا لیکن دل بہت پیچھے چلا گیا... خیمے کے اندر بستر میں پو پھٹنے سے پہلے آنکھ کھل جانے پر کبھی کبھی ایک آواز سنائی دیتی تھی: "کھڑم کھڑم کھڑم... کھِن کھِن کھِن..." ماں نے کہا، "ڈرنا مت، یہ ہلکارا جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں برچھی (بھالا) ہے جس کے پھل کے پاس گھنگھرو بندھے ہیں۔ گھنگھرو کی آواز سن کر بھوت پریت پاس نہیں آتے، سانپ کیڑے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ کہیں بھالو یا گھل جائے تو ہلکارا برچھی سے اپنی حفاظت کر سکتا ہے، ہاتھ کا سہارا تو وہ ہے ہی... اس کی زندگی ایسی ہی ہے..." میں نے ایک بار دن میں بھی ہلکارے کا بھالا اور اس کے پھل کے پاس بندھے بڑے بڑے گھنگھرو دیکھے تھے... اب ہلکارے کے ہاتھ میں بھالا دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کا سفر جاری ہے۔

ہر مصیبت میں اس کا سفر جاری ہے۔

❁❁

پاکستانی اردو کتابیں

شناسائیاں رسوائیاں (یادیں)
کشور ناہید
قیمت: 300روپے

یہ خانۂ آب وگل (شاعری)
(رومی کے منتخب کلام کا اردو ترجمہ)
فہمیدہ ریاض
قیمت: 200روپے

اردو کے ضرب المثل اشعار
محمد شمس الحق
قیمت: 300روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں (ناول)
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: 600روپے

العاصفہ (ناول)
حسن منظر
قیمت: 180روپے

دلّی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے
شائستہ سہروردی اکرام اللہ
قیمت: 195روپے

زندگی کی یادیں
(ریاست رامپور کا نوابی دور)
جہاں آرا حبیب اللہ
قیمت: 300روپے

اردو افسانے کے فروغ میں
ساقی کا کردار (تحقیق وتنقید)
ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز
قیمت: 350روپے

دلّی جو ایک شہر تھا
ملا واحدی
قیمت: 295روپے

تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا
(تاریخ وسیاست)
محمد اصغر خان
قیمت: 300روپے

Scanned with CamScanner

PAKISTANI ENGLISH BOOKS

The Distance of a Shout
(Poetry)
Kishwar Naheed
Rs.295

Four Walls and a Black Veil
(Poetry)
Fahmida Riaz
Rs.275

The New Crusades
Constructing the Muslim Enemy
Emran Qureshi & Michael A. Sells
Rs.495

Fires in an Autumn Garden
Short Stories from Urdu and Regional Languages of Pakistan
Ed. Asif Farrukhi
Rs.60

Culture and Identity
Selected English Writings of Faiz
Ed. Sheema Majeed
Rs.395

Alfarabi: The Political Writings
(Philosophy)
Charles E. Butterworth
Rs.495

Military Inc.
Inside Pakistan's Military Economy
Ayesha Siddiqa
Rs.595

Written in the Season of Fear
(Poetry)
Iftikhar Arif
Rs.395

Jihad, Hindutva and the Taliban
South Asia at the Crossroads
Iftikhar Malik
Rs.495

An Indian Passage to Europe
The Travels of Fath Nawaz Jang
Ed. Omar Khalidi
Rs.450

The Light
English translation of 'Roshnai"
Sajjad Zaheer
Tr. Amina Azfar
Rs.495

We've Learnt Nothing from History
Pakistan: Politics and Military Power
M. Asghar Khan
Rs.45C

Scanned with CamScanner

اس شمارے کے آئندہ صفحات میں تین کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں جن کا تعلق بالترتیب ماریشس، ملائیشیا اور فلپائن سے ہے۔

ابھیمنیو انت (Abhimanyu Anat) جزیرۂ ماریشس کے ان ہندوستانی نژاد لوگوں میں سے ہیں جن کے اجداد کو انیسویں صدی میں جبری مزدوروں کے طور پر بھرتی کر کے ماریشس لے جایا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کہانی ہندی زبان میں لکھی گئی ہے۔ ماریشس میں بسنے والے ہندوستانی نژاد باشندوں کے بارے میں اردو میں غالباً صرف ایک کتاب موجود ہے، جو رضا علی عابدی نے جہازی بھائی کے عنوان سے لکھی۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیرے پر بولی جانے والی عام زبان میں فرانسیسی اور مشرقی اتر پردیش کی بھوجپوری بولی کے عناصر موجود ہیں۔ زیرِ نظر کہانی میں اس لسانی آمیزے کا کسی قدر حصہ پڑھنے والے تک پہنچانے کی غرض سے کچھ فرانسیسی فقرے شامل کیے گئے ہیں، لیکن اس طرح کہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

لی کوک لیانگ (Lee Kok Liang) ملائیشیا کی چینی نژاد برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی کہانی ''جس وقت لوگ سیر کو نکل جاتے ہیں'' یوں تو ایک ایسے موضوع کو پیش کرتی ہے جس پر ہزارہا انداز سے لکھا جاتا رہا ہے، لیکن زوالِ عمر کے تجربے کو اس کہانی میں ایک بالکل اچھوتے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس زاویے کو نبھانے کے لیے فن پر نہایت ماہرانہ دسترس ضروری تھی، اور کہانی پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ اسے اسی مہارت اور فنی ضبط کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔

بین وینیڈو سانتوس (Ben Wenido Santos) کی کہانی ''آنکھوں دیکھی'' جنگ کے پامال تجربے کو ایک انوکھے طریقے سے سامنے لاتی ہے۔ اس کا ایک پہلو کسی دشمن ملک کے سپاہی کے طور پر دشمنوں کے درمیان مرنے کا ہولناک تجربہ ہے اور دوسرا پہلو ایک دشمن سپاہی کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھ کر اس اندوہ کو محسوس کرنا ہے جو جنگ دونوں جانب کے متحارب فریقوں پر سفاکی کے ساتھ عائد کرتی ہے۔

ماریشس کی کہانی کا ترجمہ شکیل احمد بھوجن نے کیا ہے جو میرپور خاص سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے اس ترجمے کے ذریعے آج میں پہلی بار شامل ہو رہے ہیں۔ ملائیشیا اور فلپائن کی کہانیاں تجربہ کار اور مشاق مترجم عطا صدیقی نے اردو میں منتقل کی ہیں۔ عطا صدیقی کے کیے ہوئے ترجمے آج کے مختلف شماروں میں پہلے بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ تینوں اصل مصنفوں کی سوانحی تفصیلات فراہم نہیں کی جا سکیں۔

Scanned with CamScanner

ابھیمنیو انت

ہندی سے ترجمہ: شکیل احمد بھوج

ماتم پرسی

اُس سڑتے ہوئے بھات کی بو اور اس میں آگئے کھٹے پن کی پروا کیے بغیر ماریو نے اسے چٹ کر ڈالا لیا۔ بھوک میں تو وہ خالی بھات بھی ہضم کر جاتا تھا۔ دو دنوں کے باسی اور سڑتے ہوئے بھات کے ساتھ تو بوملی کا جھول بھی تھا، بھلا وہ اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ ایک بار داؤ دمیاں کی بیوی باسی بریانی کتے کے سامنے پھینکنے والی تھی کہ ماریو اپنے چھوٹے بھائی آندرے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے جھٹ آگے بڑھ کر داؤ دمیاں کی بیوی کے ہاتھ سے اس تھالی کو تھام لیا تھا۔ اور جب داؤ دمیاں کی بیوی نے کہا تھا کہ بریانی باسی ہے اور رات کی شدید گرمی کی وجہ سے اس میں کھٹاس آگئی ہے، تب بھی ماریو نے اس بریانی کو کتے کے سامنے پھینکنے نہیں دیا تھا۔ کتا کوں کوں کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔ ماریو جب آندرے کے ساتھ بریانی کھانے بیٹھ گیا تھا تو داؤ دمیاں اندر سے آتے ہوئے بولا تھا، "ارے یہ خراب ہوگئی ہے۔ اسے کھانے سے پیٹ بگڑ سکتا ہے، بیمار ہو سکتے ہو۔"

اس پر ماریو جھٹ بول پڑا تھا، "میں تو چاچا، کنکر کھا کر بھی ہضم کر سکتا ہوں۔ میرے پیٹ کو تم اتنا کمزور مت سمجھو۔"

آج کا باسی بھات تو خود اس کی ماں نے ہی اسے پروسا تھا۔ بوملی کی بو اس خراب ہوگئے بھات کی بو سے زیادہ تیز تھی۔ اس لالچ کے سبب لس لس ہو آئے اس بھات کے دانے دانے تک کو حٹ کر جانے سے ماریو نہیں چوکا۔ کھا لینے کے بعد اس نے گلاس بھر پانی پیا لیکن منھ سے کھٹاس نہیں

گئی۔ بار بار منھ کے اندر زبان کو پھیرتا رہا، پھر بھی منھ اندر سے بگڑا ہی رہا۔ اسے اپنی جیب میں پڑی چیونگم یاد آگئی۔ کچھ ہی دیر پہلے وہ داؤد میاں کے لیے دکان سے سگریٹ خرید کر لایا تھا۔ جو چونی بچی تھی، داؤد میاں نے اسے دے دی تھی۔ اسی سے ماریو نے چیونگم خرید لی تھی۔ چیونگم اس نے چیونگم کے شوق کے باعث نہیں خریدی تھی بلکہ اس کے ساتھ جو فلمی اداکاروں کی تصویریں ملتی تھیں، ان کے لالچ میں اسے خریدا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اسی لمحے اسے منھ میں ڈال کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب جب اس نے اپنے منھ کے ذائقے کو بگڑا ہوا پایا تو اسے جیب سے نکال کر منھ میں رکھ لیا تھا۔

ماریو کے چار بھائیوں میں آندرے ہی سب سے چھوٹا تھا۔ کچھ دیر بعد ماریو کو چیونگم چباتے دیکھ کر وہ اس سے اسے پانے کے لیے ضد کر بیٹھا۔ جب وہ ٹھنکنے لگا تو ماریو نے ربڑ جیسی ہوآئی چیونگم کو اپنے منھ سے نکال کر آندرے کو تھما دیا۔ اس پھیکے ٹکڑے کو اپنے منھ میں ڈال کر آندرے خوش ہوگیا۔ اسے چباتا رہا۔ ایک سرے کو دانتوں سے دبائے دوسرے کو انگلیوں سے پکڑ کر اسے کھینچتا، پھر سمیٹتا رہا۔ اور ماریو خبروں کا استقبال کرنے والے گیت کو سن کر ریڈیو کے پاس جا بیٹھا۔

ماریو کی عمر تیرہ سال تھی اور وہ اپنے بعد کے سیموں اور اس کے بعد کے چاروں بھائیوں سے بڑا تھا۔ اس میں اور آندرے میں گیارہ سال کا فرق تھا، جبکہ اپنی بہن سے وہ بمشکل سال بھر ہی بڑا تھا۔ اس کی ماں کی آج صبح پھر اپنے شوہر سے تکرار ہوئی تھی۔ گھر میں ساتوں دن تکرار ایک ہی بات کو لے کر ہوتی تھی۔ آج بھی سوزان نے اپنے شوہر کو وہی گالی دی تھی، ''نامرد ہو! مرد ہوتے تو اپنی بیوی اور چھ بچوں کے روٹی کپڑے کا بندوبست کیے بنا نہیں رہتے۔''

پہلی بار جب سوزان نے فلپ کو نامرد کہا تھا تو فلپ نے جواب میں کہا تھا، ''نامرد ہوتا تو تم سے چھ بچے نہیں جنواتا۔''

اُس دن کی لڑائی بہت لمبی تھی۔ ماریو ڈرتا رہ گیا تھا کہ کہیں اس کا باپ جو دھمکی اس کی ماں کو دیے جا رہا تھا اسے سچ مچ نہ کر بیٹھے۔ وہ بولا تھا کہ اگر وہ چپ نہیں ہوگی تو وہ اسے گنڈاسے سے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ وقت کے ساتھ ماریو سمجھ سکا تھا کہ اس کے باپ کی وہ دھمکی جواب دہی کی عدم موجودگی میں محض ایک دلیل ہوتی تھی۔ خود کو مرد بتانے اور بیوی کو ڈرانے کی کوشش تھی وہ۔

لیکن سوزان اس سے کبھی نہیں ڈری تھی۔ ایک بار تو وہ رسوئی سے چھری اٹھا کر اپنے شوہر کے

Scanned with CamScanner

سامنے پہنچ کر بولی تھی، ''لو دکھا دو اپنی مردانگی۔ کر دو ٹکڑے ٹکڑے مجھے۔''

ماریو کی سمجھ میں یہ بات دیر سے آئی تھی کہ اس کا باپ کام چور تھا۔ کبھی اچھی رو میں ہونے پر وہ کسی بیکری میں روٹی پکانے چلا جاتا تھا، کبھی شہر کی مجلس قانون ساز کے قریبی کار پارک میں کسی کی کار دھو آتا، تو آدھے سے زیادہ کی کمائی کی شراب پی آتا تھا۔ بس اِدھر کچھ مہینوں سے اس نے اپنا نیا دھندا شروع کیا تھا، جو وہ ماریو کو ساتھ لیے ہفتے میں دو تین بار کر آتا تھا۔ لیکن اس دھندے سے کبھی کچھ مل جانے کی امید ہوتی تھی تو کچھ گنوا بیٹھنے کی بھی۔

آج بھی جب دوپہر کو وہ گھر سے نکلنے لگا تھا تو ماریو سے یہ کہنا نہیں بھولا تھا، ''پاہلیے ایکوت راجو! دیکھنا شام کو ریڈیو سے خبریں سننا مت بھول جانا۔''

یہ ہدایت ماریو کو ادھر کچھ مہینوں سے ہفتوں میں ساتوں دن ملتی رہتی تھی۔ وہ ساتوں دن مقامی ریڈیو سے خبروں کے بعد کی تعزیتی خبریں سنتا رہتا تھا۔ شہر کے دس بارہ میل کے اندر کے گاؤں میں ہونے والی ہر موت کی خبر کو وہ دھیان سے سنتا۔

''...اب لیجیے کچھ تعزیتی خبریں سنیے—''

''...معلوم ہو کہ پینتالیس سال عمر کی شریمتی رادھیکا رام بھجن کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی ارتھی کل دوپہر ڈھائی بجے ان کے بیٹے کے گھر لال ماٹی، کالی ماٹی کے پاس کے گھر سے نکل کر علاقے کی شمشان بھومی کو جائے گی...''

ماریو ان اطلاعات کو دھیان سے سنتا اور ان کے پتے اپنی پانچویں جماعت کی پڑھائی کی بنیاد پر کسی طرح لکھ لیا کرتا تھا۔ اس کا باپ کوئی چھ بجے کے قریب جب اِدھر اُدھر سے ایک ڈیڑھ گڑ کی چڑھا کر لوٹتا تو پہنچتے ہی ماریو سے پوچھتا، ''کوت نو آلے زور جی؟''

اور دونوں کو کہاں کے لیے نکلنا ہوتا، یہ اپنے باپ کو بتانے کے لیے ماریو کاغذ کے اس ٹکڑے سے ان پتوں کو پڑھنا شروع کر دیتا۔ پھر تو جو مقام سب سے نزدیک ہوتا، وہیں دونوں کا جانا طے ہو جاتا۔ سوزان نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں کے لیے بغیر دودھ کی چائے بنا کر بوتل میں بھر دیتی۔ پڑوس کی دکان سے ادھار میں دو روٹیاں منگا کر ان میں دن کی بچی کچھی جو ترکاری ہوتی، بھر کر ٹوکری میں ڈال دیتی اور ان دونوں کے گھر سے نکلنے سے پہلے پچھلے دنوں کے قرض کا حوالہ دینے لگ جاتی۔

Scanned with CamScanner

ماریو عیسیٰ مسیح کی پرانی تصویر کو اتارتا اور پہلو میں موجود تختے پر سے سامان اٹھا کر اسے بھی ٹوکری کے حوالے کر دیتا۔ بنڈل میں پہلا تو وہ گتا ہوتا تھا جس پر ایک سے دس تک اعداد لکھے ہوئے تھے، جن پر شرط لگانے والے عدد پسند کر کے روپیہ رکھ دیتے تھے۔ ایک پرانا چینی کپ تھا، جس میں گوٹیاں یا کوڑیاں رکھ کر فلپ مداری کی ڈگڈگی کی طرح بجاتا ہوا، اس وقت تک یہ رٹ لگائے رہتا، جب تک کہ پانچ چھ داؤ لگانے والوں کے پیسے گتے پر نہیں آ جاتے۔

''میت این پوگائیں دوب۔ تانت لا سانس! میت این پوگائیں دوب۔''

اور لوگ ایک کے دو پانے کے لیے سچ مچ اپنا نصیب آزمانے لگ جاتے۔

بنڈل میں بجلی کا تار اور بلب بھی ہوتا تھا۔ وہاں پہنچ کر بس ایک میز کی ضرورت رہ جاتی تھی انھیں۔ پھر تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ کے تار اور بلب کے ذریعے اپنی میز تک روشنی کھینچ ہی لاتے تھے۔ ماریو جب تک سامان اکٹھا کرتا، فلپ داؤد میاں کے گھر دوڑ جاتا، اس سے پندرہ بیس ادھار لینے، دوسرے دن بیس پچیس لوٹانے کا وعدہ کر آتا۔ فلپ داؤد میاں کا تقریباً سات برسوں سے کرائے دار تھا۔ گھٹا بڑھا اسی سے لیا کرتا تھا۔ داؤد میاں نہ تو کبھی دینے میں رکا اور نہ کبھی لینے میں۔ ایک دو زیادہ لے لینے پر وہ بولتا بھی تو تھا: ''تمھی لوگوں کے لیے لینا پڑتا ہے۔ آگے کے دنوں کے لیے۔''

داؤد میاں ہی نے شروع شروع میں ایک بار یہ پوچھ بھی لیا تھا: ''یہ کیا دھندا شروع کر رکھا ہے تم نے؟ لوگوں کے گھر میت پڑی ہوتی ہے اور تم موت کے اس سوگوار موقعے پر لوگوں سے جوا کھلواتے ہو؟''

''ہم تو موت والے گھر میں دکھی لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں، غم خواری کرتے ہیں۔''

''ماتم پرسی کے موقع پر جوا کھیل کر؟''

''رات جاگ کر اور لوگوں سے جگوا کر! لوگ تو بس ایک دو گھنٹے ٹھہرتے ہیں اور چہرے دکھا کر چلے جاتے ہیں۔ صبح تک تو وہ لوگ ٹھہرتے ہیں جو ہمارے اردگرد شرط لگانے میں مست رہتے ہیں۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ لاش کے اردگرد بیٹھے رشتے دار خراٹے لینے لگ جاتے ہیں۔ بس ہم لوگ ہوتے ہیں اور ہمارے ساتھ اپنی قسمت آزمانے والے جو سورج کے طلوع ہونے تک جاگے رہتے ہیں۔''

ماریو بھی اپنے دوستوں کی پوچھ گچھ کرنے پر یہی کہتا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ گاؤں کے رشتے دار کے یہاں رت جگا کرنے گیا ہوا تھا۔ ادھر سے لوٹنے پر باپ بیٹے کی جیبوں میں کبھی پچاس سے سو روپے تک ہوتے اور کبھی گھر لوٹنے کے لیے بس کا کرایہ تک نہیں ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر فلپ سوزان سے کہتا، ''لاوی لامیم کومسا۔ زندگی ہی تو ایسی ہے۔ کبھی جیت کبھی ہار۔ جو ایک بار ہارتا ہے وہی تو دس بار جیت سکتا ہے۔ اور جو دس بار جیت سکتا ہے، کیا وہ ایک بار ہار بھی نہیں سکتا؟''

اس سوال کا سوزان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اور جب اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تو وہ گالیاں دیتی رہ جاتی۔ فلپ انھیں سنتا رہ جاتا، اپنے اوپر بغیر کسی اثر کو محسوس کیے ہوے۔

چھ بجنے سے کچھ منٹ پہلے ہی فلپ گھر لوٹا۔ نشے میں بالکل نہیں تھا۔ چانگ کائی کی دکان سے اسے ادھار میں انگوری شراب ملنے سے رہی۔ ایک دو گھڑی کے لیے جن دوستوں کے آسرے پر رہا کرتا تھا، وہ بھی نہیں ملے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ماریو کو پکارا۔ وہ سامنے آ گیا۔ فلپ نے سگریٹ کے ٹکڑے کو دیکھا۔ ایک اور کش کا امکان پا کر اس نے پھر اسی احتیاط کے ساتھ اسے ہونٹوں تک پہنچایا۔ اس بار آنکھوں کو بند کر کے اس نے کش لیا۔ انگلیاں تھوڑی سی جلیں۔ ہونٹوں کو بھی ہلکی جلن کا احساس ہوا۔ جب ٹکڑے کو فرش پر گرایا تو وہ اتنا چھوٹا تھا کہ پاؤں اٹھا کر بھی اسے رگڑ کر بجھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

لکڑی کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے ہی ماریو سے پوچھا، ''کہاں جانا ہے آج؟''

''کہیں نہیں۔''

اس نے چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ پہلی بار اسے اس طرح کا جواب ملا تھا۔

''کیوں، آج کوئی مرا نہیں کیا؟''

ماریو کے جواب سے پہلے ہی وہ سوچ بیٹھا— آخر ایسا کیسے ہو سکتا تھا! دیس میں کبھی کوئی نہ مرا ہو، ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ تبھی ماریو نے جیب سے کاغذ کے میلے ٹکڑے کو باہر نکال کر اسے دیکھنا شروع کیا، پھر بولا، ''مرنے کو تو کچھ لوگ مرے ہیں۔''

''تو پھر؟''

''ہمارے علاقے میں کوئی نہیں ہے اس فہرست میں۔''

Scanned with CamScanner

''جگہ بتاؤ۔''

''گراں سابل، کاترسیر، ریویئر دے جانگی۔''

''تین ہی ہوے۔''

''ان تینوں جگہوں میں دو دو موتیں ہوئی ہیں۔''

''دھت تیرے کی۔ آخر ایک موت کو اِدھر ہو جانے میں کیا حرج تھا!''

کرسی پر بیٹھنے کے بجائے کمرے میں چہل قدمی کر کے اس نے پھر سے پوچھا، ''ان تینوں میں سب سے کم دور کون سا ہے؟''

''سبھی دور ہیں۔''

''کسی ایک کو تو سب سے کم دوری پر ہونا ہی چاہیے۔''

''لگتا ہے کاترسیر کچھ کم دوری پر ہے۔''

''لیکن اُدھر تو سات کے بعد بس ملنے میں مشکل ہوگی۔ ایسا کریں کہ ہم ریویئر دے جانگی چلتے ہیں۔''

''اتنی دور؟''

''نہیں جائیں گے تو تمھاری ماں کو کل بھی کھانا نہ پکانے کا بہانہ مل جائے گا۔''

''اس وقت تو داؤد میاں بھی گھر پر نہیں ہے۔''

اس کی بیوی تو ہے۔ اسی سے پیسے لے لیں گے۔''

وہ بھی اس کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔''

ان باہر ہی سے بڑبڑاتی ہوئی اندر آ گئی۔ ایسے موقع پر ماریو دھیرے سے کھسک جانے کا وہ تو کھسک گیا۔ فلپ کے سامنے کرسی پر چپ بیٹھ جانے کے علاوہ دوسرا چارہ نہیں تھا، ایسی حال میں جو کہ اس کے گھر میں ہر دوسرے تیسرے دن پیدا ہوتی ہی رہتی تھی۔ فلپ کے اپنے سب سے آسان ترکیب ہوتی تھی بہرا بنے چپ بیٹھے رہنے کی۔ ایسا کر کے وہ بہروں کی قسمت کو سنا تھا۔ ایک بار اس نے اپنے گھر کے مالک داؤد میاں سے کہا بھی تھا کہ اللہ میاں کو چاہیے تھا کہ وہ ہر کو بہرا بناتا اور ایسا وہ نہیں کر سکا تو کم سے کم بیویوں کو تو گونگا بنا سکتا تھا۔

سوزان تب تک چپ نہیں ہوئی جب تک کہ اس نے وہ سارا کچھ نہیں کہہ دیا جو اسے کہنا چاہیے تھا۔ دھیرے دھیرے خود ہی نرم پڑتی گئی اور کمرے سے باہر ہونے سے پہلے بول گئی، ''جورجی اینا ترا وائی پورتو اداں بولاں نے۔ بیکری کے مالک نے آدمی بھیجا تھا۔ آج رات اس کے پاس کام کرنے والے کم ہیں۔ بولا ہے فوراً آجانے کو۔ بیٹھے رہو گے یا جاؤ گے بھی؟''

بغیر کچھ کہے فلپ کرسی چھوڑ کر اٹھا اور بوجھل قدموں سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر نکل جانے پر اس نے سوزان کی آواز پیچھے سے سنی، ''آپرے پافیراین مانیئر تو بوا روتی۔ اور دیکھنا صبح پی کر مت آنا۔ مجھے پورا پیسہ چاہیے۔ نہیں تو اس گھر میں چولھا نہیں جلے گا۔''

بیکری دوسری گلی میں تھی۔ اسے جس گلی میں سے ہو کر اس پار جانا تھا، اس گلی میں مادہ سؤر اپنے چار بچوں کے ساتھ سڑی گلی چیزوں کو کھا رہی تھی۔ انھیں ہٹانے میں فلپ کو دقت ہوئی۔ دو چھوٹے سؤروں کو پھلانگ کر ہی وہ اُس پار جا سکا۔ صبح بھی اسے سؤروں کو پھلانگ کر ہی ادھر آنا پڑا تھا۔ دھندے پر نہ جا سکنے کا جو پچھتاوا اسے ہوا تھا، وہ سؤروں کو دیکھ کر مٹ گیا۔ اسے یاد آگیا— تین ہفتے پہلے جب صبح صبح اس نے سؤروں کو تیرا کر نالے کو پار کیا تھا، اُس رات دھندے میں اس کے پاس کرائے کے پیسے تک نہیں بچے تھے۔

فلپ آٹا گوندھنے اور روٹی کے پیڑے بنانے میں ماہر تھا۔ بیکری کے مالک نے بہت چاہا تھا کہ فلپ اس کے یہاں مستقل طور پر کام کرے، لیکن فلپ کو پابند زندگی پسند نہیں تھی۔ یہی تو کہا تھا اس نے بیکری والے کو، لیکن گھر پر اپنی بیوی سے یہی کہتا رہا تھا کہ مالک کو اس کا کام پسند نہیں آتا، اس لیے اسے پابندی سے کام نہیں دیتا ہے۔ مالک کی جانب سے یہ سخت ہدایت تھی کہ کام کے دوران کوئی بھی شراب نہ پیے۔ شراب کے نشے میں کام میں صرف سست روی ہی نہیں آجاتی تھی، ساتھ ہی روٹی کی پکائی اور وزن دونوں میں گڑبڑ ہو جاتی تھی جس کے باعث مالک کو دو موقعوں پر بھاری جرمانہ بھگتنا پڑا تھا۔ اس ہدایت کے باوجود بھی مالک کی غیر موجودگی میں بیکری کے اندر شراب پہنچ ہی جاتی تھی۔ مارسیل نے چار گڑ کی منگوائی تھی جس میں سے اس نے آدھی فلپ کو دے دی۔ شراب کو حلق کے نیچے اتار کر دونوں نے منھ میں چائے کی سوکھی پتیاں رکھ لیں تاکہ شراب کی بو جاتی رہے۔

صبح پانچ ہی بجے فلپ کا کام پورا ہو گیا۔ مالک کے بیٹے نے اس کے ہاتھ میں تیس روپے رکھ

دیے۔ فلپ نے اپنے حصے کی چھ روٹیاں اٹھائیں اور گھر پہنچ گیا۔ رات بھر جاگ کر کام کرنے کی وجہ سے اس نے صبح اور دوپہر سو کر گزار دی۔ جب اٹھا تو بھوک اتنی تیز تھی کہ بغیر ہاتھ منھ دھوئے وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ سوزان نے ڈبے کی مچھلی پکائی تھی۔ چاول تھے۔ چیٹھے کے سالن کا شوربہ تھا۔ اس نے ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد گھر سے باہر نکلنے سے پہلے ماریو سے اس نے کہہ دیا تھا کہ آج شام ریڈیو پر موت کی اطلاع سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری شام ہی کو ماریو ریڈیو کے سامنے کاغذ قلم لے کر بیٹھا۔ خبریں ہندی میں پڑھی گئیں۔ ماریو داؤد میاں کے یہاں ٹیلی وژن پر ہر سنیچر کی شام ہندی فلم دیکھنے کا عادی تھا۔ سنیچر کو اسے ریڈیو سننا نہیں ہوتا تھا کیونکہ سنیچر کی رات دھندے کی رات نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باپ کی جانب سے ایسا ہی طے تھا۔ ہندی فلموں کی وجہ سے ماریو کو ہندی کا زیادہ علم تو نہیں ہو پایا تھا، لیکن اس سے موت کی اطلاع کے دوران بہت سارے الفاظ کو وہ آسانی سے سمجھ لیتا تھا اور پھر اطلاع بھی تو انھی گھسے پٹے لفظوں میں دی جاتی تھی:

...معلوم ہو کہ... جنازہ یا ارتھی...

اور جہاں تک وقت کا سوال تھا، اسے انگریزی میں دہرا دیا جاتا تھا۔ ماریو نے اطلاع سنی۔ جو لکھنا تھا لکھ لیا۔ فلپ آدھی بوتل جو کی شراب کے معمولی نشے میں گھر پہنچا۔ پہنچتے ہی پوچھا، ''کوت نو اپنا پو آلے آزور جی؟'' ماریو نے اس کے سامنے خبروں سے حاصل کردہ چار واقعات رکھ دیے۔ ان میں سب سے قریب ترین غمی پھونجی ساک کی تھی، جہاں پر اسی سال کی ایک خاتون کی موت ہوئی تھی۔ جگہ بتائی گئی تھی روشنی سینما کے پیچھے۔ ماریو سامان اکٹھا کرنے لگا اور فلپ جھٹ پٹ گیا داؤد میاں کے گھر۔ داؤد میاں نے اس کے ہاتھ میں پچیس روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا، ''ابھی پچھلی بار کا بھی باقی ہے۔''

''صبح لے لینا وہ اور یہ، دونوں۔''

''دس اور دس، بیس ہوں گے۔''

''دھندا اچھا رہا تو بیس کیا، تیس دے دیں گے۔''

''ہاں ہاں، بہت دیکھے میں تمھارے وہ تیس۔''

ٹھیک ساڑھے چھ بجے ماریو اپنے باپ کے ساتھ شمالی حصے کے بس ٹرمنل پہنچا۔ جب دونوں

کے سوار ہوتے ہی بس چل پڑی تو فلپ اسے اپنی اچھی قسمت سمجھ کر دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔ ٹھیک سات‌ بجے ان کی بس پھونجی ساک کے روشنی سنیما کے سامنے رکی۔ باپ بیٹے دونوں ساتھ ساتھ اترے۔ جگہ ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ اس گاؤں میں باپ بیٹے پہلے بھی چار بار غمی میں آ چکے تھے۔ ماریو کو تو وہ پچھلا موقع بہت اچھی طرح یاد تھا، کیونکہ رات بھر کے کھیل کے بعد صبح ماریو کو پتا چل گیا تھا کہ قسمت نے ساتھ دیا تھا اور اپنے ساتھ لائے بیس روپے کے علاوہ اس کی ٹوکری میں سو روپے کے قریب کی رقم تھی۔ وہ وقت اسے اس لیے یاد تھا کیونکہ اس نے پہلی بار دھندے کے پیسے سے دس روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے — چپکے سے۔ اس کے باپ کو اس بات کا پتا نہیں چلا تھا۔ دوسرے دن اس پیسے سے ماریو نے 'چائینیز راں دے وُو' میں نوڈلز کھائے تھے اور شمی کپور کی فلم دیکھی تھی۔ اس کے بعد تو چار پانچ روپے کی ہیرا پھیری وہ ہر موقعے پر کر لیتا تھا، لیکن دس روپے کی رقم وہ ٹوکری کے زیادہ بھاری ہونے پر ہی جیب میں رکھتا تھا۔

اپنے باپ کے ساتھ جب وہ غمی کی جگہ پر پہنچا تو گاؤں کی سبھا کے لوگ بانس اور لکڑی کے بل پنڈال کھڑا کر چکے تھے۔ بنچ اور کرسیاں رکھی جا رہی تھیں۔ ماریو ہمیشہ کی طرح اس کام میں ہاتھ بٹانے لگ گیا اور اس کا باپ گاؤں کے ان بوڑھوں کے درمیان جا بیٹھا جو کھیتی باڑی کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ ساری باتیں صحیح صحیح سمجھ پانا اس کے لیے مشکل تھا، پھر بھی اتنا وہ سمجھ ہی گیا کہ لوگ بینگن اور ٹماٹر کے پودوں میں لگ آئے نئے کیڑوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ فلپ گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ بھوجپوری کے کچھ الفاظ بول بھی لیتا تھا۔ گھر کے اندر سے عورتوں کی جوئسُر کے ساتھ گا گا کر رونے کی آواز آ رہی تھی اس کا تو فلپ عادی ہو چکا تھا، اس لیے اس طرف اس کا دھیان اٹک نہیں پایا۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد اس نے اپنے دھندے کی تین افراد کی ایک دوسری ٹولی کو بھی وہاں آتے دیکھا۔ وہ لوگ بھی شہر ہی کے تھے، لیکن کال لاسکر علاقے کے تھے۔ تینوں افراد اسی کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک سے فلپ نے سگریٹ مانگا۔ اس آدمی نے اپنے دوست سے مانگ کر فلپ کو دیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد آخری بس سے ایک تیسری ٹولی بھی آ پہنچی۔ فلپ ان تاش کے پتوں کے کھیل رچانے والی ٹولی کو اچھی طرح جانتا تھا، خاص طور پر اس کے سربراہ کو۔ یہ دھندا تو فلپ نے اسی سے سیکھا تھا اور اسی سے مکے کھا کر اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے دو دانت تڑوائے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان

دشمنی کبھی نہیں پیدا ہوئی۔ فلپ اسے اپنی ہی حاضر دماغی مانتا تھا، ورنہ آج زورو کے سامنے وہ اپنا یہی دھندا کر ہی نہ پاتا۔ زورو نے ایک بار جس کی چوپڑ الٹ دی تھی، اس کی دوبارہ اس کے سامنے آنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی۔

فلپ اور ماریو باری باری پنڈال سے باہر راستے میں جا کر اپنی اپنی روٹیاں کھا آئے۔ آٹھ بجے کے قریب تینوں ٹولیاں پاس پڑوس کے نوجوانوں سے بات کر کے اپنی اپنی میز ڈھونڈنے میں لگ گئیں۔ ماریو اپنے لیے جگہ پہلے ہی ڈھونڈ بیٹھا تھا۔ میز پہنچنے سے پہلے وہ بجلی کے تار کو پنڈال کے بجلی کنکشن سے جوڑ کر اس جگہ تک لے آیا۔ اپنی ٹوکری سے چالیس واٹ کا بلب نکال کر کنیکٹ کر لیا۔ لوگ اِدھر اُدھر جمع ہونے لگے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد ہی فلپ اپنے لیے ایک چھوٹی سی میز کا انتظام کر پایا۔ چاروں طرف سے چار بنچیں رکھ لیں۔ دوسرے ہی منٹ کے بعد لوگ میز کے اردگرد جمع ہونے لگے۔ فلپ ان چہروں کا چھپی نظروں معائنہ کرتا رہا۔ اچھے کھلاڑیوں کی اسے پہچان تھی۔ وہ یہ بھی تاڑ جانے میں کافی حد تک کامیاب ہو جاتا تھا کہ ان میں کون صبح تک کھیلنے والے تھے اور کس کی جیب میں کتنے روپے تھے۔ جس پہلے شخص کی قمیص کی اوپری جیب میں اس نے سگریٹ کے دو پیکٹ دیکھے، اسے تو ہر حالت میں صبح تک کا کھلاڑی اس نے مان ہی لیا۔ کچھ ہی دیر بعد پنڈال میں سو تک لوگ آ گئے تھے اور آدھے سے زیادہ ان تینوں میزوں کو گھیرے ہوئے بیٹھے اور کھڑے تھے، جن پر داؤ لگائے جا رہے تھے۔ باقی لوگ الگ الگ باتوں میں لگے رہے۔ کچھ نوجوانوں نے آواز دینی شروع کی، ''کو مانسے دو کو مانسے!''

''کھیل شروع ہو جائے۔''

فلپ نے گتے کو میز پر بچھا دیا۔ ماریو نے سفر کے دوران بس کنڈکٹر سے پچیس روپے بھنا کر ان کے سکے لے لیے تھے۔ ریزگاری سے بھری ٹوکری کو وہ اپنے ہاتھ میں لیے رہا۔ فلپ نے اپنے ہاتھ میں موجود چینی کے کپ میں گوٹیاں رکھیں اور ڈگڈگی کی طرح ہلانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ آواز بھی دیتا رہا، ''میت این یوگا ئیں دوب۔ تانت لا سانس۔''

ماریو نے اس بولی کو دہرایا، ''ایک روپے کے دو روپے۔ چار کے آٹھ...''

وہ پہلا کھلاڑی تھا جس نے گتے کے ساتویں عدد پر دو روپے رکھے۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا اور

Scanned with CamScanner

جب سات آدمیوں نے کل بیس روپے گتے کے الگ الگ اعداد پر رکھ دیے تو فلپ نے کپ کو زور زور سے ہلا کر کہا، ''آلا نو فیر جو لے۔''

کپ کو انڈیلا۔ گوٹیاں میز پر بکھریں راس پانچ نمبر پر نو روپے رکھنے والے تین آدمی خوشی سے چہک اٹھے۔ ماریو نے گتے کے اوپر کے ۲۰ روپیوں کو بٹور کر پانچ نمبر پر اٹھارہ روپے رکھ دیے اور باقی دو کو اپنی ٹوکری میں۔ کھیل جاری رہا۔

گھر کے اندر سے سفید قمیص اور دھوتی پہنے ایک ادھیڑ آدمی سامنے آگیا۔ اس نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر کے درخواست گذار الفاظ میں کہا، ''دیکھیے میں آپ سبھی لوگوں سے درخواست کر رہا ہوں۔ ہمارے گھر کے اندر میری ماں کی لاش رکھی ہے۔ ہم لوگ اس کی آتما کی شانتی کے لیے وید منتروں کا پاٹھ کر رہے ہیں۔ میرے پتا جی کا یہ حکم ہے کہ ہمارے گھر اس سوگوار موقعے پر جوا نہ کھیلا جائے۔ آپ لوگ اسے برا نہ مانیں، اسے فوراً بند کر دیں۔''

اس آدمی کے چپ ہوتے ہی کچھ لوگوں نے اس کی تائید کی۔ کئی آوازیں آئیں ''ہاں ہاں، اسے آپ لوگ بند کر دیں۔''

کئی دوسرے لوگ کانا پھوسی کر اٹھے، بد بدا اٹھے، ''یہ کیا بات ہوئی بھائی؟''

''ہمارے کھیلنے سے مرے ہوے کا کیا بگڑتا ہے؟''

''سالے یہ ان آریہ سماجیوں کا ڈھکوسلا ہے۔''

اس آدمی نے دوبارہ درخواست کی۔

''مہربانی کر کے آپ لوگ اسے بند کر دیں۔ یہاں کوئی کھیل نہیں ہوگا۔ آپ لوگ ہمارے دکھ میں حصہ لینے آئے ہیں۔ حصہ لیں۔ یہ سارے کھیل بند کر دیں۔''

اس دوسری بار کے تقاضے پر لوگ میزوں سے ہٹنے لگے۔ شور اچانک سناٹے میں بدل گیا۔ گھر کے مالک کے اس مطالبے کو کچھ لوگوں نے سراہا، کچھ اس فیصلے کو غلط بتاتے رہے۔ اندر سے وید منتروں کی آواز آتی رہی۔

اچانک ہی ایک ہلکی بارش کے باعث ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ کچھ لوگ خود میں سمٹ کر بیٹھے رہے، کچھ لوگ اٹھتے گئے۔ دس بجتے بجتے پنڈال میں صرف بیس پچیس لوگ رہ گئے۔ دھندے کرنے والی

تین ٹولیاں آئی تھیں، ان میں سے ایک یہ کہہ کر ایک شخص کے ساتھ چل پڑی کہ وہ لوگ اپنے خاندان والوں کے یہاں رات کاٹنے جا رہے ہیں۔ بارش کی وجہ سے پنڈال جگہ جگہ سے رسنے لگا تھا۔ فلپ اور ماریو اس جگہ پر چلے گئے جہاں زورو اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دیوار کے سہارے لیٹا ہوا تھا۔ زورو نے فلپ سے کہا، ''آج تو برے پھنس گئے۔ شہر کی سواری تو صبح چھ بجے سے پہلے ملنے والی نہیں۔'' فلپ بھی دیوار کے سہارے سو گیا، اپنا رونا رو کر۔

''پہلے داؤ میں دو روپے بنے تھے لیکن ساتویں داؤ تک صرف پونجی کے تین روپے بچ پائے ہیں۔ کرائے کو بھی کم پڑے گا۔''

ماریو اپنی ٹوکری کو کندھے پر لٹکا کر بنچ پر سیدھا بیٹھا رہا۔ ٹھنڈ سے بچنے کے لیے وہ اپنی دونوں بانہوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑے رہا۔ اندر سے آنے والے وید منتروں کا پاٹھ دھیما پڑ کر بند ہو چلا تھا۔ کوئی دو بجے کے قریب اسے جھپکیاں آنی شروع ہوئیں، لیکن وہ سونا نہیں چاہ رہا تھا۔ جاگا رہا۔ سناٹا قائم رہا۔

پو پھٹے تک ٹھنڈ بڑھتی گئی۔ کوئی گھنٹے بھر کی ہلکی نیند کے بعد فلپ جاگ کر سیدھا بیٹھ گیا۔ باہر رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا مٹنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے دھند لکا بھی مٹتا گیا اور سورج کے طلوع ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ گھر کا مالک جو کہ رات سفید کپڑوں میں پنڈال کے اندر آ کر لوگوں کو جوا کھیلنے سے روک کر گیا تھا، نیند بھری آنکھوں کے ساتھ سامنے آ گیا۔ اس نے دیکھا، پنڈال میں صرف پانچ آدمی بنچوں پر بیٹھے رت جگا کر رہے تھے — پانچ آدمی، جو گاؤں کے نہیں، شہر کے تھے۔

❊❊

لی کوک لیانگ

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

جس وقت لوگ سیر کو نکل جاتے ہیں

کنگ منگ نے بائیں کلائی اٹھا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اس کے پاس ابھی کچھ وقت تھا۔

جوں ہی اس کی کار سائے سے نکلی، دھوپ اس پر جھپٹ پڑی اور بونیٹ کی کالی سطح سے روشنی کی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں بکھر اٹھیں۔ پیش بندی میں اس نے پہلے ہی سے اپنی آنکھیں سکیڑ لی تھیں۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھامے تھامے، اس نے دوسرے ہاتھ سے رومال نکالا اور پھرتی سے اپنی گدی پونچھی۔ پسینہ اس کے چہرے کے اطراف اور گردن پر بہنے لگا تھا۔ رومال کو کار کے فرش پر ڈال کر اس نے سیٹ پر سے چشمہ اٹھایا اور اپنی آنکھوں پر جما لیا۔ سڑک اب اپنے ہلکے نشیب و فراز سمیت بتدریج چڑھائی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ جب وہ بڑے موڑ پر پہنچا تو اس نے اپنی گھڑی ٹیلے پر بنائے گئے اس نئے گھنٹہ گھر سے ملائی جو بلوریں آسمان میں پیوست ہوتا نظر آتا تھا۔

دور سڑک کے سرے پر اسے اپنے بنگلے کی سیاہ ڈھلوان چھت، چائے کی دبیز باڑھ کے پرلی طرف گرداڑنے کے سبب کسی قدیم جہاز کے ڈھانچے کی طرح جھکولے کھاتی دکھائی دی۔ اس کا بنگلہ پہاڑیوں میں ایک بلند مقام پر واقع تھا۔

جیسے ہی چھت پر نظر پڑی اسے اپنی کنپٹیوں پر خفیف سی پھڑکن محسوس ہوئی۔ اس کی ڈھلی عمر کا لہو۔ یہ پھڑکن بڑھ کر شدت اختیار کر گئی۔ کنگ منگ نے پیٹھ اکڑا لی اور تن کر بیٹھ گیا۔ جوں جوں وہ

Scanned with CamScanner

بڑی سی چھت اپنی جسامت اور میلے پن کو نمایاں کرتی گئی وہ بھی بے ارادہ اپنے گھٹنے اکڑاتا رہا۔ یہ چھت سخت ڈھلوان تھی اور بارش نے اس پر بالکل پسینے کے نشان کی طرح کے دھبے ڈال دیے تھے۔ اس کا چہرہ ٹھنڈا ہوگیا اور تھرتھری اس کی ریڑھ کی ڈیچی سے چھوٹی چھوٹی لہروں کی شکل میں نکل کر پھیل گئی۔ جیسے ہی درد کی لہر اس کی دائیں کنپٹی تک پہنچ کر ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح لگی، اس نے سانس روک لی۔ دو دن قبل بھی اس نے یونہی لاچاری سے اس چھت کو دیکھا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا وہ یوں جنبش کرتی معلوم دی جیسے کسی نہ نظر آنے والی موج پر بپھرتی چلی آتی ہو اور خوف دلاتی ہو کہ اونچی باڑ کے اوپر سے خود کو اٹھا پھینکے گی۔ کسی نہ کسی طرح اتنی قوت اس میں آگئی کہ اس نے اپنی کار کو پشتے سے ٹکرا جانے سے پہلے ہی روک لیا۔

مگر اس بار وہ لرزشیں اس کے شانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی جاتی رہیں۔ اس کی سانس ایک طویل آہ کی صورت نکلی اور اس نے اپنی کار سڑک پار کر کے بھاری چوبی پھاٹک کے سامنے رسان سے لا روکی۔

اترنے سے پہلے اس نے اس دورے کے گزر جانے کا انتظار کیا۔ پھر اس نے پھاٹک کھولا اور کار کو آہستگی سے پختہ راستے کی ہلکی سی چڑھائی پر چڑھا لے گیا۔ اس نے انجن بند کیا تو تکان اور گرمی کے اثر کو تیزی سے خود پر غالب آتے محسوس کیا۔ اس نے اپنی پیشانی کو بازوؤں پر ٹکا دیا اور بغل کی بساند کے بھبکے سونگھتا رہا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے نظر آیا کہ اس کے ہاتھ کتنے کھردرے اور سانولے ہو چکے تھے۔ جہاں جہاں اس نے کبھی کھجالیا ہوگا، وہاں وہاں جلد پر ننھے ننھے سے سفید نشان پڑ گئے تھے۔ مساموں کے سروں پر چھوٹے چھوٹے سیدھے روئیں ابھرے ہوئے تھے اور ایک گہری کاسنی ورید اس کی لٹکتی کھال پر نمایاں تھی۔ وہ چل کر پھاٹک تک گیا اور پٹوں کو بہت احتیاط سے بند کیا اور نیچے والی لوہے کی چٹخنی کو دبانے کے لیے پیر استعمال کیا۔ جب وہ ان ڈھبریوں کو غور سے دیکھنے کے لیے جھکا جن سے تختے جوڑے گئے تھے تو دھوپ نے اس کی گدی کو جھلسا دیا۔ تب وہ سیدھا ہوا اور اپنے اس بنگلے کی طرف قدم بڑھائے جو اس نے اُس وقت بنوایا تھا جب وہ اپنی نوجوان شریک حیات کے ساتھ پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ وہ اس سرزمین پر بسنے کے لیے جاوا سے آئے تھے۔ اس نے پہاڑی کی ڈھلان کا یہ قطعہ اس وجہ سے منتخب کیا تھا کہ یہ سستا بھی تھا اور شہر کے ساحلی

علاقوں سے زیادہ ٹھنڈا بھی۔ یہ بنگلہ اس نے کئی بیٹوں کو دھیان میں رکھ کر بنوایا تھا۔ ایک بڑا وسیع بنگلہ، رین ٹری کے مانند مضبوط۔

بنگلے کے سامنے والے حصے نے زمین کی چوڑائی کا تقریباً تین چوتھائی حصہ گھیر رکھا تھا۔ نچلی اور بالائی منزل میں چار چار دریچے تھے۔ بنگلے کی ڈیوڑھی ایک چوبی پیش دہلیز تھی۔ بالائی منزل استعمال نہیں ہوتی تھی، اس کے زینوں کو اس نے تختے جڑوا کر بند کروا دیا تھا۔ پچھلے دنوں جب اس نے بجلی کی وائرنگ دوبارہ کروائی تھی تو کاریگروں کو اوپر جانے نہیں دیا تھا۔ بعض اوقات راتوں کو بالائی منزل پر بلیوں کی بھد بھد اس کو سنائی دیتی۔ کنکریٹ کی پختہ روش، اونچی باڑھ، آزو بازو اور پشت پر جست کے تاروں کا جنگلہ اور بھاری پھاٹک تازہ اضافے تھے۔

جب وہ ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو قریبی کھڑکی کا گلابی چھینٹ والا پردہ یوں ہلا جیسے ہوا نے اسے ہلا دیا ہو۔ قدم روک کر اس نے آنکھیں سکیڑیں تو اس کو پردے کے پیچھے کسی کی جھلک محسوس ہوئی۔ اس نے پورچ کی ٹھنڈک میں سنبھل کر قدم رکھا اور پھر دہلیز پر بیٹھ کر اپنے جوتے کھولنے لگا۔ ہُو کا عالم تھا۔

''کون؟ تم ہو کیا؟'' وہ اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے پکارا۔

کوئی جواب نہ آیا۔

اس نے پھر پوچھا، ''کون ہے؟'' پھر اس نے نئی ملازمہ آہ نوئی کا ہیولہ ہال کے اندھیرے میں چلتا ہوا پہچانا۔

''تم اکیلی ہو کیا؟'' اس نے اپنی آواز جھلاہٹ سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔

لڑکی نے اقرار میں اپنی منڈی زور سے ہلائی اور منھ پھیر لیا۔ وہ جو اپنی بالی عمر میں تھی اور دھوپ سے سنولائی ہوئی بھی تھی، اپنے کندھے لٹکائے کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے بشرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ اس نے کس کے پردے کو تھام لیا اور اپنے بدن میں دوڑتی کپکپی کو روکنے کی کوشش کی۔

''کیا ابھی کھڑکی میں سے تم جھانک رہی تھیں؟'' اس نے اپنی درشتی پر تاسف کرتے ہوئے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔ یوں پردے کو لمبے بے تکے ہاتھ سے تھامے وہ اپنے بسنتی جوڑے میں بہت

Scanned with CamScanner

الجھ رہی لگ رہی تھی۔ جوں ہی لڑکی نے اپنے قدم بدلے، پردے میں سے روشنی در آئی اور اس کے نوخیز سینے کو چھونے لگی — اس نے فوراً ہی اپنی نظر ہٹالی۔ اس کی پوروں کے سروں پر سنسناہٹ کچھ اس طرح ہونے لگی جیسے اس نے دن کی پہلی سگریٹ پی ہو۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کو جنبش دی اور جیب میں کھسے قلم کا کلپ درست کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ خود کو سخت گیر ظاہر کرتے ہوئے اس نے درشتی سے کہا، ''تم جا سکتی ہو، اور آئندہ جھانکنا مت۔'' وہ ہال پار کر کے گیا اور پنکھے کا بٹن کھول دیا۔

مگر وہ اس پر نظریں جمائے اسی جگہ کھڑی رہی۔ اس کے دہانے کے کنارے ایسے کپکپائے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ دھوپ سرک کر اب اس کی گردن پر آگئی تھی اور اس کے کان کے نیچے واقع اس مسّے کو تپا رہی تھی جو سیاہ نہیں تھا بلکہ منے سے تازہ زخم کی طرح سرخ تھا۔ وہ ہچکچائی اور پھر اس نے ایک دم پردہ چھوڑا اور سر جھکائے جھکائے چل دی۔ ہال کے پرلے سرے پر سبز دروازے کے پاس سے جب وہ گزری تو اس کے قدم تیز ہو گئے اور پھر وہ بنگلے کے پچھواڑے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ کنگ منگ کی نظروں نے ہال میں اس کی چال کا تعاقب کیا اور پھر اس کی نگاہیں پلٹ کر سبز دروازے پر ٹک گئیں۔ وہ بند تھا۔

جب وہ چلی گئی تو یہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنا بایاں ہاتھ اس نے گود میں اس طرح رکھ لیا کہ وہ گھڑی پر نظر رکھ سکے۔ پنکھے کی ہوا نے اس کو ٹھنڈک پہنچائی۔ کچھ دیر بعد اس نے قمیص اتاری اور دبے پاؤں چلتا اپنے کمرے میں گھس گیا جو کہ پچھواڑے کی طرف جانے والی راہداری کے دوسرے سرے پر تھا۔ اس نے اپنی وارڈ روب کھولی اور اپنے کپڑوں کو چھوا، ان کے کرارے پن کو محسوس کیا۔ قمیص اٹھا کر اس نے اپنی ناک سے لگائی اور پاک صاف سُوت کی مہک کو سونگھا۔ اس لڑکی نے کتنی عمدگی سے اس کے کپڑے استری کیے تھے۔ کتنے افسوس کی بات تھی کہ اس کا اپنا لباس ہمیشہ میلا اور جسامت سے ایک سائز بڑا نظر آتا تھا۔ اس نے سوچا کہ آیا وہ اس کو کچھ نئے جوڑے خرید دے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس کی نظر اس پر پڑی تھی تو پہلی نظر میں وہ کتنی سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی، مگر اس کے اس خوفزدہ بشرے میں بھی کوئی بات ایسی تھی جو اس کو دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ اگر وہ کلی ہوتی تو وہ اس کو پروان چڑھاتا اور اس کے کھل اٹھنے کا انتظار کرتا، اور جو کہیں وہ اس کی اپنی بیٹی ہو سکتی تو وہ کتنا فخر محسوس کرتا۔ لیکن جب بھی اس سے لباس کے بارے میں پوچھنے کا اسے خیال آتا ایک احساسِ گناہ اس

کے حواس پر غالب آ جاتا اور وہ ایک لفظ بھی نہ بول پاتا، گو اس کا ارادہ ہمیشہ اس پر شفقت کرنے کا ہی ہوتا۔

کرسی کھڑکی کے قریب گھسیٹ کر اور کھڑکی کے شیشے پر سر ٹکا کر بیٹھا وہ اپنے کمرے میں سے باورچی خانے میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک سگریٹ وہ پھونک چکا تھا اور دوسری جلانے والا تھا کہ اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ وہ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں گیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ ریفریجریٹر میں سے اس نے ٹھنڈا پانی لے کر ایک جگ میں انڈیلا اور سبز دروازے تک لے کر آیا۔ آہستہ سے اس نے چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازے سے کان لگائے کھڑا رہا۔ چھوٹی سوئی چھ پر تھی۔ اس نے توقف کیا، یہاں تک کہ بڑی سوئی لرزتی ہوئی بارہ پر آ گئی۔ پھر اس نے دروازے کو چابی لگائی اور دھیمے سے دروازہ تھوڑا کھول دیا۔

اس کمرے کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے کونے میں لگے ایک بستر پر نظر ڈالی۔ وہاں کوئی جنبش نہیں تھی۔ پنجوں کے بل کمرہ پار کر کے اس نے آہستہ آہستہ جھلملی کی ڈوری کھینچی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ وہ تن کر سیدھا ہوا، چل کر پلنگ تک آیا اور اس کی پٹی پر کولھا ٹکا کر بیٹھ گیا اور اپنی بیوی کو تکنے لگا۔

وہ چت پڑی تھی اور باقاعدگی سے سانس لے رہی تھی۔ جونہی اس کے وزن سے پلنگ دبا وہ کسمسائی اور اپنے ٹخنے ایک دوسرے پر رکھ لیے۔ ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ چھوٹا سا دکھائی دیتا تھا، سُتا ہوا، جھریوں سے بھرا جنھوں نے اس کے رخساروں پر چھوٹے چھوٹے سفید کھرونچوں کی سیون سی بنا دی تھی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح بند نہیں تھیں، ان کی ہلالی درزوں میں سے وہ اس کے ڈھیلوں کو حرکت کرنے اور اس کے سوجے ہوئے بیضوی پپوٹوں کو پھڑکاتے دیکھ سکتا تھا۔ بال اس کے سفید تھے، بس اطراف میں کہیں کہیں سیاہ پٹیاں سی تھیں۔ اس کی تازہ جھریوں کو یوں بیٹھ کر تلاش کرنا کچھ عجیب سا عمل تھا۔

کولھے کے پٹھے دُکھنے لگے تو اس کو پہلو بدلنا پڑا۔ اس ہل جل نے اس کی بیوی کو بے چین کر دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، پتلیوں کو نچایا اور ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ کروٹ لے لی اور خود ایک گولے کی طرح گڑی مڑی ہو گئی۔ اس کے سارونگ نے اوپر کی طرف کھسک کر اس کی ٹانگوں کو ننگا

کر دیا جو لیموں کی طرح زرد اور کسی نہ کسی حد تک اب بھی کسی کسائی دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں ان پر پھیریں تا کہ اُن بیتے ہوئے ابتدائی ایام کو یاد کر سکے۔ یقیناً اس کے ناخنوں نے ان پر خراشیں ڈال دی ہوں گی کیونکہ اس نے پیر زور سے جھٹکے اور اپنا ہاتھ منہ پر رکھ کر ہانپنے لگی۔ پہلی نظر میں وہ اس کو پہچان نہ سکی تھی اور وحشت زدہ سی گھورے جا رہی تھی۔

''کیا میں نے تم کو پریشان کر دیا؟'' وہ اس پر جھکا اور اس کا ہاتھ منہ پر سے ہٹایا، ''آئی ایم سوری۔'' اس کی بیوی نے اسے دیکھنے کے لیے خود کو اٹھالیا۔ ''نہیں نہیں، اٹھو مت، سو جاؤ، میں ہوں یہاں پر،'' وہ پھڑ کتے ہونٹوں سے مسکرایا۔

جماہی لیتے ہوئے اور پیر پھیلاتے ہوئے وہ تکیے پر گرگئی۔ بستر پر پسر جانے کے بعد وہ سیدھی چھت کو تکنے لگی اور نچلے ہونٹ کو اندر دبا کر زور سے چبانے لگی۔ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ بڑھایا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کو چھوتا، اس نے اپنا ہونٹ چھوڑ دیا جو اچک کر بہت گلابی سا ہو کر باہر نکل آیا۔ خود کو اپنی کہنیوں کے بل اٹھا کر اس کی بیوی نے اس کے چہرے کو دوبارہ غور سے دیکھا اور ایک ہاتھ سے اس کا ڈھیلا گریبان پکڑ لیا۔ وہ تنی ہوئی مسکراہٹ لیے دم سادھے بیٹھا رہا۔

''پانی، پانی، مجھے پانی چاہیے،'' اس کی آواز میں شناسائی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

''اچھا، اچھا، تم لیٹ جاؤ، میں تمھارے لیے پانی لاتا ہوں۔'' ٹھوڑی سے اٹھتی ہوئی لرزش کو دباتے ہوئے اس نے نرمی سے اپنی قمیص اس کے ہاتھ سے چھڑائی اور مسکراہٹ اپنے چہرے پر جمالی۔ اس کا ہاتھ لگتے ہی اس کی بیوی نے اپنا منھ گھمالیا۔ رخسار کی ہڈی باہر کو ابھر آئی جس نے اس کی گردن کی شکنوں کو سپاٹ کر کے غائب کر دیا۔

دروازہ کھلا چھوڑ کر جب وہ جگ اور پلاسٹک کا پیالہ لے کر لوٹا تو اس کو اسی حالت میں پایا۔ یہ طے کرتے ہوئے کہ وہ اب اس کو ہاتھ نہیں لگائے گا، اس نے بیوی کو دبی آواز سے پکارا، ''دیکھو میں پانی لے آیا۔ لو پی لو۔''

دونوں ہاتھوں سے پیالہ تھام کر اور اپنی ناک کے بانسے سے اس کی لگر ملا کر وہ آہستہ آہستہ پانی پینے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کا دم رکنے لگا اور پانی اس کے رخساروں پر بہنے لگا۔ وہ پیالے کو پچکانے لگی۔ اپنے فیصلے کو فراموش کرتے ہوئے اس نے پیالہ اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہا۔ جیسے ہی اس

Scanned with CamScanner

نے اسے ہاتھ لگایا وہ زور سے چیخی اور اپنا سر جھٹکا۔ پانی چھلک گیا اور اس کے بلاؤز پر سامنے گیلی دھاریاں بن گئیں۔ فوراً ہی اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور کھڑا ہو گیا اور اپنی دکھاوٹی مسکراہٹ لیے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی مٹھیاں کس کر اپنی رانوں کے اطراف گاڑ لیں۔ کافی دیر تک وہ اپنی سانس روکے رہا۔ اس بار اس کی چیخ بھلا کتنی دور تک گئی ہوگی؟ کتنی دور؟ دیکھتے دیکھتے پورے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ ملازمہ اب کہاں دبکی بیٹھی ہوگی بھلا؟ تلخی کی ایک لہر نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ اس کی کنپٹیاں لپکنے لگیں۔ کیا اس نے کافی خمیازہ نہیں بھگت لیا تھا؟ ایک ایسی بات کے لیے جو وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ ہو۔ اس کے جسم میں ٹھنڈے غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر ہمیشہ کی طرح خود کو اس کے سامنے یوں کھڑے دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کیا۔ اور جیسے ہی وہ ذرا پرسکون ہوا، ایک نئے طرز کی کوفت اور حقارت اس کے حلق میں مثل کڑواہٹ کے باقی رہ گئی۔ اس نے اس عجیب ذائقے کو محسوس کیا اور پھر اسی راضی برضا والی کیفیت نے اس کے جسم پر طاری ہو کر اس کی ہڈیوں کو کچھ اور نرم اور عضلات کو کچھ اور کمزور کر دیا۔ سب کچھ اتنا مایوس کن اور بے کیف لگ رہا تھا، دونوں کی عمر تھوڑی سی باقی رہ گئی تھی۔ جو وہ یہاں تک جھیل لے جا سکتا تھا تو اب چند روز اور مزید کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اس کو اپنی بیوی کی خبر گیری تو کرنا ہی تھی کہ اس کے سوا اب اس کا تھا بھی کون۔

اس کے ہاتھ سے پیالہ چھین لینا ایک غلطی تھی۔ ہاں اس کی غلطی ہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں کھولیں تو اس کے کندھے لٹک گئے۔ اب وہ اس کو ٹھیک طرح دیکھ سکتا تھا۔ حیرت سی حیرت! اس کا چہرہ کتنا ستا گیا تھا، بس ہڈیاں ہی نکلی رہ گئی تھیں۔ ایک سہ پہر کو جب وہ دفتر لنچ بریک کے بعد معمول سے ذرا پہلے پہنچ گیا تھا تو چھوٹے اسٹور روم کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے کان میں یہ بات پڑی تھی کہ عورت جب بوڑھاتی ہے تو کون سا حصہ پہلے مرجھاتا ہے۔ ایک جملہ اس کے ذہن میں اٹک گیا تھا: ''میری خالہ بولتی ہیں... '' ایک تیکھی سی آواز سنائی دی تھی جو ہنسی ضبط کرتے ہوئے تھوڑے توقف کے بعد بولی تھی '' کہ جب عورت بوڑھی ہونے لگتی ہے تو مکھڑے سے چل کر نیچے کو سوکھنا شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم تو نیچے کی طرف بہت بعد میں بڑھتے ہیں نا۔'' اور ہنسی کے فوارے کھلکھلاہٹ سمیت ابل پڑے تھے اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

اس کی بیوی تکیے پر سر ٹکائے یوں چپ چاپ پڑی تھی جیسے اس چیخ نے اسے نڈھال کر دیا ہو۔

Scanned with CamScanner

وہ اپنی لٹوں کو اپنی چھنگلیا کے گرد لپیٹنے لگی، دھیرے دھیرے اور سنبھل سنبھل کر، اور ساتھ ہی وہ جھرجھری آواز میں گنگنانے لگی۔ کمرے میں دھوپ نے جگہ بدل لی تھی اور روشنی کا ایک بڑا سا قطعہ اس کے بلاؤز پر بلی کی طرح لیٹا اس کی جھریوں بھری خشک گردن کو چاٹ رہا تھا۔ گزشتہ پانچ برسوں میں وہ دیکھتے دیکھتے کتنی بوڑھی ہوگئی تھی۔ کیا یہ کسی اندرونی ناسور کے زیر اثر خون بہہ جانے کے سبب ہوا تھا کہ جس نے اس کے گوشت کی ساری نمی چوس لی تھی؟ سنگاپور یونیورسٹی کے طب کے استاد نے اس کا معائنہ کیا تھا اور وہ اس میں کوئی جسمانی آزار دریافت نہ کرسکا تھا۔ بیوی کے بارے میں اس نے پروفیسر سے اس وقت بات کی تھی جب وہ سامنے کوچ پر مصنوعی نیند کے غلبے میں بے حس پڑی تھی۔ اور واپسی کے سفر میں وہ اپنی سیٹ پر اس وقت تک غافل بیٹھی رہی تھی جب تک کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کا ایک غول جشن آزادی کی خوشیوں سے سرشار، غل مچاتا، ڈبے میں داخل نہ ہوا تھا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اپنے چہرے کے بائیں حصے پر یوں ہاتھ مارنے لگی جیسے اس پر مکھیاں آبیٹھی ہوں۔ بہرحال وہ خود اس موج اڑاتے غول کو دیکھ کر برانگیختہ ہوگیا تھا، خاص طور پر ان نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر جو اپنی اونچی اونچی اسکرٹس میں بہت اطمینان اور یقین سے راہداری میں چل رہی تھیں اور ان کے پسینے میں نہائے چہرے اس گرم دوپہر میں بہت چونچال لگ رہے تھے۔ جب وہ اس کے لیے پانی لینے باہر گیا تھا تو اسے نوجوان لڑکیوں کے اس ہجوم میں اپنا راستہ بنانے کے لیے دھکا پیل کرنا پڑی تھی اور جب اس کی رانوں نے ان کے پٹھوں سے رگڑ کھائی تو اس کی ناک میں ان کی جوان مہک پہنچی تھی اور اس کے رگ وپے میں خون تیزی سے دوڑنے لگا تھا جس نے اسے بے دم کردیا تھا۔ واپسی پر اس کی بیوی نے غالباً اس کی جولانی کو بھانپ لیا تھا کیونکہ وہ اکڑ کر بیٹھ گئی تھی اور اس نے پیٹھ پھیر کر پانی لینے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے رومال احتیاط سے نکالا تھا اور بیوی سے چھپا کر ایک گولہ سا بنا کر اپنی مٹھی میں دبا لیا تھا اور اس کے چیخنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ جس کے بجائے اس نے اپنے بال کھول ڈالے اور لٹیں اپنی انگلیوں میں لپیٹ کر انھیں اپنے منھ کے سامنے مثل پروں کے پھیلا لیا تھا۔ جب وہ لڑکیاں ادھر سے گزریں تو یہ منظر دیکھ کر کھلکھلائی تھیں اور اس کو بہت غصہ آیا تھا۔

ان کو بستر پر لیٹے لیٹے، بالوں سے کھیلتے اور انگلیوں کو بار بار حرکت دیتے دیکھ کر وہ بڑی تھکن محسوس کرنے لگا۔ اس کی ڈھڈی دکھنے لگی اور درد مٹانے کے لیے اس نے اپنی ریڑھ دہری کرلی۔

Scanned with CamScanner

کاش کہ وہ چند ساعت سر ٹکا کر جھپکی لے سکتا۔ بن سوچے رہ سکتا۔ مرد سب سے پہلے کہاں سے سکڑتا ہے؟

اس خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے وہ بولا، ''آؤ، باہر باغیچے میں چلیں۔ الامینڈر کھلے ہوئے ہیں، چلو۔'' اس کو کمرے سے لازماً نکالنا چاہیے۔ ان لڑکیوں کے تصور نے کنگ منگ کو گڑبڑا دیا تھا۔

لیکن وہ سنی اَن سنی کر رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں اور کمبل کے ایک کونے کو بار بار مروڑے جا رہی تھی جیسے اس سے چھوٹی چھوٹی گیندیں بنا رہی ہو۔

''آؤ چلو،'' اس نے منت کی، ''الامینڈر سچ مچ اتنے پیارے سے اجلے اجلے، پیلے پیلے ہیں،'' اس نے لمبی سانس کھینچی۔ کمرہ جوان جسموں کی مہک سے پٹا معلوم ہوا۔ ایک خطاکار کی طرح اس نے چونک کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اب بھی اپنا کمبل مروڑے جا رہی تھی۔

'ارے بھئی چلو نا،'' اس نے اپنی قوت برداشت پر تعجب کیا۔ بیوی نے کمبل چھوڑ دیا اور اس کا ہاتھ بالوں کی طرف اٹھ گیا۔

''چلوگی نا؟'' اس کی آواز میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ خوابیدہ نفرتوں کے اس مستقل نقاب کے باعث وہ کتنی مسخ ہو چکی تھی۔ ایک درگزر نہ کرنے والا انتقامی کینہ اس پر مسلط تھا اور کسی بھی لمحے اس کے خدوخال بگڑ سکتے تھے۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور جتنا جتنا اس نے سوچا اتنا ہی اس کا جوش بڑھتا گیا۔ اب اس کو کمرے سے باہر لے جانا لازم ہو گیا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی بھی کافی وقت تھا۔ لیکن پہلے اس کو پرسکون کرنا ضروری تھا۔ اس کی وحشت کو دور کرنا تھا۔

''اچھا تو بھئی،'' وہ بولا، ''تمھیں اپنے بالوں کی اتنی فکر ہے تو میں تم کو برش لا دیتا ہوں، پھر تم پیاری لگوگی۔'' اس کہنے کا اس عمل سے کوئی تعلق نہیں تھا جو وہ کر رہی تھی۔ بس وہ تجربے سے یہ جان چکا تھا کہ اس کے سامنے کچھ بھی بول دینا اس کی توجہ مبذول کر لیتا تھا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔

جب کہ وہ یہ کہہ رہا تھا اس کی بیوی نے پھرتی سے اپنے ہاتھ میں اپنا منھ چھپا لیا اور ایک پراسرار مسکراہٹ اس کے گالوں پر آنکھوں کے کناروں تک پھیل گئی۔ ایک دبی دبی سی ہنسی پھوٹی اور گزر گئی۔ برسوں پہلے جب وہ اس کو پہلی مرتبہ ایک مشترک پارٹی میں لے گیا تھا تو لوٹتے وقت کسی

Scanned with CamScanner

بیوقوف انگریز نے ملائی زبان میں اس کی ستائش کی تھی اور وہ ایک دم ٹھٹھک کر اور گردن اٹھا کر بھونچکا سی ایسے دیکھنے لگی تھی جیسے کہ اب کیا کرے۔ اُس وقت بھی اس نے اچانک اپنا ہاتھ اٹھا کر رومال سے منھ چھپا لیا تھا اور ہنسنے لگی تھی جس پر کنگ منگ نے شرمندگی محسوس کی تھی۔ ویسا ہی احساس اس پر اس وقت بھی طاری ہوا۔ بس صرف اس کے کنارے چپ چپی نفرت اور حقارت سے سنے ہوئے تھے، پھر بھی اس نے تنی ہوئی مسکراہٹ اپنے چہرے پر برقرار رکھی۔ بیوی نے ہامی میں سر ہلا دیا۔

اس کو وہیں چھوڑ کر وہ کمرے کے دوسرے سرے پر رکھی ڈریسنگ ٹیبل تک گیا، جھکا اور برش کی تلاش میں درازیں کھکھوڑنے لگا۔ آئینہ نکال دیا گیا تھا۔ ایک دن وہ لوٹنے میں ہوٹل پر رک جانے کی وجہ سے گھر دیر سے پہنچا تو اس کو آئینے کے سامنے اس طرح کھڑے پایا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ بے طرح کٹ گیا تھا، خون بہہ رہا تھا اور آئینے کی کرچیاں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ بہلا پھسلا کر اس کو بستر تک واپس لانے میں اسے کافی وقت لگا تھا اور جب ڈاکٹر نے اسے خواب آور دوا دے دی تھی تو وہ کرسی پر بیٹھا رہا تھا اور اس کی تیمارداری کرتا رہا تھا، تب ہی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ لوٹتے ہوئے کبھی ہوٹل پر نہیں رکے گا۔ یہ اس کی ایک اور غلطی تھی۔

''مل گیا'' وہ برش دکھاتے ہوئے جیسے ہی مڑا، اس کی نمائشی مسکراہٹ اس کے چہرے سے جاتی رہی۔ وہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ وہ تیزی سے بستر کی طرف لپکا اور گھٹنوں کے بل جھک کر پلنگ کے نیچے دیکھنے لگا۔ خون اس کے سر کی جانب چڑھ گیا اور وہ بڑی دقت سے کھڑا ہو سکا۔ آنکھیں موند کر سہارے کے لیے اس نے پلنگ کی پٹی پکڑ لی یہاں تک کہ چکر کا اثر جاتا رہا۔ وہ کتنا بیوقوف تھا کہ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

جیسے ہی وہ کھڑا ہوا تو دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا۔ اس نے اپنا سر آہستہ سے باہر نکالا اور خفیف سی بھی حرکت کی سن گن لینے لگا۔ دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ اس شام اتنی جلدی اس کو ہسٹریائی دورہ نہ پڑے۔ وہ اپنی سانس روکے رہا تو تھوک اس کے منھ میں جمع ہو گیا۔ جوں ہی اس کو یقین ہوا کہ اس کی بیوی ہال میں نہیں ہے، وہ کمرے سے باہر آیا اور دروازہ بند کرنے کا خیال رکھا۔ پنجوں کے بل رینگتا وہ باورچی خانے کی طرف ہو لیا۔

جس وقت وہ داخل ہوا، آہ نوئی پھسکڑا مارے ترکاری کاٹنے میں منہمک تھی۔ اس کی طرف اس

Scanned with CamScanner

کی پیٹھ تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا پینڈا کس قدر کس کے اس کے بسنتی پجامے پر دباؤ ڈالے ہوے تھا تو ہلکی سی جھنجھناہٹ اس کی رانوں میں دوڑ گئی۔ شاید اس نے بھی محسوس کر لیا کہ وہ وہاں اکیلی نہیں کیونکہ وہ ایک دم گھبرائی سی آواز نکال کر پلٹی اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تختے پر گر پڑا۔ خود کو تنبیہ کرتے ہوے کہ وہ پرسکون رہے گا، وہ ایسا بن کر باورچی خانے میں ہر طرف نظر دوڑانے لگا جیسے کہ اس نے اسے دیکھا ہی نہیں، اور پھر خاموشی سے واپس پلٹ کر باغیچے کی طرف نکل گیا۔

جب وحشت کے ابتدائی آثار نمودار ہوے تو خوش بختی ہی سمجھیے کہ بنگلے کے تینوں اطراف جست کے تاروں کا اونچا جنگلہ لگوا کر وہ احتیاط اختیار کر چکا تھا۔ سامنے والی باڑھ گھنی تھی اور وہ شمار ہی نہیں رکھ سکا تھا کہ اس کو اس کی خاطر کتنے گاڑی گوبر استعمال کرنا پڑا تھا۔ مگر موجودہ چوبی پھاٹک لگنے سے قبل ایک چھوٹا سا جھولنے والا دروازہ تھا جس میں کنڈی لگی تھی اور جو آسانی سے کھولی جا سکتی تھی۔ ایک شام وہ یہ جھولنے والا دروازہ کھلا چھوڑ کر غائب ہو گئی تھی۔ ڈھونڈنے والے پہاڑی کی ڈھلانوں پر چاروں اطراف پھیل گئے تھے اور کچھ وقت تک اس نے اس بڑے رین ٹری کی طرف اشارہ کرنے سے گریز کیا تھا جس کی ایک موٹی سی ٹیڑھی میڑھی ڈال ایک ضخیم پتھریلی چٹان پر جھکی رہتی تھی۔ مگر جب وہ ان لوگوں کو کہیں نہ ملی تھی تو پھر اس نے ان کو اس پیڑ کا بتایا تھا اور خود تھکن کا بہانہ کر کے ایک گرے ڈالے پر بیٹھ گیا تھا جبکہ وہ سب اپنی ٹارچیں لیے اس طرف بڑھ گئے تھے۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے تھے، اس نے ان کے قدموں کو گنا تھا۔ بڑے نعرے بلند ہوے جب ان لوگوں نے اس کو پتھریلی چٹان پر کھڑے ہاتھ اٹھا کر اس جھکے ہوے ٹیڑھے میڑھے ڈالے کو پکڑنے کی کوشش کرتے دیکھ لیا تھا اور جب وہ لوگ اس کو لے کر اس کے پاس آئے تھے، تب بھی اس نے چیخنا چلانا بند نہیں کیا تھا اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوے وہیں ان لوگوں کے سامنے اس سے لپٹ کر رو پڑا تھا۔ یہ کئی برس پہلے ہوا تھا۔

چوبی پھاٹک اب مٹیالا ہو چکا تھا، اور اس کے جوڑ کی درزوں میں سبز کائی جم چکی تھی۔ ایک نظر میں اس نے دیکھ لیا کہ وہ بند تھا، اس لیے وہ پورچ میں ہی کھڑا رہا۔ باغیچے میں ایک سبز لان تھا جس میں اس نے سب سے بڑھیا گھاس جو وہ خرید سکتا تھا، لگوائی تھی۔ اس میں جگہ جگہ گھنی پتیوں سے ڈھکے، لذیذ پھلوں والے چھوٹے درخت لگے ہوے تھے۔ اجلے اجلے، پیلے الامینڈر اپنی بھوری

Scanned with CamScanner

پھلیوں سمیت پھاٹک کے قریب اگے ہوئے تھے۔ پانچ قسم کے ہبسکس کے پودے اپنے سرخ چکنے پھول اٹھائے لان کے وسط میں لگے تھے۔ اس نے کناروں پر لال اینٹیں چنوائی تھیں۔ الامینڈو کے قریب ہی فرنجی پانی کا ٹیڑھا میڑھا درخت اپنی شاخوں کو اینٹوں کی حد سے بھی آگے پھیلائے وقفے وقفے سے اپنے پھولوں کے پیراشوٹ زمین پر بھیج رہا تھا۔ ہوا میں قدرے خشکی پیدا ہوگئی تھی اور دھوپ اب پیڑوں کی اوپری شاخوں پر پہنچ گئی تھی۔

''نکل آؤ،'' پیڑوں کی طرف مبہم انداز میں ہاتھ اٹھ کر اس نے بلند آواز سے کہا، ''میں نے تم کو دیکھ لیا ہے!'' دم سادھ کر اس نے کن سوئیاں لیں۔ ''تم بے ایمانی کر رہی ہو،'' وہ بولا ''میں نے تم کو دیکھ لیا ہے، اگر تم یہ کروگی تو میں نہیں کھیلوں گا۔'' پھر اس نے اپنا سر رک رک کر بائیں سے دائیں گھمایا اور آسمان کی طرف دیکھا جو غروب آفتاب کے باعث ہلکا بینگنی بلکہ تقریباً بھورا گلابی ہو رہا تھا۔ تھوک گٹکتے ہوئے وہ چلایا، ''نکل آؤ!'' اور پھر اس نے ظاہر کیا کہ جیسے وہ اندر جا رہا ہو۔ اس نے گھڑی پر تیزی سے ایک بے چین نظر ڈالی۔

اس کی آواز کی گونج ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی بیوی کا قہقہہ لان کے سرے پر لگی ہبسکس کی جھاڑیوں کے پیچھے سے گونجا۔ وہ جھاڑیوں کو ہلاتی کھڑی ہوگئی۔ بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ مسکراہٹ سے تھوڑی دیر کے لیے چہرہ شکن آلود ہوا اور پھر وہی بیزاری لوٹ آئی۔ کناروں پر کھلے چھوٹے چھوٹے سرخ پھولوں کو توڑتے ہوئے رکتا رکتا وہ اس کی طرف گیا۔

''شریر کہیں کی، تم پہلے کیوں نہیں نکلیں؟'' اس نے پھول اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیے، جن کو اس نے اونچا اٹھا لیا اور جن کی پنکھڑیوں کو وہ دونوں ہاتھوں سے مسلنے لگی۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں پر لگے سرخ دھبوں کو دیکھا تو پھر سے قہقہہ لگایا۔ اس نے فوراً ہی جیب سے رومال گھسیٹا اور گھبرایا سا اس کے ہاتھ پونچھنے لگا۔ جس وقت وہ یہ کر رہا تھا تو اس نے کنکھیوں سے پورچ کے پاس والی کھڑکی کے پردے کے پیچھے تھوڑی سی حرکت دیکھی۔

''آہ نوئی، آہ نوئی،'' اس نے آواز دی، ''ذرا چٹائی تو نکال لانا۔''

سایہ پردے کے پاس سے ہٹ گیا۔

اور پھر وہ باہر آئی، روشن زرد کوندے کی طرح لپکتی، لپٹی چٹائی بغل میں دبائے اور اپنا سر

جھکائے وہ ان کی طرف آئی۔ ان کے قریب پہنچ کر چٹائی اس نے زمین پر ڈال دی اور چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ اس کی بیوی نے ملازمہ کو گھورا اور بدبداتے ہوئے مٹھیاں بھینچیں۔ لمحے بھر کو اسے اندیشہ ہوا کہ اس کی بیوی اس ملازمہ کو بھی اسی طرح کھدیڑ دے گی جس طرح وہ گزشتہ سال ایک اور ملازمہ کے ساتھ کر چکی تھی، مگر اس مرتبہ اس کی بیوی نے فقط تھوک دیا۔ ''مجھے الھڑ چھوکریوں سے چڑ ہے، بڑی کتی خصلت ہوتی ہیں۔'' وہ پھنکاری، مگر لڑکی ہلی تک نہیں۔ وہ جلدی سے بولا، ''جاؤ، تم جاسکتی ہو۔'' وہ اتنی جلدی کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکی جانے کو مڑی تو اس کی کمر کتنی پتلی دکھائی دی۔

''آؤ یہاں بیٹھیں،'' اس نے چٹائی گھاس پر بچھا دی۔ جاتی ہوئی لڑکی پر سے نظریں ہٹائے بغیر اس کی بیوی چٹائی پر تن کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پھر دور کے خیالوں میں گم ہوگیا۔

اس نے اپنی جیب سے تاش کی وہ گڈی نکالی جو اس کی تلاش کے دوران اس نے میز پر سے اٹھالی تھی۔ گڈی کے دو حصوں کو انگوٹھوں اور انگلیوں میں دبا کر اس نے بار بار پھریری دی۔ یہ کرتے دیکھ کر اس کی بیوی کے چہرے کا انداز بدل گیا۔ اس نے پتوں کو پھینٹا اور اس کے سامنے کھلے پتے ایک قطار میں جمانے لگا۔ وہ اس کے ہاتھوں کی حرکت کو دیکھتی رہی اور جب اس نے ہاتھ روکا تو بغیر کچھ کہے وہ جھکی اور اس نے غلام اٹھالیا۔ اس نے گردن ہلائی اور مسکرایا۔ تین ماہ قبل وہ تاش کے پتے پہچان ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ ترکیب اسے ڈائجسٹ کے ایک مضمون سے سوجھی تھی۔ شہر کا کوئی بھی ڈاکٹر اس کے لیے سوا مسکّن دوائیں تجویز کرنے اور اس کو پرسکون رکھنے کا مشورہ دینے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں تک اس پاگل خانے تن جونگ نائیر اسپتال کا تعلق تھا تو وہ تو ایک قید خانہ تھا یا اس سے بھی بدتر۔ وہ اس کو وہاں تو کبھی نہیں بھیج سکتا، حالانکہ چند ڈاکٹر اس کی تصدیق کرنے کو تیار تھے۔ اس کے کچھ کاروباری دوستوں نے سمجھایا بھی تھا کہ آزادی ملنے کے بعد بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں گی۔ تب سے وہ متعدد بار تن جونگ نائیر تبدیلیاں دیکھنے جا چکا تھا۔ گزشتہ چھ برسوں میں وہ کئی بار وہاں جا چکا تھا مگر ناامیدی کے سوا اسے کچھ نہ ملا تھا۔

پتے پھینٹے اور چابکدستی سے پرندوں کے پروں کی طرح دوبارہ چٹائی پر پھیلا دیے گئے۔ مگر اس بار اس نے ان کو چھوا تک نہیں۔ اس نے سر اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا۔ پڑیاں جیسے خشک

Scanned with CamScanner

بھورے ہونٹوں کو اندر باہر کرتے ہوے اس نے پھو پھو کرنا شروع کر دیا۔ پھولے ہوے غبارے اور پچکے ہوے جوف کی طرح گال پھولنے اور سکڑنے لگے۔ سوکھی ہوئی چام کے نیچے ہڈیاں ابھر آئیں۔ دفتر میں اس لڑکی کا کہا ہوا جملہ اس کے ذہن میں کچوکے لگانے لگا، اور ایک صدمے کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی بیوی کے بارے میں ہی گفتگو کر رہی تھیں۔ یہ بات کان میں پڑنے سے چند روز پہلے وہ ایک جوان عورت کی طرح بنی ٹھنی اس کے دفتر آدھمکی تھی اور جب اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دورے کی حالت میں تھی۔ اس کو ٹھنڈا کرنے کے بعد ہی وہ اس کو اپنے کمرے سے باہر لا یا تھا۔ وہ ایک ایسی بے کیف گرم سہ پہر تھی جب ہر ایک اکھڑا اکھڑا اپنی ڈیسک پر بیٹھا وقت گزر جانے کا منتظر تھا۔ اس کی بغلوں میں پسینہ بہہ رہا تھا۔ جب وہ دفتر میں سے گزر رہے تھے تو اس کی بیوی ہاتھ چھڑا کر ایک لڑکی کی طرف لپکی تھی اور اس کے گال پر تھپڑ جڑ دیا تھا۔ لڑکی نے سسکی بھر کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی مگر اس کی بیوی نے ٹھوکا دے کر اسے دھکیل دیا تھا اور چیخ چیخ کر اس کا سینہ نوچنے لگی تھی، ''بیہودہ! بیہودہ!'' سب لوگ دم بخود دیکھتے رہ گئے تھے۔ چپراسی کی مدد سے وہ اس کو دفتر سے باہر لا یا تھا۔ اس سہ پہر وہ پھر لوٹ کر دفتر نہیں گیا تھا۔

''اچھا، بادشاہ اٹھاؤ،'' اس نے اپنے جذبات قابو میں رکھتے ہوے کہا۔ اس کی بیوی پھونکیں مارتی رہی۔ اس کے گلے میں کچھ پھنسنے لگا اور اس کی آواز بیٹھ سی گئی۔ دفتر میں ہونے والے اس واقعے کی یاد نے اس کی تلخی میں اضافہ کر دیا۔

شاید اس تبدیلی کو اس نے محسوس کر لیا اور یک لخت پھونکنا بند کر دیا۔ اس کے بشرے پر تکان کا اثر نمایاں ہو گیا۔ اس کی آنکھیں گمبھیر ہو کر جھٹپٹے میں چمکنے لگیں۔ اس کا دایاں ہاتھ کانپنا اور وہ بار بار اپنی انگلیاں کھولنے اور بند کرنے لگی۔ وہ بالکل چپ بیٹھی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اب وہ روئے گی یا اس پر چیخے گی۔

''چلو اٹھاؤ،'' اپنی آواز اور بھینچ کر اور اپنی تلخی کا مزہ لیتے ہوے اس نے اصرار کیا۔

اس کے بائیں رخسار کے عضلات جھٹکا لے کر پھڑکے اور جب اس نے گھبرا کر اپنا داہنا ہاتھ پھیلایا تو ساتھ ہی اس کو ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگی۔ اس کو گھورتے جو دیکھا تو اس نے اپنا سر ساکت رکھ کر اس کے آر پار دیکھنے والی ترکیب استعمال کی۔ اس بار اس نے ہتھیار ڈال دیے، اپنا سر جھکا کر اس

Scanned with CamScanner

نے اپنا ہاتھ پتوں کے عین اوپر ٹھہرا لیا۔ اچانک اس سکوت کو پہاڑی کی طرف اڑ کر جاتے ہوئے ایک زرد پرندے کی سریلی آواز نے توڑ دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر اٹھا کر پرندے کی اڑان دیکھنے لگی۔ جب اس نے پرندے کی اڑان کا رخ یہ دیکھا کہ وہ بڑے درختوں کی جانب لپک رہا تھا تو اس کے چہرے پر ہیبت چھانے لگی۔

''یہ دیکھو...'' اس نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا کیونکہ وہ بھی دیکھ چکا تھا کہ پرندے کی منزل کدھر تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا اس نے ہاتھ مار کر تاش چٹائی پر تتر بتر کر دیے اور دونوں مٹھیوں سے گھاس پیٹ پیٹ کر بین کرنے لگی۔

''کوئی بات نہیں، روؤ مت، کوئی بات نہیں!'' اس کی تلخی کافور ہوگئی۔ اس نے اس گھور غم کو محسوس کیا جس نے ان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ اس پر اتنا اچانک ٹوٹا تھا کہ اس نے اسے بالکل پست کر دیا تھا۔ ایک بار تو اس نے بھی حقیقتاً ندامت محسوس کی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کانپتا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ ایک دم پرسکون ہوگئی۔ ''آؤ لیٹ جاؤ، تم کو زیادہ آرام ملے گا۔'' جب تک پہاڑی نظر نہ آئے، اس کا سکون برقرار رہے گا۔

اس نے بغیر کسی مزاحمت کے اُسے لٹانے دیا۔ چٹائی پر پاؤں پھیلا کر اس نے اپنے بازو پیٹ پر رکھ لیے اور آسمان کو تکنے لگی۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا، چھوٹی چھوٹی باتیں جو وہ سننا پسند کرتی تھی، ساتھ ہی ساتھ اپنی آنکھیں بند کر کے انگلیوں سے اس کی پیشانی سہلاتا رہا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ سو چکی تھی۔ اندھیرا اپھیل رہا تھا اور آسمان گہرا اُودا ہو چکا تھا اور اکا دکا بدلیاں تیر رہی تھیں۔ ہوا رک گئی تھی، زمین اپنی گرمی کے نم بھپارے رہ رہ کر چھوڑ رہی تھی۔ سڑک پر کاریں تواتر سے اپنی آوازیں بکھیرتی گزر رہی تھیں۔ جب وہ قریب سے گزرتیں تو ان کے ہیڈ ماپ باڑھ پر روشنی کی چتیاں ڈالتے اور سیاہ پتیوں میں جگنو سے اڑاتے۔ پہاڑی کی ڈھلانیں مدھم ہوتے جھٹپٹے کو جذب کر رہی تھیں۔ جیسے جیسے رات کے سائے پھنگیوں کی جانب بڑھ رہے تھے، ویسے ویسے درختوں کی گو بھی نما چوٹیاں اوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ اور وہ زرد پرندہ غالباً کسی بڑے درخت کی جھولتی شاخ پر بسیرا کیے نیچے کالی چٹانوں کو دیکھ رہا ہوگا۔ شام کے دھند لکے میں فرنجی پانی کا پیڑ وقفے وقفے سے اپنے سیاہ جسم سے چھوٹی چھوٹی سفید بوندیں ٹپکار ہا تھا۔

اور اسے سیو چو کا خیال آیا جو اپنے سفید لباس میں اس فرنجی پانی کے نیچے گرے ہوئے پھولوں کے درمیان مثل ایک سائے کے بت بنی ششدر کھڑی پہاڑی کے عقب میں غروب ہوتے آفتاب کی بھڑک دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اس کو اندر بلا لے جانے کے لیے گھر کے اندھیارے سے نکل کر دبے پاؤں اس کے پیچھے پہنچا تو اس نے اس کو تقریباً ڈرا دیا تھا۔ وہ اس کی بیوی سے بہت چھوٹی تھی۔ سیو چو اپنی شادی کے دن کے انتظار کا وقفہ گزارنے کے لیے ان کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ کنگ منگ کو اس کا نکاحی گواہ بننا تھا کیونکہ اس کے سسر کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کے کنبے میں اور کوئی مرد نہیں تھا۔ شادی میں ابھی کوئی دو ماہ باقی تھے۔ مگر وہ اپنی ہمشیرہ سے ملاقات کرنا چاہتی تھی جو اس وقت رخصت ہو کر آ گئی تھی جب سیو چو ابھی بچی ہی تھی۔

غالباً پہاڑی کے حسن سے متاثر ہو کر گھر کے اندر جانے سے پہلے اس نے اس کے ساتھ بے تکلفی سے گفتگو کی تھی۔ کسی نوجوان لڑکی سے بے تکلفی سے گفتگو کرنا اس کو ایک انوکھا تجربہ لگا تھا۔

پراسرار کمر درد اور پسینہ چھوٹنے کی تکلیف کے سبب اس کی بیوی کی صحت کچھ دنوں سے گر رہی تھی، اس لیے لڑکی کی میزبانی اس نے کنگ منگ کے سپرد کر دی تھی۔ بعض اوقات وہ سیو چو کو شہر لے جاتا تھا جہاں وہ خریداری کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی خوش اخلاقی کا گرویدہ ہوتا گیا تھا۔ ہر شام کھانے کے بعد وہ دونوں باغیچے میں چلے جاتے تھے جبکہ اس کی بیوی معذرت کر لیتی تھی۔ اس کو آپس کی بیشتر گفتگو تو اب یاد نہیں رہی تھی۔ زیادہ تر تو وہی معمولی باتیں تھیں جن سے اس کو دلچسپی تھی۔ لڑکی کو بیرونی دنیا کی معلومات کی چینک تھی اور جلد ہی اس کی ابتدائی جھجک جاتی رہی تھی۔ اب وہ اس کو الجھن میں ڈالے بغیر اس کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ دو چمکدار سیاہ آنکھیں جن سے رات کی روشنی منعکس ہوتی رہتی تھی، نازک بیضوی چہرہ اور آواز جو کھنکھناتی تھی۔ وہ اس کی بیوی کا بہتر نعم البدل تھی اور حیرت انگیز طور پر نرم خو تھی۔ اس کی بیوی میں تو ایک مخصوص سی سنگدلی کا شائبہ تھا، ضبط کے پارچے تلے مستور ایک خوابیدہ ڈاہ۔ لڑکی کو دیکھ کر اسے چیلی چڑیا کا بوٹا یاد آ جاتا تھا۔

اب وہ صحیح صحیح تو دہرا نہیں سکتا تھا کہ یہ سب ہو کیسے گیا تھا۔ ایک شام وہ تاش کھیل رہے تھے کہ اتفاقاً اس کی انگلیاں اس کی ہتھیلی کی پشت سے چھو گئیں جو ٹھنڈی تھی مگر اس کو یوں معلوم دیا جیسے اچانک کوئی سلگتی چنگاری آ گری ہو۔ اس کی ریڑھ تن گئی تھی۔ اس رات کے بعد وہ اس سے کترانے لگا

Scanned with CamScanner

تھا۔ اس نے اپنے ان احساسات کو دبانا شروع کر دیا تھا جنھوں نے ایک عجیب پریشان کن صورت اختیار کر لی تھی۔ مگر چند ہی راتیں ڈانوا ڈول رہنے کے بعد اس نے اس واقعے کو ذہن سے جھٹک دیا تھا بلکہ اسے اس قسم کی بات سمجھنے لگا تھا جس کی پروا نہیں کرنا چاہیے تھی۔ آخر تھا تو وہ ایک امر اتفاقی۔

اول اول تو وہ لڑکی حیران پریشان رہی تھی اور اس کے اندر کی تبدیلی کو سمجھ نہ پائی تھی، قہقہے اس کے اب بھی کھنکتے تھے۔

آہستہ آہستہ اس کو گھورے جانے کا احساس ہوا تھا اور پھر جب بھی وہ اس پر سے اپنی نگاہ جلد نہیں ہٹاتا تھا تو اس کی تیوری پر تشویش نمایاں ہو جاتی تھی۔ وہ اس سے خوفزدہ نظر آتی تھی۔ مگر جب تک رات کی دبیز ہوا میں اس کی تازہ سنگتروں جیسی خوشبو آتی رہتی تھی تب تک اسے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی کہ وہ لڑکی اس کو پراسرار سمجھتی تھی۔

جس روز ملک کی آزادی کا اعلان ہوا تھا، وہ بار میں اپنے کاروباری ساتھیوں کی سنگت میں جام لنڈھا کر اور ویٹریسوں سے ٹھٹھولیاں کر کے جشن منا تا رہا تھا اور جب وہ معمول سے ذرا دیر میں گھر پہنچا تھا اور اپنے پنجوں پر اپنا توازن قائم کرتے ہوئے کار سے نکلا تھا تو وہ اس کو فرنجی پانی کے نیچے آسمان کی طرف منھ اٹھائے کھڑی آتش بازی کا تماشا دیکھتے ہوئے ملی تھی۔ جلوس بہت پہلے گھر کے پاس سے گزر کر دور جا چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتا اس کے نزدیک گیا تھا۔ وہ اس سے معلوم کرنے لگی تھی کہ شہر میں کیا کچھ ہوتا رہا تھا۔ بے شک وہ شراب کی ترنگ ہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کی جلد کو چھیڑا تو برانڈی کے اثر سے نرالے احساسات اس کے تن بدن میں دوڑ گئے تھے، یہاں تک کہ اس کو پور پور مدہوش ہوتی لگی تھی۔ وہ شہر کی ان خوشی سے تمتماتے چہروں والی حسیناؤں کے تصور کا ہی اثر تھا جس نے اس سے وہ حرکت سرزد کروائی تھی۔ اس نے اس کو اپنی بغل میں کھینچا تھا اور سر ابھی چکرا ہی رہا تھا کہ اس کو چوم لیا تھا۔ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ آتش بازی نے آسمان پر روشنی کی ایک چھتری سی چھا دی تھی اور اندھیارے میں اجالے کے نقطے سے بکھیر دیے تھے اور جیسے ہی اس نے اپنے آپ کو چھڑا کر علیحدہ کیا تھا، ان کی نظر پورچ میں کھڑی ہوئی بیوی پر پڑی تھی۔ لڑکی خود کو چھڑا کر بھاگی تھی اور اس کی بیوی کے پاس سے گزر کر دوڑتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ یہ سراسر اس کی نادانی تھی۔ اگر وہ اس رات بھاگی نہ ہوتی تو اس نے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا ہوتا۔

Scanned with CamScanner

رات گئے تک آتش بازی چھوٹتی رہی تھی مگر گھر میں ایک بے چین کر دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ جھونک میں آ کر پنکھے کے نیچے کوچ پر ہی پڑ رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کا سامان کمرے کے باہر پھینک دیا تھا۔ اس کو گمان گزرا کہ ایک مرتبہ اس نے خواب میں کسی تاریک سائے کو اپنے اوپر جھکتے دیکھا تھا اور جب اس نے کروٹ لی تھی تو سائے نے اس کے گال کو چھوا تھا۔ صبح ہوتے جب اس کی نیند اچٹ گئی تھی تو وہ اٹھ گیا تھا اور تا دیر ہال میں ٹہلتا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے کمرے میں جھانکا تھا۔ اس کی بیوی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ دوبارہ ٹہلنے لگا تھا۔ آخر کار وہ دوسرے کمرے کی طرف گیا تھا اور جب اس نے دروازہ کھولا تھا تو وہ کانپ رہا تھا۔ مگر سیو چو کا بستر خالی تھا۔ وہ اس کو پورے گھر میں چپ چاپ تلاش کرتا پھرا تھا اور پھر باغیچے میں نکل گیا تھا۔ جب وہ گھر میں جانے کے لیے پلٹ رہا تھا تو اس کی نظر کھڑکی پر پڑی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ باہر سڑک سنسان تھی۔ بے چینی محسوس کرتے ہوئے وہ ہال میں آیا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے اپنی بیوی کو جگانے کی ہمت کی تھی اور جس وقت تک وہ کھوجیوں کو اکٹھا کر سکے تھے، دن نکل آیا تھا۔ ایک تنگ حلقہ بنائے انھوں نے پہاڑی کی ڈھلانوں کو کھنگالنا شروع کیا تھا۔ اس کی بیوی نے ہی سب سے پہلے اس کورین ٹری کی اس ٹیڑھی میڑھی شاخ سے جھولتے لٹکتے دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سفید پوش پیکر سیاہ چٹان کے اوپر لٹکا ہوا تھا۔ جب دوڑ کر وہ ادھر گئی تھی اور اس لڑکی کو نیچے کھینچنے لگی تھی تو اس کی آہ و زاری نے دور دور تک پہاڑی کی خاموشی کو پاش پاش کر دیا تھا۔ سہارا دے کر وہ اپنی بیوی کو گھر لے آیا تھا اور ڈاکٹر بلوایا تھا۔

وہ حقیقتاً پشیمان تھا۔ ذہن ہی ذہن میں اس نے تقدیر سے شکوہ کیا تھا۔ آخر کو تھی تو وہ ایک معمولی سی بات، پھر اس کا انجام یوں کیوں ہوا۔ کنگ منگ نے کبھی بھی یہ حقیقت قبول نہیں کی کہ زندگی ایسے ہی صورت اختیار کرتی تھی جیسے جھینگر کے حلق سے نکلی ایک یک و تنہا تھرتھری رات کو پہاڑ بنا دے۔

یہ سات برس پہلے کی بات تھی۔ رات کی خنک ہوا نے اس کے چہرے کو منجمد کر دیا اور وہ کانپا۔ گھڑی کے روشن ڈائل پر ۷:۴۵ کے ہند سے نظر آئے۔ اس کی بیوی اب بھی چٹائی پر سوئی پڑی تھی۔ سڑک پر اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔ دھیمے دھیمے ایک نئی آواز ابھری۔ شروع میں بہت مدھم، دور سے آتی ہوئی گاجے باجے کی آواز جو بتدریج قریب آتی گئی۔ بیوی اب بھی سو رہی تھی اور وہ اس ادھیڑ بن

میں تھا کہ آیا وہ پھر وہی کچھ ہونے دے۔ گردن گھما کر اس نے ہال کی روشنیوں کو گلابی پردوں میں سے چھن کر آتے دیکھا اور اپنے ہونٹ چباتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ جس بات کا خیال اسے آیا تھا، وہ نہ ہو۔ سیو چو کی موت کے بعد وہ اندر سے ڈھے گیا تھا۔ بند ٹوٹ چکا تھا۔ آبِ زلال اب غلیظ سیل بن چکا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنوں میں سر دے لیا اور اپنی کنپٹیوں کو زور سے دبایا۔ یہاں تک کہ ماتھا دکھنے لگا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر باڑھ کی سمت دیکھا۔ آتے ہوئے جلوس کے گیس ہنڈوں سے آتی ہوئی روشنی کی وجہ سے باڑھ سلمہ ستارے والی ہو گئی تھی اور ہوا میں سانپ کی طرح لہرا رہی تھی۔ جلوس کی آوازوں نے پھیل کر فضا کو پر شور کر دیا تھا۔ گاتی بجاتی آوازیں، نفیریاں، بینڈ باجوں پر فوجی نغمے اور اچانک مائیکروفون نے تلوار کی طرح وار کیا۔ ایک تیز کرخت آواز آئی، ''آزادی، ہماری قوم زندہ باد!'' اور خلقت کی طرف سے نعرہ بلند ہوا، ''آزادی، آزادی!''

اس کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور بغیر کچھ سمجھے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ یک لخت تاریک آسمان میں دور اوپر آتش بازی پھٹ پھٹ کر اپنی شاخیں پھیلانے لگی تو جلوس میں سے زوردار نعرے بلند ہوئے۔ ایک پل کے لیے اس کی بیوی بالکل حواس باختہ رہی اور پھر ایک جست مار کر چیخ پکار کرتی گھر کے اندر بھاگ گئی۔

جب وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں گھسا تو وہ اپنے بستر پر لیٹ چکی تھی اور اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔

''آہ نوئی! آہ نوئی!'' کنگ منگ بیوی کی چیخوں سے اپنی آواز زیادہ بلند کرتے ہوئے پکارا، ''ادھر آؤ، فوراً!'' اس نے خود کو بیوی پر گرایا اور جب وہ اٹھنے لگی تو اسے جکڑ لیا۔ گردن گھمائی تو اس نے ملازمہ کو دروازے میں ٹھٹکے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے پایا۔ ''جلدی کرو! جلدی سے گولیوں کی شیشی اور ایک کپ پانی لے آؤ... جلدی کرو!'' اس نے چیخ کر سہمی ہوئی لڑکی کو حکم دیا۔ لڑکی پھرتی سے گئی اور دوا کی شیشی اور پلاسٹک کپ لے کر آ گئی۔ ''ادھر آؤ!'' اس نے اپنا آزاد ہاتھ ہلایا۔ ''جب میں دوا دوں تو تم ان کو کس کر دبائے رہنا۔'' اس نے دل میں دعا مانگی کہ وہ اٹھ کر بھاگ نہ جائے۔ لڑکی نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔

Scanned with CamScanner

جب اس کی بیوی نے دیکھا کہ اسے کون پکڑے تھا تو گالیاں کو سنے اس کے منھ سے ابل پڑے۔لڑکی پیلی پڑگئی۔اپنی انگلیوں کی لرزش کو قابو میں کرتے ہوئے اس نے شیشی کا ڈھکن کھولا اور گولیاں اپنی ہتھیلی پر انڈیلیں اور پھر جھک کر اس نے بیوی کے پے در پے چپتیں لگائیں اور اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی چٹی سی بنا کر اس کے گالوں کو دبایا اور زبردستی اسے منھ کھولنے پر مجبور کیا۔اس نے منھ سے غرغراہٹ پیدا کی، حیرت انگیز قوت سے بل کھا کر پہلو بدلا، اپنا چہرہ اس کی گرفت سے چھڑالیا اور اسی لپیٹ میں لڑکی کو وہ اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئی۔اس اچانک زور آزمائی نے اس کا توازن بگاڑ دیا اور اس نے خود کو اس حالت میں پایا کہ اس کا سینہ لڑکی کے کندھوں کے اوپر تھا۔زور لگا کر اس کی بیوی نے دوبارہ اٹھنا چاہا تو لڑکی کے سرین اچھلے اور اس کے پیٹ سے ٹکرا کر پچک گئے۔اس کی رانوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔اپنا بایاں ہاتھ لڑکی کے سر کے اوپر سے نکال کر اس نے بیوی کے رخسار پھر انگلیوں کی گرفت میں لیے، آہستہ آہستہ اسے منھ کھولنے پر مجبور کیا۔دوسرے ہاتھ سے اس نے گولیاں اس کے لرزتے منھ میں ڈالیں اور منھ بند کر کے دوسرے ہاتھ سے ناک دبا دی۔اس کی بیوی نے گولیاں یوں نگلیں جیسے ابکائی لے رہی ہو۔لڑکی اب رونے لگی تھی۔اس گڑبڑاہٹ میں اس نے اس کے سرین پر ہاتھ پھیر دیا اور پھر کانپتے ہوئے کمزوری محسوس کرنے لگا۔تادیر تینوں اسی طرح ایک دوسرے میں الجھے رہے۔

ایک دھچکے کے ساتھ اس کو احساس ہوا کہ وہ تو لڑکی کے کان کے نیچے واقع گلابی مسے کو چاٹ رہا تھا، اپنی زبان کی نوک سے اس کو تر کر رہا تھا اور اس کی ناک اس کی لیموں جیسی مہک کو یوں سونگھ رہی تھی جیسے کہ وہ کتا ہو۔وہ خود کو اس کے بدن سے مس کر رہا تھا اور تب ہی غشی کی ایک لہر سی اس پر سے گزر گئی۔اپنے جسم کو اس سے دور ہٹاتے ہوئے وہ خود کو آپے میں لایا اور اپنے آپ کو تھکی تھکی آواز میں کہتے سنا: "تم اب جا سکتی ہو۔" اس کی بیوی اب بھی اس کے بوجھ تلے دبی پڑی تھی۔لڑکی اس کے جسم پر دباؤ ڈالتی اٹھی اور جب وہ پلنگ سے اتری تو اس کا اسپرنگ اپنی جگہ آیا اور پلنگ چر چرایا۔جب اس نے منھ گھمایا تو اس کی نظریں لڑکی کی عجیب الجھن میں گرفتار نظروں سے ملیں۔وہ ابھی تک پلنگ کے قریب کھڑی تھی۔اس کی آنکھوں میں بات کو پا جانے والی چمک تھی۔"تم جاؤ، میں ٹھیک ہوں... میں اب ٹھیک ٹھاک ہوں،" اس نے دہرایا اور منھ پھیر لیا۔وہ ذرا سا کوب نکالے وہاں سے چل دی۔

Scanned with CamScanner

جب وہ چلی گئی تو وہ اپنی بیوی پر جھکا چپکے چپکے روتا رہا جو کچھ اس طرح ساکت پڑی تھی جیسے مردہ ہو۔

دھوم دھڑ کا آدھا گھنٹہ ہوا ختم ہو چکا تھا۔ وہ آہستگی سے پلنگ سے اٹھا، باغیچے میں جا کر بکھرے ہوئے تاش سمیٹے اور چٹائی کو لپیٹا۔ رات اندھیری تھی اور آتش بازی اب بھی آسمان پر چھوٹ رہی تھی۔ اس کو ناتوانی محسوس ہوئی تو اس نے ایک درخت سے ٹیک لگالی۔ ایک بڑا سا چکنا پھول اس کے گال کو چھوتا ہوا زمین پر جا گرا۔

جیسے ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑا، لڑکی کے کمرے کی بتی بجھ گئی۔ اسے جھرجھری شروع ہوئی تو اس نے لان کے کنارے ٹھٹک کر آنکھیں موندلیں اور بڑی دقت سے اپنے قدم اٹھائے۔ اس نے غور سے اس کی آواز پر کان لگائے لگائے ہال کی بتیاں بجھائیں۔ جھینگر کے حلق سے ایک کراہ نکل کر فضا میں لرزنے لگی۔ فاختئی رنگ کی چھپکلیاں اپنے شکار کی تلاش میں چھت کے تختوں پر رینگیں۔ پچھلی بار کون سی تھی؟ کیا وہ آہ پن تھی جو پھرتی سے اپنا دروازہ بند کرتے ہوئے ہکلائی تھی؟ یا وہ آہ کم تھی جس نے کپڑوں پر استری کرتے ہوئے عیار نظریں مٹکائیں اور پھر اس کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی؟ یا آہ پوہ جس نے باہر نکل کر بھاگنے کے لیے بیرونی پھاٹک دھڑ دھڑا ڈالا تھا؟ لگتا تھا اتنی بہت سی تھیں۔ تھکن محسوس کرتے ہوئے وہ اپنی بیوی کے کمرے میں گیا اور کرسی پر مڑتڑ کے پڑ رہا اور بستر پر پڑے اس کے مبہم جسم کو دیکھتا رہا۔ خدا کا شکر کہ اگلے دن چھٹی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ان ڈراؤنے خوابوں کی کشش سے پیچھا چھڑانے میں لگ گیا جو اب کثرت سے آنے لگے تھے، مکان کی بالائی منزل میں بلیاں دبے پاؤں گھوم رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ ایک طرح سے وہ خوش تھا کہ اس کا اپنا گھر تھا اور روپے پیسے کی طرف سے بھی کوئی فکر نہیں تھی۔ آزادی نے اس پر بڑا اَبن برسایا تھا۔ بس اگر سیو چو بھی زندہ رہتی... اگلے دن کے لیے جب اس نے گھڑی کو کوک دی تو اندھیرے میں اس کی روشن سوئی تھر تھرائی۔

❋❋

بین وینید وسانتوس

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

آنکھوں دیکھی

جب وہ آئی اور پھچیوں کا فرش اس کے قدموں تلے چرچرایا تو بوڑھے نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر وہ بولا:

''تم کو اندھیرا ہونے کا انتظار نہ کرنا چاہیے تھا، سدرا۔''

وہ ایک سلگتی انگیٹھی کے سامنے کھڑا تھا۔

''معاف کرنا بابا،'' سدرا نے کہا، ''مجھ کو پتا ہی نہیں چلا کہ میں وہاں اتنی دیر رک گئی ہوں۔''

بوڑھے نے کھولتے بھگونے کا ڈھکن اٹھایا اور کچھ نہ بولا۔

اس رات آپس میں باتیں کرتے ہوئے انھوں نے اُس شخص کا ذکر بالکل نہ کیا جو حال ہی میں سمندری سفر پر گیا تھا، کہ اسے جانا ہی تھا۔

''بابا، جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی کیا؟''

''میرا خیال ہے ابھی نہیں۔ پر جلدی ہو جائے گی۔''

''اور ہم جیتیں گے نا؟''

''ہاں، مجھے بھروسا ہے، ہم جیتیں گے۔''

''مان لو ہم جیت گئے، پھر کیا ہوگا؟''

''ایں... کچھ نہیں، میرا اندازہ ہے کچھ نہیں ہوگا سوائے... اچھا، اب تم سو جاؤ سدرا۔''

Scanned with CamScanner

''رات زیادہ تو نہیں ہوئی ابھی، ہے نا؟ یہ آج رات چاند کیوں نہیں نکلا؟ بڑا اندھیرا ہے... وہ آواز سن رہے ہو بابا؟''

انھوں نے آواز پر کان لگا دیے۔ ہوا پیڑوں کو ہلا رہی تھی مگر یہ آواز پیڑوں سے بالا کہیں دور سے آ رہی تھی، آسمان میں ایک مسلسل یکساں بھنبھناہٹ جیسی۔

''یہ ہوائی جہاز ہیں،'' بوڑھا بولا۔

''بہت سے ہیں کیا؟''

''شاید۔''

''اپنے ہیں؟''

''پتا نہیں... دراصل، میں کیا جانوں سدرا... پر یہ اپنے ہو سکتے ہیں۔''

پوچھنے کو تو سدرا کے پاس دوسرے سوالات بھی تھے مگر ان کا تعلق اس کی اپنی زندگی کے فوری زمانۂ حال سے تھا۔

یہ سوالات اس کے شوہر کی واپسی کے بارے میں اس کی گہری تشویش کی نشان دہی کر دیتے، اس لیے وہ چپ ہو گئی۔

پھر سوائے پیڑوں میں ہوا کی سرسراہٹ اور ساحل پر موجوں کے سڑپا لگانے کے باہر خاموشی چھا گئی۔

سیلمو واپس نہیں لوٹا تھا۔ وہ پہلے کبھی اتنی مدت تک دور نہیں رہا تھا۔ سدرا دھیمے دھیمے روئی۔ اس نے سیلمو کا نام بھی پکارا، اپنی سادگی میں اس امید پر کہ وہ اس کی پکار سن لے گا، جہاں کہیں بھی وہ ہوگا۔

بوڑھا اگر اپنی بیٹی کے اس گہرے دکھ کو جانتا تھا تو اس نے اس کو ذرا بھی ظاہر نہ کیا۔ ان کے ہمسائے اور رشتہ دار صاف صاف کھلی تشویش کا اظہار کرتے اور اپنے اندیشے برملا ظاہر کرتے تھے۔ تب سدرا کو ندامت محسوس ہوتی تھی، گویا ہر ایک کے نظارے کے لیے اس کا دل بے نقاب پڑا ہو۔ تاہم وہ سمجھتی تھی کہ ان سب کی پریشانی سچی ہے۔ جب اس نے اپنے باپ سے کہا کہ یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہر کس اس کے لیے اپنی بے چینی ظاہر کرے تو بوڑھے نے کہا تھا:

Scanned with CamScanner

''پروردگار کا شکر کرو سدرا، کہ دل مہربان ہوتا ہے۔''

جس کا اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ نہ تو پوری طرح ان الفاظ کے معانی سمجھے اور نہ ہی اس جوت کو جانا جو ان الفاظ نے اس کے اندر جگائی تھی جس نے اسے اب زیادہ بے کل نہیں رہنے دیا تھا۔— کم سے کم اس گھڑی۔

پھر ایک دن پو پھٹنے سے ذرا پہلے جنگ اچانک اس چھوٹے جزیرے میں آدھمکی۔— آسمان سے ایک تیز رفتار، کڑکتا گرجتا سیاہ دھوئیں کا مرغولہ بن کر۔

سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی نے بھی حقیقتاً اسے پوری طرح نہیں دیکھا، مگر بہتیروں نے تیز سے تیز تر ہوتی ہوئی تیکھی جھینکتی آواز کے ساتھ بے قابو ہوتے، قریب ڈولتے، بالکل چھتوں کے اوپر نیچے کی سمت لپکتے شہپروں کو دیکھا، اور آخر کار آسمان سے ایک بے ہنگم گرج دار دھماکے کو صاف اپنے درمیان کہیں قریب ہی سنا۔ خوف اور دہشت کے مارے، بے ربط چیخ و پکار کرتے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دوڑ پڑے۔

ایک جہاز مکئی کے کھیت کے بیچوں بیچ آ گرا تھا۔ اب وہ ان شعلوں کی چادر میں لپٹا، آدھا دھنسا پڑا تھا جنھوں نے جزیرے کو یوں روشن کر دیا تھا جیسے صبح کا سورج پو پھٹنے سے پہلے ہی چپ چاپ نکل آیا ہو۔

بدحواس عورتوں اور بچوں کی چیخ پکار میں سدرا کی اپنی چیخیں گم ہو گئیں۔ دھند لکے میں اس نے اپنے باپ کو جلتے جہاز کی سمت کھیتوں میں دوڑ کر جاتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے دوسرا ہی نام پکارتی لپکی۔

''سیلمو! سیلمو!'' یوں جیسے یہ اس کے طویل دورِ مصیبت میں آخری کارروائی تھی۔

وہ دیکھنے والوں کے حلقے کو چیر کر آگے بڑھی جو شعلوں کی چکا چوند میں نیم وحشی اور اپنے چیتھڑوں میں برہنہ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے خوف اور حیرت سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کر گئے تھے۔ وہ ہی تھی جسے ایک آدمی کا ہیولا سا نظر آیا جس کے پیر اس شکستہ جلتے ڈھانچے میں سے یوں نکلے ہوئے تھے جیسے ہوّے (scarecrow) کے نچلے بازو لٹکے ہوں۔ گرد اس کے شعلے بھڑک رہے تھے اور چابک زنی کر رہے تھے۔

''دیکھو! دیکھو!'' وہ چیخی، اس نے عین اس جگہ اشارہ کیا جہاں شعلوں کے جھروکے سے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ تب ایک بازو اور ٹٹولتے ہاتھ نظر آئے۔

سدرا اس مقام کی طرف لپکی۔

مگر بوڑھا زیادہ مستعد تھا، اس نے کوستے ہوئے سدرا کو پیچھے گھسیٹا اور شعلوں سے دور پھینک دیا۔

سدرا پانی کے گڑھے میں گری اور چیخنے لگی:

''وہ جل مرے گا! وہ جل مرے گا!''

اس نے کیچڑ سے خود کو نکالا اور جہاز کی طرف لپکنے کی ایک اور کوشش کی۔

مضبوط بازوؤں نے اسے پکڑ کر روک لیا۔ چندے اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور آزمائی کی مگر غشی سی محسوس کر کے اس نے یہ کشمکش ترک کر دی۔ جوں ہی وہ گرنے لگی ایک بڑھیا نے اسے سنبھالا۔ سدرا کی آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ بے حس پڑی رہی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کی نظروں کے سامنے ایک گہری دھند چھائی تھی جس میں سے وہ ایک آدمی کا چھوٹا سا لہولہان اور جھلسا ہوا جسم دیکھ سکتی تھی۔ جس وقت کئی آدمی اسے گھسیٹ کر جہاز سے نکال رہے تھے، اس نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ پھر وہ نڈھال ہو کر اُدھڑی ہوئی زمین پر سر کے بل گر پڑا۔

سدرا نے عورت کے بازوؤں سے خود کو چھڑایا اور چند قدم اس آدمی کی طرف بڑھی جو اب ان کے قدموں میں چت پڑا تھا۔ پہلے تو غل غپاڑے میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر جب اس نے اس آدمی کو غور سے دیکھا تو بالآخر وہ سمجھ گئی۔

وہ شخص دشمن پائلٹ تھا۔

''ارے اس کی مدد کرو،'' عورتیں چلائیں، ''یہ تو بالکل لڑکا ہے۔''

لیکن کچھ لوگ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

لہولہان شخص اتنا چھوٹا اور مختصر تھا کہ واقعی وہ ایک لڑکا ہی نظر آتا تھا۔ وہ یوں بے حس و حرکت پڑا تھا جیسے ایک تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد اس پر بڑا سکون چھا گیا ہو — پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف یوں دیکھا جیسے خود کو کسی ایسی بات کی یقین دہانی کرا رہا ہو جو اس

Scanned with CamScanner

کے ذہن میں آ رہی تھی یا آنے سے گریز کر رہی تھی — کون بتا سکتا تھا؟

''کوئی اس کی مدد کرو!'' سدرا چلائی۔

''اوہ، مر جانے دو،'' مجمعے میں کسی نے کہا۔

''اس کے پاس ہتھیار ہو سکتا ہے۔''

''تلاشی لے لو۔''

''کون تلاشی لے گا؟''

''ہو سکتا ہے مکر کیے پڑا ہو۔''

سب کی نگاہیں سامنے پڑے قریب المرگ اجنبی پر لگی تھیں۔ وہ اسے رحم طلب انداز میں لایعنی گفتگو کرتے اور اپنی جانب اور آسمان کی جانب ہاتھ پھیلاتے دیکھتے رہے۔ وہ اسے کہنیوں کے بل اٹھتے اور کراہ کر گرتے دیکھا کیے۔ وہ دیکھتے رہے۔ کچھ دوسرے کھسک کر قریب تر آ گئے، اس کے چہرے کو بغور دیکھا، اس کی پیلی جلد، اس پر جمے خون کے لوتھڑوں اور تر بتر وردی پر توجہ دی۔

''دیکھتے نہیں یہ مر رہا ہے!''

''مرنے دو۔''

''مار ڈالو! اسے مار ڈالو!''

ایک نوجوان نے پتھر اٹھا لیا۔ پتھر بھدے سے فوجی کے چہرے کے پہلو میں گرا۔

عورتیں چیخیں، ''رک جاؤ! یہ مت کرو!''

''خدا کے لیے اس پر رحم کرو!''

کئی دوسری آوازیں اس پکار میں شامل ہو گئیں۔

جہاز جلتا رہا اور لوگ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلے۔

سدرا بھیڑ میں اکڑوں بیٹھی اس آدمی کو تکتی رہی۔ وہ سب کچھ دیکھنے کی سعی کرتی رہی جو اس کی ننگی آنکھ دیکھ سکتی تھی کسی مرتے ہوئے آدمی میں — چاہے وہ اجنبی ہو یا اپنا، دشمن ہو یا دوست۔

بوڑھا جھکا۔ اس نے دوسروں پر زور دیا کہ وہ فوجی کو بوڑھے کے گھر کے نامکمل چھپر تلے لے جانے میں مدد دیں۔ کچھ نے اس کا ساتھ دیا۔

Scanned with CamScanner

''یہ مرجائے گا،'' انھوں نے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر لگے ہوے خون کو دیکھ کر کہا۔

دن کی روشنی میں اب وہ بوڑھے کے گھر کے نامکمل چھپر تلے فرش پر پڑا تھا۔ سدرا اور جزیرے کی دائی نے پانی ابالا اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ دراصل اب اس کے لیے کچھ کیا نہیں جاسکتا تھا— مگر اب وہ پہلے سے صاف ستھرا ہو گیا تھا اور اپنی نیم برہنگی میں سچ مچ ایک لڑکا ہی نظر آرہا تھا۔

صرف چند لوگ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس پر کیا بیتی ہے، قریب کھڑے رہ گئے تھے، باقی مکئی کے کھیت کی طرف چلے گئے تھے جہاں جہاز اب بھی جلے جارہا تھا۔ وہ اس جلتے ڈھانچے پر بالٹی بھر بھر پانی پھینکیں گے اور جلد ہی اس میں سے کچھ نہ کچھ بچا کھچا نکالنا ممکن ہوگا۔ عورتوں نے اس انوکھے سحر کا فائدہ اٹھایا جو مرتے ہوے آدمی نے ان کے ان نونہالوں پر کر رکھا تھا جو خوفزدہ نہیں تھے۔ بچوں کو چھپر تلے چھوڑ کر وہ تباہ شدہ جہاز کی جانب عجلت میں چلی گئیں۔

چند چھوٹے بچے دیکھتے دیکھتے اوبھ گئے اور اپنی ماؤں کے لیے رونے چلانے لگے۔ کچھ دوسرے مرتے ہوے آدمی کی ٹانگوں کے قریب پڑ کر سو گئے۔

اس کی نبضیں تیزی سے ڈوب رہی تھیں۔ سدرا نے ایک گیلا کپڑا اس کے ہونٹوں پر لگایا۔ اس نے اپنے بازو جھٹکے اور رو پڑا۔ پھر اس نے اپنا سر ڈال دیا جیسے اب کسی بات کی اہمیت نہ رہی ہو۔

مگر ایک مختصر لمحہ ایسا آیا جب اس نوجوان نے اپنی آنکھیں کھولیں جو اس کے بدہیئت چہرے پر صرف سوجی ہوئی درزیں سی تھیں۔ اس کے ہونٹ کپکپائے۔

بوڑھا اور دو عورتیں اس کے اور قریب جھک گئیں کہ شاید کوئی لفظ، کوئی فقرہ ان کی سمجھ میں آجائے۔ نوجوان نے بڑبڑانا شروع کر دیا اور رحم طلب نظروں سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

انھوں نے اندازہ لگایا وہ انھیں بتا رہا تھا کہ وہ کون ہے۔

''وہ کچھ کہہ رہا ہے اور ہم کو دیکھ رہا ہے،'' سدرا نے کہا۔

''وہ ہم کو دیکھ نہیں رہا،'' بوڑھا بولا۔

''بابا، یہ نوجوان ہے نا؟ زیادہ بڑا بھی نہیں ہوسکتا...''

''شکل تو اس کی کسی ایسے آدمی سے ملتی ہے جسے میں جانتی ہوں۔ میں اس کو پہچانتی ہوں۔

Scanned with CamScanner

میں اس کو پہچانتی ہوں،" ایک بڑھیا نے کہا۔

"ہاں، ہاں،" سدرا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لگتا ہے میں بھی اس کو جانتی ہوں۔ بابا بتانا، کیا تم نے اس کو پہلے نہیں دیکھا؟"

"نہیں، ہم نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا،" اس کے باپ نے کہا، "پر ہم اس کو جانتے ہیں، ہاں، ہم اس کو جانتے ہیں۔"

اس نے اپنا ہاتھ نوجوان کی ہتھیلی پر رکھا جس کے مس سے اس میں لرزش ہوئی۔ زرد ہاتھ نے بوڑھے کے ہاتھ کو ناتواں سی گرفت میں لے لیا۔ کوشش کر کے اس نے بوڑھے کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

عورتیں چلائیں، "اس نے تمھارا ہاتھ چوما۔"

"میرے بچے،" بوڑھے نے دل شکستہ آواز میں کہا، "میں جانتا ہوں تم کہاں سے آئے ہو، تم کون ہو اور تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ پر خدا تم پر رحم کرے۔"

"اوہ خدایا!" سدرا نے کہا، "یہ تو مر رہا ہے!"

"اب جلدی ہی خاتمہ ہو جائے گا،" بوڑھا بولا۔

انگلیاں ڈھیلی پڑیں اور ہاتھ جھول گیا۔

سدرا نے اپنی چیخ روکنے کے لیے اپنے منھ پر ہاتھ رکھ لیے اور منھ پھیر لیا۔

"میرے بھی بیٹے تھے جو مجھ سے پہلے چلے گئے، بے وقت موت کو گلے لگا کر، یا پردیس سدھار کر اور کبھی واپس نہ آ کر۔ میں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو حوصلے سے اپنا غم برداشت کرتے دیکھا اور بالکل تم جیسے ایک اور نوجوان نے بھی میرے ہاتھ کچھ دن پہلے چومے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی کبھی نہ لوٹے۔"

سہ پہر کافی گزر چکی تھی جب لوگ آ گئے اور وہ لاش لے گئے۔ اس کو ایک پرانی چٹائی میں لپیٹا گیا تھا اور وہ اسے ساحل سے دور اندر جنگل کے سرے تک لے گئے۔ راہ میں انھوں نے ایک ٹولی کو مکئی کے کھیت کی طرف سے آتے دیکھا۔

کھیت سے لوگوں نے پکارا، "کیا وہ مر چکا ہے؟"

Scanned with CamScanner

لاش اٹھانے والے پلٹ کر چلائے، ''کیا تم نے جہاز میں سے سب کچھ نکال لیا؟''

کھیت ان کی آوازوں سے گونج اٹھے۔

قبر گہری تھی کیونکہ ہر مرتبہ جب کھودنے والے دم لینے کو رکتے تو بوڑھا اور کھودنے پر زور دیتا۔

''اور گہری، اور گہری!'' وہ کہتا۔

ایک دبلا پتلا آدمی جس کے کاندھے باہر کو نکلے ہوئے تھے، زمین پر بیٹھا صلیب بنا رہا تھا۔

''عجیب بات ہے،'' وہ بڑبڑایا، ''ہم اس صلیب پر کوئی نام بھی نہیں ڈال سکتے۔''

کسی نے کہا، ''خود اپنا نام ڈال دو۔''

سدرا بوڑھے کے لیے رکی رہی جو سب سے آخر میں وہاں سے لوٹا۔ اس نے مٹی کو اپنے خالی ہاتھوں سے پھیلانے اور پیروں سے دبانے میں کافی وقت لگایا۔

''یوں یہ بند بھی رہے گی اور محفوظ بھی۔''

''کاہے سے محفوظ رہے گی بابا؟'' سدرا نے پوچھا۔

''ہوا کے جھکڑوں سے محفوظ رہے گی سدرا، جنگلی درندوں سے محفوظ رہے گی۔''

وہ مٹی کو دباتا رہا، سخت بناتا رہا، جماتا رہا، یہاں تک کہ ابھار کو تقریباً ہموار کر دیا۔

''اندھیرا ہو گیا ہے بابا،'' سدرا نے کہا۔

شام کے جھٹپٹے میں انھوں نے مکئی کے کھیت کو پھر سے روشن دیکھا۔ کیا جہاز اب تک جل سکتا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے وہ اس جانب چل دیے جہاں جہاز گرا تھا۔

اب وہ بالکل نہیں جل رہا تھا بلکہ کچھ لوگ ملبے کو کھود کرید رہے تھے۔ ان کی مشعلوں نے اوپر کے تاریک آسمان کو روشن کر دیا تھا۔

''کوئی نہیں بچنے پاتا،'' بوڑھے نے کہا۔ ہوا اس کی آواز کو اس عورت سے دور اڑا لے گئی جو سر جھکائے بوڑھے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

❋❋

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مستند بنیادی مآخذ

سالِ رواں ۲۰۰۷ء میں جنگِ آزادی کے ۱۵۰ برس مکمل ہونے پر پیش کی جا رہی ہیں

(1) The Mutiny Records	*Edward H. Hilton*	Rs.500
(2) The History of Indian Mutiny	*Sir John Kaye*	Rs.900
(3) The Indian Mutiny of 1857	*C.G.B.Malleson*	Rs.600
(4) The Punjab and Delhi in 1857	*J.Cave-Browne*	Rs.1200
(5) The History of the Indian Mutiny *(2 Vols)*	*Charles Ball*	Rs.4000
(6) The Indian Mutiny (4 Vols.)	*Ed. G.W.Forrest*	Rs.4500
(7) Punjab and the Indian Revolt of 1857	*Ihsan H. Nadiem*	Rs.400
(8) Notes on the Revolt in the North-Western Provinces of India	*Charles Raikes*	Rs.450
(9) The Crisis in the Punjab	*A Punjab Employee*	Rs.350
(10) Mutiny Records: Reports *(2 parts in 1 Vol.)*		Rs.1500
(11) Mutiny Records—Correspondence *(2 parts in 1 Vol.)*		Rs.1800
(12) The Delhi Residency and Agency Records		Rs.900
(13) Records of the Ludhiana Agency		Rs.900
(14) Punjab Mutiny Report, *Selections from the Public Correspondence*		Rs.400
(15) Political Diaries of Lieut. H.B.Edwards		Rs.750
(16) Political Diaries of the Agent to the Governor-General		Rs.800
(17) Political Diaries of Lieut.	*Reynell G. Taylor*	Rs.900
(18) Journals and Diaries of the Asst. to the Agent		Rs.900

(۱۹) تاریخ بغاوتِ ہند ۱۸۵۷ء (محاربۂ عظیم)	پنڈت کنہیالال	۴۰۰ روپے
(۲۰) ۱۸۵۷ء (مجموعہ خواجہ حسن نظامی)	مرتبہ: محمد اکرام چغتائی	۱۲۰۰ روپے
(۲۱) ۱۸۵۷ء "خیال نمبر"	ناصر کاظمی، انتظار حسین	۶۰۰ روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس میں دستیاب رسائل وجرائد

کتابی سلسلہ مکالمہ کراچی
مدیر: مبین مرزا

کتابی سلسلہ دنیازاد کراچی
مدیر: آصف فرخی

ماہنامہ آئندہ کراچی
مدیر: محمود واجد

ماہنامہ جریدہ کراچی
مدیر: خالد جامعی/عمر حمید ہاشمی

سہ ماہی بادبان کراچی
مدیر: ناصر بغدادی

ارتقا کراچی
ترتیب: حسن عابد، راحت سعید

سویرا لاہور
ترتیب: محمد سلیم الرحمٰن/ ریاض احمد

دبستان لاہور
مدیر: مرتضیٰ برلاس

سہ ماہی ادراک گوجرانوالہ
مدیر: خالد فتح محمد، اسد ملک

قرطاس گوجرانوالہ
مدیر: مکنون احمد جان

سمبل راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی

سہ ماہی نیا ورق ممبئی
مدیر: ساجد رشید

سہ ماہی اردو ادب دہلی
مدیر: اسلم پرویز

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی
مدیر: ڈاکٹر علی جاوید، مخمور سعیدی

سہ ماہی استعارہ دہلی
مدیر: صلاح الدین پرویز

شعر و حکمت حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم

ALHAMRA *Literary Review*
(Islamabad)
Ed. Ilona Yousuf

HIMAL *Southasian*
(Kathmandu, Nepal)
Ed. Kanak Dixit

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں یوروپ کے تین شاعروں کی پانچ نظمیں پیش کی جارہی ہیں جنھیں اردو کے صاحب طرز جدید شاعر افضال احمد سید نے اردو میں منتقل کیا ہے۔

اودیسیوس ایلیتس (Odysseus Elytis) کا تعلق یونان سے ہے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں جزیرہ کریٹ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں ایتھنز منتقل ہو گئے۔ وہیں انھوں نے تعلیم پائی اور ۱۹۳۵ء میں اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع کیا جس کا یونانی جدید شاعری کے ایک نئے دور کے آغاز کے طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ انھوں نے کیڈٹ کے طور پر تربیت حاصل کی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران محاذ پر خدمات انجام دیں۔ یونان پر جرمن فوج کے قبضے کے دوران وہ ادبی طور پر نہایت سرگرم رہے اور مضامین اور نظمیں لکھتے رہے۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں ادب کا نوبیل انعام پیش کیا گیا۔ کئی دہائیوں پر محیط ایلیتس کی شاعری میں بے پناہ تنوع موجود ہے۔ امید ہے آگے چل کر ان کی مزید نظموں کے ترجمے شائع کیے جا سکیں گے۔

گوٹفریڈ بین (Gottfried Benn) جرمنی کے مشہور شاعر ہیں۔ وہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔ وہ اول اول ہٹلر کے نیشنل سوشلسٹ انقلاب کے حامی اور پھر ناقد رہے۔ نازی پارٹی کی حکمرانی کے دور سے پہلے اور بعد کی جرمن شاعری پر بین کا بہت اثر رہا۔

ژاں فولیاں (Jean Folian) فرانس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی سوانحی تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

اودیسیوس ایلیتس

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

لاش کا معائنہ

اور انھیں پتا چلا کہ زیتون کے ریشوں کا سنہرا رنگ اس کے دل کی تہہ میں جمع تھا
اور بہت مرتبہ موم بتی کی روشنی میں، صبح کے انتظار میں جاگتے رہنے کی وجہ سے
ایک نامانوس حرارت نے اس کی آنتوں پر گرفت کر لی تھی
اور جلد سے ذرا نیچے، افق کی نیلی لکیر تیکھے پن سے کھنچی ہوئی تھی، اور
اس کے خون میں ہر طرف نیلے رنگ کے بہت زیادہ آثار تھے
پرندوں کی فریادیں، جو اسے سخت تنہائی کے دنوں میں یاد رکھنی پڑی تھیں،
ایسا لگا کہ تمام ایک ساتھ چھلک آئیں، اور اس طرح
نشتر کے لیے گہرا داخل ہونا ناممکن ہو گیا
شاید اس کو برباد کرنے کے لیے سوچنا کافی تھا
جو وہ ہوا — یہ واضح ہے —
وہ بے گناہوں کے لرزا دینے والے انداز میں پڑا ہوا تھا
اس کی پُرغرور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، ایک پورا جنگل
ابھی تک پُتلی کی بے داغ جھلی میں متحرک تھا
مغز میں آسمان کی مردہ بازگشت کے سوا کچھ نہیں نکلا

Scanned with CamScanner

صرف اس کے بائیں کان کے جوف میں ہلکی شفاف ریت،
جیسے گھونگھے کے خول میں ہوتی ہے، موجود تھی
جس کا مطلب ہے کہ وہ اکثر سمندر کے پاس سے، محبت کی تکلیف اور ہواؤں کا شور لیے،
اکیلا گزرا تھا
اور اس کی ناف کے نیچے آگ کے ذرات ثابت کرتے ہیں
وہ وقت کو، کسی عورت کو لپٹانے کے دوران، ہر بار
ساعتوں سے آگے دھکیل دیتا تھا
اس سال ہماری مچھلوں کی فصل وقت سے پہلے تیار ہو جائے گی

ہیلن

ماریا نیفیلی
بلاشبہ ایک تیز لڑکی ہے
مستقبل کے لیے اصلی خطرہ
اپنے بدن پر خون کی بوند کے ساتھ
وہ ایک چاقو کی طرح چمکتی ہے
وہ وہی معنی رکھتی ہے
جو ایلیاد کی لیمبڈا رکھتی تھی

صرف اپنی موجودگی سے
وہ انسانوں کی آدھی نسل ختم کر دیتی ہے

ماریا نیفیلی پاکیزگی کی مخالف سمت میں رہتی ہے
پھر بھی وہ نیک ہے

جب وہ کہتی ہے
''میں اس آدمی کے ساتھ سوؤں گی''
اس کا مطلب ہے وہ ایک بار پھر تاریخ کو ہلاک کرے گی

ابراندوخت

ابراندوخت ہونا کتنا اچھا ہے
اور تمھاری جوتیوں کے لیے رزمیہ لکھنا
کیونکہ ہومر نے تمھاری خوشی یا ناخوشی کی پروانہیں کی

پراگندہ ہوئے بغیر
تم نامقبولیت جمع کرتی ہو
جیسے تم ایک ٹکسال کی مالکہ ہو
جسے تمام کارکنوں کو نکال کر بند کر دو گی
تاکہ تم ایک غربت کاشت کر سکو
جو صرف تمھاری ہو

اس وقت
جب لوگ اپنے دفتروں میں

اپنے ٹیلی فونوں سے دلسوزی کے ساتھ جڑے
لاحاصل کوششوں میں مصروف ہیں

تم محنت میں طلوع ہوتی ہو
تمام گرد آلود، مگر چمنی صاف کرنے والے کی طرح سبک،
پھر محبت سے نیچے اترتی ہو
ایک سفید ساحل کا افتتاح کرنے کے لیے
جو صرف تمھارا ہے

تم بے لباس ہو جاتی ہو، ان کی طرح
جو ستاروں کے بے لباس ہونے پر توجہ دیتے ہیں
اور فراخ حرکت کے ساتھ تیر کر آگے چلی جاتی ہو
تاکہ آزادی سے رہ سکو

❋❋

Scanned with CamScanner

ژاں فولیاں

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

موت

جانور کی ہڈیوں سے
فیکٹری نے وہ بٹن بنائے
جنھوں نے بلاؤز کو
کاریگر لڑکی کی
گرم چھاتیوں پر
بند رکھا

جب وہ گر پڑی
ایک بٹن ٹوٹ کر تاریکی میں چلا گیا
اور سڑک کی نالی
اسے ایک نجی باغ میں لے گئی

جہاں
متبسم اور برہنہ

Scanned with CamScanner

پوموناؔ[1] کا
پلاسٹر کا مجسمہ
پاش پاش ہو گیا

❋❋

---

[1] پومونا: سیبوں کی دیوی

گوٹفریڈ بین

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

لٹل ایسٹر

ڈوب کر مرنے والا ایک ٹرک ڈرائیور
پتھر کی سل پر لٹایا ہوا تھا
کسی نے ایک ارغوانی پھول
اس کے دانتوں کے درمیان پھنسا دیا

زبان اور تالو کو
جلد کے نیچے
سینے سے گزرتی ہوئی
ایک لمبی چھری سے کاٹ کر باہر نکالتے ہوئے
میں نے ضرور اس پھول کو چھوا ہوگا
کیونکہ وہ پھسل کر
قریب پڑے ہوئے مغز میں جا گرا تھا
ٹانکے لگاتے ہوئے
میں نے اسے سینے کے جوف میں

Scanned with CamScanner

نفیس برادے کے ساتھ بھر دیا
ننھے سے پھول
اپنے گلدان میں آرام سے رہنا

❊❊

خالد جاوید

سائے

اب اس شہر کی گلیوں میں وہ پرانے سائے نہیں پڑتے۔ عمارتیں بدل گئی ہیں۔ بہت سی عمارتیں مٹ بھی چکی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں گھروں کے اندر چلی آئی ہیں۔ پرچھائیاں پڑنے کے لیے زمین پر جگہ بھی کم ہوگئی ہے۔ دور دور تک کوئی میدان یا خالی زمین کا ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ اب تو سائے بس خود سے ہی ٹکراتے اور اور اپنی ہی نفی کرتے رہ جاتے ہیں۔

وہ کم سے کم بیس سال بعد اس شہر میں آیا تھا۔

یہ شہر نئے اور پرانے دو خطوں میں تقسیم تھا۔ وہ نئے شہر میں ایک دوست کی شادی میں شرکت کے بعد واپس آرہا تھا۔ اپنے بچپن کے اس شہر کو ایک بار پھر سے اسی پرانے انداز سے محسوس کرنے کی خاطر وہ پیدل ہی چل نکلا۔ راستہ خاصا طویل اور پیچ دار گلیوں، چوراہوں اور تنگ اور چوڑی سڑکوں سے گزرتا تھا مگر آسمان تاروں سے روشن تھا۔

وہ آہستہ آہستہ نہیں چل رہا تھا؛ ہمیشہ کی طرح تیز تیز چل رہا تھا، زیادہ تر زمین پر اپنی بے تکی پرچھائیں کو دیکھتا اور اسی سے محظوظ ہوتا ہوا۔

فروری کا ہر دن اکتا دینے کی حد تک دوسرے دن کا ہم شکل ہے۔ اگر تم فروری کے مہینے میں دوپہر میں اس طرح پیدل چلتے ہو تو سارا منظر بہت اجڑا ہوا نظر آتا ہے۔ درختوں سے گرے ہوئے پتے قدموں کے نیچے آجاتے ہیں۔ دوپہر کی تیز ہوا کے جھکڑوں میں اِدھر اُدھر اکٹھا ہو کر ڈھیر بناتے ہوئے۔ تم جدھر بھی جاؤ تمھارے بس میں کچھ بھی نہیں رہتا، سوائے اس کے کہ خشک اور وحشی ہوا کے

Scanned with CamScanner

جھکڑوں میں اپنے پھٹتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ان سوکھے پتوں کو دیکھتے رہو۔

فروری کا موسم دراصل کوئی موسم نہیں ہے۔ یہ ایک دن کی پرچھائیں کو لگا تار کئی دن دیکھتے رہنے جیسا ہے۔ یہ ہر موسم کا متضاد ہے۔ مماثلت کے اتنے مایوس کن پہلوان دنوں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مگر یہ رات تھی، جب دوپہر کی ہوا تھک کر گٹھڑی بنی کہیں سو رہی تھی۔ مگر پھر بھی رات کی اپنی ہوا تھی اور وہ چل رہی تھی۔

تاروں بھری رات میں ایک جگہ اس نے ریل کی پٹڑی کو پار کیا... اچانک بجلی چلی گئی۔ بجلی کی آنکھ مچولیاں اس شہر میں عام تھیں۔ وہ ایک پل کو ٹھہرا، مگر نئے شہر سے پرانے شہر کا راستہ اسے زبانی یاد تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک سگریٹ سلگاؤں، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب اس نے قدرے پاؤں جما جما کر چلنا شروع کیا۔

سرمے والی گلی آ رہی تھی۔

یہ شہر جن تین باتوں کے لیے دور دور مشہور ہے، ان میں سے ایک یہاں کا سرمہ ہے۔ خود یہاں کے لوگوں میں بھی سرمہ لگانے کا چلن جنون کی حد تک پایا جاتا ہے۔ سرمہ لگانے کے کچھ اوقات بھی مقرر ہیں، مثلاً رات کو سونے سے پہلے یا پھر صبح کو اٹھنے پر۔ پہلی نظر میں گمان گزرتا ہے جیسے یہاں کا ہر شخص ہر وقت آنکھوں میں سرمہ لگائے گھومتا پھر رہا ہو۔ ویسے آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے لوگوں میں زیادہ تعداد یا تو بوڑھے لوگوں کی ہے یا پھر چھوٹے چھوٹے بچوں کی۔

بوڑھوں کی جھریوں بھرے بگڑے چہروں اور پوپلے منھ پر ان کی بے نور، سکڑی ہوئی، سرمہ لگی ہوئی، سلیٹی آنکھیں دیکھنے والوں کو وحشت زدہ کرتی ہیں۔ سرمہ لگانے سے ان آنکھوں کی مایوسی اور بے چارگی کسی مکھی کی طرح ٹھیک ان کے ناک کے بانسے پر آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایسے میں سرمہ لگی ہوئی، اپنی موت کا انتظار کرتی، دھواں بھری، یہ بوڑھی آنکھیں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتیں کہ جن چیزوں پر ٹکی ہوئی ہیں انھیں اور بھی زیادہ مضحکہ خیز یا قابلِ رحم بنا دیں۔ شہر میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

پھر شیر خوار بچے ہیں۔ عورتوں کی گود میں لیٹے یا سوتے ان بچوں کی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا ہر

Scanned with CamScanner

وقت دیکھا جاسکتا ہے، جس کی وجہ سے ان شیر خوار بچوں کی آنکھوں میں دنیا کو نہ سمجھ پانے کا جذبہ پوری طرح عریاں ہو جاتا ہے۔ یہ حیرت اور کبھی کبھی خوف یا تکلیف کے باعث پھٹی پھٹی آنکھیں ہیں، اگر چہ کچھ لوگ انھیں خوب صورت آنکھوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جن کی خوبصورتی میں زیادہ اضافہ پتھر کے سرمے نے ہی کیا ہے۔

مگر سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ سرمے سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار یہاں کے زنخے بھی کرتے ہیں۔ عورتوں کا لباس پہنے یہ ہیجڑے آنکھوں میں سرمہ لگائے اس شہر کی گلیوں میں تمھیں فحش اور گندے اشارے کرتے ہوئے تقریباً ہر وقت مل سکتے ہیں۔ غلیظ اشارے کرتی، سرمہ لگی ہوئی، دراصل ان کی یہ مردانہ آنکھیں ہی ہیں جو ان کی تمام بناوٹی نسوانیت کو مسخ کر کے انھیں انسان نہیں بلکہ اس کے سائے میں بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ تمھیں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ اگر وہ کہیں اکیلے میں تمھیں گھیر لیں تو تمھیں اپنا سارا مال و اسباب ان کے حوالے کرنا ہوگا، بلکہ کبھی کبھی اپنی مردانگی اور شجاعت بھی۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہ ہیجڑے سرمہ لگی بے حس آنکھوں سے تمھیں گھورتے ہوئے اور فحش حرکات کرتے ہوئے تمھارے سینے میں خنجر اتار دیں۔ یہ سب زنخے اپنے پاس بڑے بڑے چاقو رکھتے ہیں۔

سرمے والی گلی سے پار ہو جانے کے بعد اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ افسردہ ہو رہا ہے۔ مگر کیوں؟ اس کی وجہ وہ نہ جان سکا، سوائے اس کے کہ اسے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ دراصل جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا، وہ بہت کم تھا۔ وہ بس ایک سوانگ، ایک تماشے کی طرح تھا۔ بلکہ سوانگ تو کہیں اور ہو رہا تھا؟ یہ سوانگ کی بھی نقل تھی۔ صرف سوانگ بھرتے ہوئے کرداروں کی الٹی سیدھی پرچھائیاں چاروں طرف پڑ رہی تھیں۔ کسی سیاہ، نہ دکھائی دینے والے مادے نے، ایک وحشت ناک طاقت نے، تمام کائنات کی اشیا کو نہ جانے کہاں سے کہاں ڈھکیل دیا ہے۔ زندگی اور موت کو بھی۔ بس صرف سائے رہ گئے ہیں۔ یہاں وہاں اٹکے ہوئے، اپنی حیثیت کو قابلِ رحم حد تک مضحکہ خیز بناتے ہوئے سائے۔

پھر اصل زندگی کہاں تھی؟

اور اصل موت؟ موت کی پرچھائیں کا زاویہ کیا تھا اور اس کے پڑنے کے امکان کہاں تھے؟

Scanned with CamScanner

حالانکہ موت نے اپنے آپ کو سات پردوں میں پوشیدہ کر رکھا تھا، پھر بھی اس کی چھوٹ کہیں تو پڑ رہی ہوگی، چاہے وہ اس وسیع وعریض زمین پر ایک بونے جوکر کی پرچھائیں کی طرح ہی کیوں نہ ہو۔

وہ جس راستے سے گزر رہا تھا، اس راستے میں پاگل خانہ نہیں پڑتا، نہ ہی اس کی اونچی، سیاہ مہیب دیوار ہی نظر آتی ہے۔ اس نے سوچا، اس شہر کے مشہور ہونے کی دوسری بڑی وجہ یہاں کا پاگل خانہ ہے۔ اس پاگل خانے کی دیوار کے ایک حصے کا سایہ قبرستان میں پڑتا ہے۔ جب کبھی رات گئے کوئی جنازہ گیس کی لالٹینوں کے ساتھ قبرستان میں داخل ہوتا ہے تو پاگل خانے کی دیوار کا یہ حصہ روشن ہو جاتا ہے اور جنازے اور اس کے ساتھ آئے ہوئے افراد کے سائے اس پر عجیب انداز سے پڑتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

پاگل خانے کے ایک طرف کی دیوار دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ اکثر یہاں قتل کی وارداتیں ہوئی ہیں یا لاوارث لاشیں یہاں پھینک دی گئی ہیں، کچھ اس طرح کہ وہ دلدل اور پاگل خانے کی دیوار کے درمیان ہی پھنس کر رہ گئی ہیں۔ پاگل خانے کی دیوار کے اس طرف والی دلدل کو کبھی ہٹایا نہ جا سکا۔

مگر اب پتا نہیں وہاں کیا کیا بدل گیا ہوگا، اس نے سوچا۔ نہ جانے اس کی دیوار کے سائے کہاں پڑ رہے ہوں گے۔ مگر یہ بھی تو وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پڑ ہی رہے ہوں گے، اس نے مایوسی کے ساتھ سوچا۔

اسے اپنے بچپن کا وہ ساتھی بے تحاشا یاد آنے لگا۔

وہ دونوں قلعے کی ندی میں امام حسین کی فاتحہ کی فیرنی کے خالی مٹی کے پیالے بہانے گئے تھے۔ جہاں کنارے پر پہنچ کر اس نے پانی میں پیالے بہائے تھے، وہاں ایک بڑا سا گھنا پاکڑ کا درخت تھا جس کا سایہ اجلے پانی کو بے وجہ کالا بنائے دے رہا تھا۔

جب وہ پیالے بہا کر واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک جگہ بیل اتاری جا رہی تھی، بیل جو محرم کے جلوس کے لیے لگائی گئی تھی۔ وہ ایک جھالر کے نیچے سے اترے۔ اچانک جھالر کی رسی جھول کر اس کے ساتھی کے گلے میں پھنس گئی۔ وہ زمین پر جا گرا اور پھر سخت پتھریلی سڑک پر دور تک رگڑتا اور گھسٹتا ہوا چلا گیا۔ کسی معجزے نے اسے بچا لیا تھا ' محرم سے لے کر چہلم تک بڑی سختی کے دن ہوتے

ہیں،''امی کہا کرتی تھی۔

جوان ہو کر اس ۔ بچپن کے ساتھی کا دماغی توازن بگڑ گیا۔اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوشش کی، پھر خود کو بھی ختم کرنا چاہا۔ کہتے تھے کہ وہ رات میں اکثر اپنی بیوی کے سائے کو گھر سے باہر جاتے دیکھتا تھا۔

اب وہ نہ جانے کتنے برس سے پاگل خانے کی اسی مہیب دیوار کے پیچھے ہے۔وہی دیوار جس کا سایہ نہ جانے کہاں پڑ رہا ہوگا۔

بے اختیار اسے راستے میں پاگل خانے کے نہ پڑنے کا افسوس ہوا۔

شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے اس نے بھی چھچھورے پن کا ثبوت دیتے ہوئے گلے میں ٹائی باندھ رکھی تھی۔اب اچانک اس کی گرہ سے اسے اپنا دم سا گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

بجلی آئی۔سڑکیں پھر روشن ہو گئیں۔اکا دُکا لوگ اپنے ہاتھوں میں بکروں کی رسیاں تھامے گزر رہے تھے۔

کل بقر عید ہے، اسے یاد تھا۔اسے پتا نہیں کیا کیا یاد تھا۔گزرے ہوئے وقت کو بے تکے بچکانہ منظروں میں یاد رکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا، اور اس میں کسی قسم کے تاریخی شعور کی کارفرمائی رتی برابر بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے سے شہر کے مشہور ہونے کی تیسری اور آخری وجہ یہاں کی محرم داری ہے، جو انوکھی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد معنی خیز بھی ہے۔

جیسا کہ اس نے ہمیشہ محسوس کیا، اس شہر میں دیواریں ہی دیواریں تھیں۔یا صرف ایک ہی دیوار تھی اور جگہ جگہ اس کے سائے پڑتے رہتے تھے۔جب محرم کی نو تاریخ آتی ہے تو دیواروں سے نکال کر تعزیے کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ان تعزیوں کو یہاں ''تخت'' کہا جاتا ہے۔یہ تخت دراصل لکڑی کی بنائی ہوئی شہدائے کربلا کی قبریں یا ضریحیں ہیں۔ان تختوں کو ماتمی باجوں کے ساتھ جلوس کی شکل میں یا تو کندھوں پر اٹھا کر یا بڑے بڑے ٹھیلوں پر رکھ کر سارے شہر میں گشت کرایا جاتا ۔۔یہ

تخت ہار پھولوں سے سجے ہوتے ہیں۔ گشت کے وقت ماتمی باجوں کے درمیان ''دولھا، دولھا'' کا نعرہ بھی سنائی دیتا ہے۔

یہ تخت زیادہ تر شہر کے غریب اور کاریگروں کے نچلے طبقے نے تیار کیے ہیں اور انھیں کے نام سے مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر ''بڑھئیوں کا تخت''، ''راجوں کا تخت''، ''بہشتیوں کا تخت''، ''دھوبیوں کا تخت''، ''جوگیوں کا تخت''، وغیرہ وغیرہ۔

ان تختوں کی اقلیدس میں مقبرے کے سے گنبد اور محراب کا سا تاثر تو مشترک ہے لیکن بعض خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے اپنے پیشے اور طبقے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ان کی اپنی کاریگری اور اپنا اپنا نقشہ ہے جس میں ان کے اپنے طبقاتی ہنر کی پوری پوری جھلک نظر آتی ہے۔ یہی ان تختوں کا انفرادی پہلو ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اگر ایک بار کوئی عقیدت کے ساتھ تخت بنا کر اٹھاتا ہے تو پھر ہر سال محرم کی پہلی تاریخ سے لے کر آٹھ کے درمیان اسے تمام زندگی ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ وہ فاقے کر سکتے ہیں مگر ایک بار تخت اٹھا لینے کے بعد اس سلسلے کو روک نہیں سکتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر پھر سے تخت نہ اٹھایا جائے تو ان پر بھاری عذاب پڑ سکتا ہے۔

تخت سازی میں ایک قسم کا ارتقا بھی نظر آتا ہے۔ کوئی شخص بہت چھوٹی سی شکل یا ساخت کا تخت بنانا شروع کرتا ہے، پھر ہر سال محرم میں وہ اس کے حجم میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے اور تخت کی شان وشوکت بڑھتی رہتی ہے۔ اس طرح بعض تخت بہت لمبے چوڑے، اونچے اور شاندار ہو گئے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ ایسے ہی ایک بہت اونچے اور پُر جلال تخت کا اوپری سرا اس نے اپنے گھر کی دیوار سے بھی اونچا نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ 'ہڈی والوں' کا تخت تھا۔

یقیناً وہ تختی کے دن تھے۔ اسے چھوٹی چیچک نکل آئی تھی۔ وہ ہر وقت بخار میں جلتا ہوا، دور سے تختوں کے ساتھ بجنے والا نقارہ اور باجوں کا ماتم سنا کرتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ ان دنوں کوئی تخت اس کی گلی سے نہیں گزرتا تھا۔

وہ بار بار گھبرا کر امی سے پوچھا کرتا:

''کیا تخت آرہا ہے؟''

''نہیں، لیکن وہ آئے گا۔ 'ہڈی والوں' کا تخت ہمارے گھر کے سامنے ضرور آئے گا۔''

Scanned with CamScanner

وہ مایوس ہو کر پھر سے دور بجتے ماتم کو سننے لگتا اور بخار اس کے جسم کو شعلوں کی پرت میں لپیٹ لیتا۔

'ہڈی والے' اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں رہتے تھے۔ ان کا مکان دیکھنے میں خستہ حال تھا، جس کے دروازے سے لے کر صحن تک سوکھی ہوئی ہڈیاں، شیشے کی بوتلیں، ٹین کے ڈبے، کاغذ کی ردّی، کوڑا کرکٹ اور نہ جانے کیا کیا کباڑ اور الا بلا پھیلے رہتے تھے۔ ان کے گھر کے سامنے سے گزرنے پر ہمیشہ ناک پر کپڑا رکھنا پڑ جاتا تھا۔ مگر لوگ کہتے تھے کہ ان کے پاس بے شمار دولت ہے۔ کبھی کبھی ان کے دروازے کے سامنے ٹرک آ کر رکتا۔ اس میں ہڈیوں سے بھری بوریاں لادی جاتیں۔ اسے بچپن میں ہڈیوں سے بالکل دہشت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ بہت گھریلو قسم کی اشیا تھیں جنھیں وہ صبح سے شام تک اپنے دسترخوان پر پالتو بلیوں کے سامنے یا پھر کوڑے دان میں پڑے دیکھتا ہی رہتا تھا۔ لیکن ہڈیوں کے پنجر سے اسے ہمیشہ دہشت محسوس ہوئی۔ اس امر کا علم تو اسے اب ہوا ہے کہ جب ہڈیوں کا پنجر چونا بن کر مٹی میں بدلتا جاتا ہے تو دہشت وہاں سے چپ چاپ اٹھ جاتی ہے، اپنے مسکن کو چھوڑ کر۔ وہ اِدھر اُدھر بے وجہ بھٹکتی پھرتی ہے۔

مگر 'ہڈی والوں' کا تخت بہت شاندار تھا۔

اور پھر ایک دن وہ واقعی آیا۔ وہی لمبا، اونچا، پرشکوہ اور پُر جلال تخت، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب بھی اٹھایا جاتا ہے تو شہر میں فساد پھیل جاتا ہے، خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ محرم کی آٹھ تاریخ کو اس کی اوپری محراب کی لکڑی سے خون رسنے لگتا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے آسمان تک خون کی سرخی پھیل جاتی ہے۔

'ہڈی والوں' کا تخت اس کی گلی سے گزرنے لگا۔ آدھی رات تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس تخت کا باجا بہت زوردار ہوا کرتا تھا۔ اس کی ماتمی دھنوں اور نقاروں کی چوبوں سے زلزلہ آ گیا تھا۔ زمین و آسمان جیسے ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''کیا تخت آ گیا؟'' اس نے چلا کر پوچھا۔

''ہاں، تخت آ گیا، مگر تم اٹھنا نہیں۔ ورنہ بخار نہیں اترے گا۔''

اور تب یوں ہی آنگن میں لیٹے لیٹے اس نے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

گیس کے ہنڈے سے گلی روشن ہوگئی تھی۔ تخت کا اوپری سرا اس کی دیوار سے اونچا نکلتا ہوا گزر رہا تھا۔ آگے آگے آسمان کو چھوتا ایک سرخ رنگ کا علم بھی چل رہا تھا۔ گیس کے ہنڈوں کی روشنی رینگ رہی تھی۔ اس روشنی کے رینگنے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کون سے سائے اس کے گھر کی دیوار اور چھت پر اتر آئے۔ پھر 'ہڈی والوں' کا تخت گلی سے دور چلا گیا۔ دور ہوتے ہوئے ماتمی باجوں کی دھنیں بھی سایوں میں بدل کر تحلیل ہوگئیں۔ وہ دہشت زدہ ہوگیا۔ بخار سے اس کا سر گھومنے لگا۔ گلی تاریک پڑی تھی۔ آنگن میں پھر آدھی رات آ کر بیٹھ گئی۔

''چلو اب تو خاصی دور آ گیا،'' اس نے چلتے چلتے خیال کیا۔

لیکن کیا اب محرم کے علاوہ سوچنے کو یا افسردہ ہونے کو باقی کچھ نہیں بچا؟ کل بقرعید بھی ہے۔ بقرعید اور محرم کے درمیان ایک زمانی ترتیب تو ہے ہی، لیکن کیا بقرعید کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا جا سکتا؟ اسے ایک پل کو احساسِ جرم ہوا اور اس نے اپنے ذہن میں سورۂ بقرہ کے کچھ حصوں کو دہرانے کی ناکام کوشش شروع کر دی۔

مگر یہ سوال اپنی جگہ پھر بھی اسے پریشان کر رہا تھا کہ بقرعید اور محرم میں، اس کے لاشعور میں آخر قدرِ مشترک کیا تھی؟

اب اگر وہ ذہن پر بہت زور ڈالے تو اتنا ضرور یاد آ جائے گا کہ وہ چیچک جو اس کے نکلی تھی وہ خاص بقرعید کے ایک دن پہلے ہی ظہور میں آئی تھی، اور محرم کی تیرہ تاریخ کو اس نے غسل کیا تھا۔ حافظے کا بجھا ہوا شعلہ اسی طرح توانی روشنی آگے والے سالمے کو سپرد کرتا ہے۔

یا پھر ایک اور واقعہ، جب وہ بقرعید کے موقع پر گوشت لے کر کسی کے گھر جا رہا تھا۔ وہ جس سڑک سے گزر رہا تھا، اس کے دونوں جانب دوسرے فرقے کے لوگ آباد ہیں۔ اچانک پیچھے سے آتی ہوئی ایک موٹر سائیکل نے اسے ٹکر مار دی۔ وہ سڑک پر چاروں خانے چت گر پڑا۔ سامنے کالی کے منھ پر گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ شام ہو رہی تھی۔ اخبار میں لپٹے ہوئے سرخ تازہ گوشت کی بوٹیاں پوری طرح سڑک پر پھیل گئیں۔ اس کے شانے اور پنڈلی سے بہتے ہوئے خون نے کولتار کی سڑک پر جم کر ایک بڑا سا دھبہ بنا لیا۔ پنڈلی پر گھٹنے کے نیچے سفید سفید ہڈی جھانک رہی تھی۔ خطرناک چوٹ تھی۔

Scanned with CamScanner

محرم کا وہ پورا مہینہ بڑی سختی میں گزرا۔

''اور کیا ہو سکتا ہے؟'' اس نے پھر دماغ پر زور دیا۔

پھر تو بس خون کی ایک لکیر تھی جو ذہن میں ابھرتی تھی۔ ایک لکیر جو بڑھ کر لمبی اور گاڑھی ہوتی جاتی تھی۔ ایک نالی، پھر ایک نہر کی طرح... آہستہ آہستہ سیاہی مائل ہوتی ہوئی، ذہن سے باہر آ کر کہیں بالکل آس پاس ہی کھو جاتی تھی۔ ایک دبے ہوئے احساسِ جرم کی طرح، یا ایک کبھی نہ کیے جاسکنے والے ماتم کی طرح۔

وہ یوں ہی سر جھکائے چلتا رہا۔

تو کل بقرعید بھی ہو جائے گی۔ پھر محرم آئے گا۔

اس کے گھر کے دروازے کے باہر بھی دو بکرے رسّی سے بندھے ہوئے ہیں۔ گھر میں دو خونخوار قسم کے جرمن شیپرڈ السیشین کتے بھی موجود ہیں۔ رات گئے جب بکروں کو دروازے کے اندر لا کر دونوں طرف سے کواڑ بند کر دیے جاتے ہیں تو یہ کتے آنگن میں آزاد کر دیے جاتے ہیں۔

اس کے برابر سے دو راہ گیر دنیا کے تازہ ترین نامساعد حالات پر سیاسی تبصرہ کرتے ہوئے گزر گئے۔

''تو بکرے باندھے جا رہے ہیں اور کتے کھولے جا رہے ہیں،'' اس نے پُر معنی انداز میں سوچنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اسے اس انداز میں سوچنے کا کبھی سلیقہ ہی نہیں رہا۔

کل نالیوں میں خون بہے گا۔ مگر صبح کے وقتِ قربانی سے پہلے جانور کو خوب نہلایا دھلایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی آنکھوں میں سرمہ بھی لگا دیا جاتا ہے۔ ماتھے پر مہندی سجائی جاتی ہے اور گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار ڈال دیا جاتا ہے۔ اس وقت وہ بالکل ایک سجے سجائے، شادی کے لیے جاتے ہوئے دولھا کی طرح نظر آتا ہے۔ اس کے گلے میں سخت، سیاہ اور موٹی سی رسّی بھی خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ تب بچے اسے گرم گرم جلیبی کھلاتے ہیں۔

کتے کہیں بکروں پر بھونک نہ رہے ہوں، اسے اندیشہ ہوا۔ قربانی کے جانور کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خونخوار کتوں کے بھونکنے سے بکروں کا نازک اور معصوم دل دہل کر رہ جائے۔ ورنہ بڑا عذاب پڑے گا۔ اصل میں ان چیزوں کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

Scanned with CamScanner

کل نالیوں میں خون بہے گا۔ خون کا تعلق کائنات کے ہر واقعے، ہر شے سے ہے، اگرچہ ایثار اور قربانی کائنات کو الوداع کہہ چکے ہیں مگر ان کی پرچھائیاں یہیں ساکت و جامد ٹھہر گئی ہیں اور خون کی لکیر ان سے رِستی ہی رہتی ہے۔

خون کا تعلق محرم سے ہے۔

وہ بچپن میں محرم کی نو تاریخ کو شہر کی گلیوں میں تخت دیکھنے کے لیے بڑے چچا کی انگلی تھامے بھٹکا کرتا تھا۔

کتنی دیواریں تھیں اس شہر میں۔ یا شاید ایک ہی دیوار تھی جس کا سایہ کبھی یہاں کبھی وہاں پڑتا رہتا تھا۔

دیواروں کے ان سایوں سے سجے سجائے افسردہ تخت لگے کھڑے تھے۔ دیواروں کے ان سایوں سے پیاس ابھرتی تھی اور ریت گرتی تھی۔ اسے ہمیشہ ان دیواروں کی تلاش رہی جن کے یہ سائے تھے۔

اس کے آبائی مکان کی چھت پر ایک ہلتی ہوئی خستہ حال کنکریا اینٹوں کی چہار دیواری تھی۔ اس چہار دیواری پر اچک کر دیکھنے پر دور سامنے کھیت نظر آتے تھے۔ وہاں ایک کنواں تھا جس کی منڈیر پر اُپلے ہی اُپلے پٹے پڑے تھے۔ کنواں نہ جانے کب سے پانی سے خالی تھا۔ اس میں اب صرف مرے ہوئے لاوارث کتوں اور بلیوں کی لاشیں یا ان کے پنجر ہی تھے۔

اسے یاد نہیں کہ کنویں کے سامنے سے جو ایک تخت اٹھایا جاتا تھا اس کا نام کیا تھا۔ چھوٹا سا تخت تھا، کسی غریب آدمی کا تخت۔ اس تخت کے ساتھ صرف ایک شخص ماتمی باجا بجاتے ہوئے چلتا تھا، کچھ گیس کے ہنڈے تھے۔ باجے کی ماتمی آوازیں ہوا کے دوش پر اس کی چھت کی چہار دیواری سے ٹکراتی تھیں۔ لیکن اسے جو اچھی طرح یاد رہ گیا ہے، وہ تخت کے پیچھے بلکہ گیس کے ہنڈوں کے بھی پیچھے بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ایک بوڑھا خوانچے والا تھا۔ وہ خوانچے والا، اپنے تھال کو کاندھے پر اٹھائے، روشنی سے پیچھے چلتا تھا۔ اس کے خوانچے پر مٹی کے تیل کی ایک ڈبیا ٹمٹماتی رہتی تھی۔ وہ کیا بیچتا تھا، اب یہ اسے بالکل یاد نہیں۔

جب وہ تھوڑا اور بڑا ہو گیا تو دن میں کنویں کے پاس تخت دیکھنے جانے لگا تھا۔ اُپلوں کے اسی

ڈھیر والے کنویں کے پاس ہی رشن باجی کا مکان تھا۔ رشن باجی کے مکان میں کھجور کا ایک درخت تھا۔ کھجور کے درخت کے پتوں پر الٹے پیروں والی ایک چڑیل رہتی تھی۔ رشن باجی پر اس چڑیل کا سایہ ہو گیا تھا۔ ان کے جسم سے خون غائب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پیلی پڑتی جا رہی تھیں۔ ایک بار جب وہ کنویں کے پاس کھڑا تخت دیکھ رہا تھا تو رشن باجی نے اسے گھر میں بلا لیا۔

مٹی کے چولھے میں اُپلے سلگ رہے تھے۔ میلی سی المونیم کی پتیلی میں چائے کھول رہی تھی۔ وہ رشن باجی کے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اسے عجیب نظروں سے گھور رہی تھیں۔

''تو بہت نیک لڑکا ہے،'' انھوں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، پھر جھک کر اس کا گال کاٹ لیا۔

وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگا تھا۔ کھجور کے درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر ایک پائل بجے جا رہی تھی — چھم چھم، چھم چھم۔

تخت کے ماتمی باجے نے اسے اور بھی بدحواس کیا۔

رشن باجی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ پیلی ہو ہو کر مر گئیں۔ وہ ان سے پھر کبھی نہیں ملا تھا۔ ان کی موت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ بس مرنے سے کچھ دن پہلے ان کا فون آیا تھا۔

''آنا، کبھی گھر آنا،'' ایک ادھیڑ عمر کی کانپتی آواز نے کہا تھا۔

رشن باجی کے یہاں فون لگ گیا تھا اور کھجور کا درخت کاٹ دیا گیا تھا۔ ''چھم چھم، چھم چھم۔''

اچانک بجلی پھر گل ہو گئی۔ آس پاس بالکل اندھیرا ہو گیا مگر وہ رکا نہیں۔ سر پر تاروں بھری رات تھی۔ اس نے خود کو اب اور زیادہ اداس محسوس کیا۔ اداسی نشے کی طرح بڑھ رہی تھی۔ اب اسے اور بہت کچھ یاد آتا جائے گا۔

وہ بھی تو شاید محرم کے ہی دن تھے جب اس نے معمول سے کچھ زیادہ لمبی اور دبلی پتلی لڑکی کو سنہری جلد والی ایک کتاب تحفتاً پیش کی تھی۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر اس نے اپنے خون سے لڑکی کا

نام لکھا تھا۔

''پھر وہی خون،'' اس نے تاسف کے ساتھ سوچا۔

مگر وہ ایک نیک خون تھا۔ ساتھ ہی بچکانہ بھی۔

''تم بہت نیک انسان ہو،'' کتاب پر خون سے لکھے ہوئے اپنے نام کو پڑھتے ہوئے وہ زور سے ہنس کر بولی۔

وہ لمبی اور دبلی پتلی لڑکی بہت زور زور سے ہنسی تھی اور ہر بات پر ہنستی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی۔ محلے کے لوگ نہ جانے کیوں اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ اسے اکثر بتایا کرتی تھی کہ وہ تقریباً ہر رات ایک خواب دیکھتی تھی جس میں اس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ ہوتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ جاگنے پر اس کی گود اور دونوں ہاتھ بے حد گرم ہوتے تھے، جیسے ابھی ابھی ان ہاتھوں نے کسی بچے کو خود سے الگ کیا ہو۔

وہ اسے اکثر یہ بھی بتاتی کہ اگر اس کے بچہ پیدا ہوا تو وہ اسے امام حسین کی منت کا فقیر بنا دے گی۔ پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔

اس لمبی لڑکی کو اس نے ہمیشہ زرق برق کپڑوں میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے پتلے پتلے ہاتھوں میں بھر بھر کر ہری چوڑیاں پہنتی تھی۔ اس کے کانوں میں ہمیشہ بہت بڑے بڑے آویزے ہوتے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی عورت کو اتنے بڑے آویزے پہنے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ان زرق برق کپڑوں کے نیچے دبلی پتلی کمزور ہڈیاں، پسلیاں، قابلِ رحم حد تک بے تکی شگاف زدہ ناک اور مامتا کے دودھ کے اترنے کے انتظار میں کھردرے شہوانی ہاتھوں سے خود کو نچواتے ہوئے، تل تل بوڑھے ہوتے ہوئے پستان تھے۔

وہ بہت نیک تھا مگر انفرادی نیکی سے کیا ہوتا ہے؟ انفرادی طور سے تو ایک شیطان، ایک بھوت بھی نیک ہو سکتا ہے۔ ایک بھوت کی خود تحفظی سے مالا مال نیکی دنیا کو کیسے بدل سکتی تھی؟

اور ایک دن اس نے اس سنہری جلد والی کتاب کو جس پر نیک خون سے اس کا نام لکھا تھا، اٹھا کر سینے سے لگایا اور بڑی خاموشی کے ساتھ (خاموشی؟ کیونکہ وہ ہنس رہی تھی) کسی انجانے کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہری ہری چوڑیوں سے بھرے پتلے پتلے

Scanned with CamScanner

ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے جو ایک خواب سے جاگنے پر ہمیشہ گرم رہتے تھے اور وہ تمام عمر نہ دیوار کو تلاش کر سکا، نہ اس پر پڑنے والے، لمبی لڑکی کے لمبے سائے کو۔

تو وہ یہ سب کچھ سوچ ہی کیوں رہا تھا؟ شاید وہ اور زیادہ اداس ہونا چاہتا تھا۔ شاید وہ اور زیادہ نیک بننا چاہتا تھا۔ نیکی اور اداسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

لہٰذا وہ اور اداس ہوتے ہوئے آگے چلا۔

سامنے سے سڑک گھومتی تھی۔ اسے اس سمت جانا تھا۔ لاش گھر کی دیوار سے لگے لگے آگے بڑھنا تھا۔ یہاں پر پوسٹ مارٹم کے لیے مردے لائے جاتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جن کو کسی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا۔ سفید چادروں میں سلی ہوئی گول گول گھڑیاں خاصی تاریکی میں بھی چمک رہی تھیں۔ یہاں کوئی رویا سسک نہیں رہا تھا۔ یہ رونے سسکنے یا بین کرنے کے دونوں کناروں کے بیچ کی جگہ تھی۔ بنجر، سوکھی اور غم کے ہر امکان سے خالی۔

موت کبھی کبھی سرک کر ایک جگہ کچھ زیادہ اکٹھی ہو جاتی ہے۔ موت کا حجم وہاں کچھ زیادہ بھاری اور نمایاں تھا۔

اسے لاش گھر کی دیوار کچھ سامنے کو جھکتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ ایک سگریٹ سلگائے، لیکن اچانک بجلی آ گئی اور اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، ایک بار پھر۔

اسے تو ابھی محرم کے بارے میں اور سوچنا تھا۔ اس شہر کی محرم داری بڑی انوکھی ہوتی ہے۔ وہ بچپن میں محرم کی نو تاریخ کو رات میں بڑے چچا کی انگلی تھامے، شہر کی گلیوں میں تخت دیکھنے کے لیے بھٹکا کرتا تھا۔

دیواروں کے ساتھ ٹکا کر تخت کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ اب شہر میں ان کا گشت نہیں ہوگا۔ کل یومِ عاشورہ کو دوپہر میں انھیں سفید چادر سے پوری طرح لپیٹ کر، کاندھوں پر یا ٹھیلوں پر اٹھا کر شہر سے دور، قلعے کی ندی کے کنارے کربلا کے میدان میں لے جایا جائے گا۔ یہ میدان دراصل کربلائے معلیٰ کی ڈمی ہے جسے یہاں کے لوگوں نے اپنی عقیدت کے مطابق بے حد تن دہی، لگن اور زندہ تخیل کے ساتھ تیار کیا ہے۔ سفید چادر سے ڈھک کر کربلا کے میدان لے جائے جاتے ان تختوں کے ساتھ اب کوئی ماتمی باجا نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

مگر یہ تو تاریخ ہے۔

شہر کی گلیوں، چوراہوں پر تخت سجے کھڑے ہیں۔ ان کے چاروں طرف بجلی کے بے شمار قمقمے روشن ہیں۔ جگہ جگہ پانی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ ہر تخت کے برابر ایک سبیل لگی ہے۔ بلیوں سے ایک اونچی مچان بنا کر اس پر ہری گھاس اور پتیاں بچھادی گئی ہیں۔ اس مچان پر بیٹھ کر دو تین شخص آنے جانے والے بے شمار لوگوں کو دودھ کا شربت تقسیم کر رہے ہیں۔ لوگوں کی ایک بھیڑ، ایک ریلا آتا ہے، بڑی عقیدت کے ساتھ تخت کا نظارہ کرتا ہے، شربت پیتا ہے، پھر آگے بڑھ جاتا ہے، کسی دوسری گلی میں کسی دوسرے تخت کو دیکھنے کے لیے۔

مگر شہر کی وہ گلیاں سنسان ہیں جن میں کوئی تخت نہیں ہے۔ اگرچہ ان گلیوں میں بھی کبھی کبھی اتفاق سے کسی گھر کی چوکھٹ پر ایک چھوٹا سا تخت رکھا ہوا مل جاتا ہے۔ ہلکے سے مٹیالے بلب یا موم بتی کی روشنی میں کوئی کمزور، بوڑھا، غریب آدمی اپنے چھوٹے سے معمولی تخت کے پاس بیٹھا تھکی تھکی نظروں سے گلی کے موڑ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دھندلی مٹیالی روشنی میں اس کا ہیولہ کانپتا نظر آتا ہے۔

نہیں، یہاں کوئی سبیل نہیں ہے۔

تمام رات ان تختوں پر اگربتی سلگا کر حلوے پر نیاز دی جاتی۔ مدھم آواز میں شہدائے کربلا کے مرثیے پڑھے جا رہے ہوتے۔ مگر ایک بات جو وہ شدت سے محسوس کرتا، وہ یہ تھی کہ کسی کسی تخت پر تو بے حد رونق ہوتی اور کہیں بہت ویرانی۔ وہ اس ویرانی سے گھبرا کر بڑے چچا کا ہاتھ زور سے پکڑ لیتا۔

یہ پورا شہر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ نیا شہر اور پرانا شہر۔ پرانے شہر میں کنکریاں اینٹوں کی بے شمار پرانی حویلیاں تھیں۔ اگر مدھم روشنی ہوتی تو ان حویلیوں کے سال خوردہ برجوں کے سائے ڈراؤنے انداز میں زمین پر پڑا کرتے۔ وہ ان سایوں کو سمجھ نہ پاتا اور خوف زدہ ہو کر راستے میں ہی رک جاتا۔

''یہ کیسی پرچھائیں ہے؟'' اس نے ڈرتے ہوئے سوال کیا۔

دور سڑک پر ہاتھی کی سونڈ کی طرح کچھ ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''وہ... وہ جلی کوٹھی کا آدھ جلا مینار ہے۔ ہم اُدھر ہی تو جا رہے ہیں۔ جلی کوٹھی کی دیوار کے پیچھے۔ وہاں ایک تخت ہے،'' بڑے چچا نے جواب دیا۔

Scanned with CamScanner

’’نہیں...ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔‘‘ اس نے ان کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا۔

’’ڈر؟ پرچھائیوں سے کیا ڈرنا۔‘‘ وہ ہنسے۔

تب تو نہیں لیکن اب اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے سوچا:

ہاں، واقعی پرچھائیوں سے کیا ڈرنا۔ اور اگر وہ ان اشیا کی ہوں جن کا سراغ پانا بھی ناممکن ہو تو یہ ڈر اور بھی بے معنی اور بے تکا قرار دیا جا سکتا ہے۔

وہ ساری رات ایسے ہی گھومتے۔ وہ لوگ عجیب تھے۔ وہ تخت کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے، پھر آگے بڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے مدھم آواز میں مرثیے گونجتے رہتے۔ عود و لوبان سلگتے رہتے۔ مگر تخت اور مرثیے کہیں اور بھی تھے۔

وہ چلتے چلتے تھک جاتا۔ اس کے پیر درد کرنے لگتے۔

’’اب چلو، بہت تخت دیکھ لیے،‘‘ وہ اکتا کر کہتا۔ چاروں طرف خوں سا رستا۔

’’بس؟ کیا تھک گئے؛ ابھی بجا ہی کیا ہے۔ رات باقی ہے!‘‘ بڑے چچا بچکانی خوشی کے ساتھ جواب دیتے۔

’’چلو چلو، آگے بڑھو۔ وہ اُدھر روشنی نظر آ رہی ہے۔ یہاں بہت مجمع ہے۔‘‘

’’وہ راجوں کا تخت ہے۔ اس کی کاریگری اور نفاست دیکھنے لائق ہے۔‘‘

بڑے چچا راجوں کے تخت کے بہت شیدائی تھے۔ اس تخت میں بے شمار لکڑیوں کی دیواریں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ اور نہ جانے کتنی کھڑکیاں تھیں جو ایک کے بعد ایک آپ سے آپ اندر کی طرف کھلتی جاتی تھیں۔ لوگوں کا ایک جمِ غفیر انھیں دیکھنے کے لیے موجود رہتا تھا۔ مگر افسوس کہ عود و لوبان کے دھوئیں اور مرثیوں کی گونج میں لاکھ اُچک کر دیکھنے کی کوشش کرنے پر بھی وہ اس تخت کی صرف دیواریں دیکھ سکا، محض دیواریں؛ کوئی کھڑکی اسے کبھی نظر نہ آ سکی۔

یہ وہ کہاں آ گیا چلتے چلتے؟ یہ شاید وہی جگہ ہے جہاں وہ نو تاریخ کو بڑے چچا کے ساتھ بڑی دیر تک کا رہا تھا۔ یہاں آس پاس ہی کوئی تخت تھا۔

Scanned with CamScanner

اسے یاد آیا، برقع پوش لڑکیوں کا ایک غول اِدھر سے گزر رہا تھا۔ بڑے چچا اُدھر ہی اُچک کر دیکھ رہے تھے۔ اور تب اس نے دیکھا۔

ایک نقاب اُلٹی اور دو بڑی بڑی مغموم آنکھیں بڑے چچا کی طرف محبت اور حسرت سے دیکھنے لگیں۔

اس نے بڑے چچا کی طرف دیکھا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی؛ ایسی مسکراہٹ جوان مغموم آنکھوں کی حسرت اور محبت کا جواب ہرگز نہ تھیں۔ اس مسکراہٹ کے ایک کنارے پر بے حسی اور دوسرے پر شاید مکاری تھی۔

اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے بعد پرانی حویلیوں کے مہیب سایوں نے سب کچھ ڈھک لیا۔

''گھر چلو، اب گھر چلو، بہت تخت دیکھ لیے،'' وہ پورا چہرہ اٹھا کر روہانسی آواز میں بولا۔

''ارے تمھیں نیند آرہی ہے؟ آج تو گھومنے کی رات ہے۔ پاگل، تم سو رہے ہو؟''

اسے چپچپا سا پسینہ آرہا تھا۔ نیند اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی جسم میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔

ہمیشہ کی طرح وہ پھر ڈرنے لگا۔ چاروں طرف سائے ہی سائے خون کی طرح بہہ رہے تھے، اور پھر ایک واضح ڈر تو اس خوفناک بوڑھے کا بھی تھا۔

چلتے چلتے اسے خیال آیا کہ بہت دیر سے بجلی نہیں گئی۔ وہ اب پرانے شہر کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ پہلے سے زیادہ سرشار۔ پہلے سے زیادہ اداس۔

مگر ابھی محرم میں بہت کچھ تھا۔

ایک تخت والی گلی سے دوسرے تخت والی گلی تک پیک بے تحاشا بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لیے بھیڑ پھٹ کر راستہ چھوڑ دیتی ہے۔ وہ سبز لباس پہنے ہوئے ہیں۔ سارے بدن پر گھنٹیاں بندھی ہیں۔ رات کے سناٹے میں ان کے جانبازی سے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی بارعب آوازیں اور گونجتی ہوئی گھنٹیاں سن کر وہ سوتے سے جاگ اٹھتا تھا۔

Scanned with CamScanner

''یہ کون بھاگتا جاتا ہے؟'' وہ سراسیمہ ہو کر پوچھتا۔

''ایسے نہیں بولتے۔ یہ امام حسین کے قاصد یعنی پیک ہیں۔'' امی جو کچھ بتاتیں، وہ اسے سمجھ نہ پاتا۔

مگر نہ سمجھ پانے کے لیے دوسری باتیں بھی تھیں۔

محرم کے دنوں اس کے گھر کبھی کبھی محلے کا کوئی بچہ منّت کا فقیر بن کر آجایا کرتا۔ اس کا پورا لباس سبز رنگ کا اور درویشوں جیسا ہوا کرتا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک لکڑی ہوتی جس پر ایک خوبصورت سی کڑھی ہوئی پوٹلی بندھی رہتی۔ بچے کے گلے میں کلاوہ اور آنکھوں میں موٹا موٹا سرمہ لگا رہتا۔

''میں بھی فقیر بنوں گا،'' وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہتا۔

''یہ منّت کے فقیر ہیں۔ ہر کوئی نہیں بن سکتا۔''

''منّت کے فقیر کیا؟''

''جن کا کوئی بچہ جی نہیں پاتا، وہ یہ منّت مانتے ہیں کہ اگر ان کے بچہ پیدا ہوا تو وہ اسے امام حسین کا فقیر بنائیں گے۔''

امی پھر سمجھانے کی کوشش کرتیں اور وہ ہمیشہ کی طرح کچھ نہ سمجھ پاتا۔

منّت کا فقیر بنا ہوا بچہ اسے ٹکر ٹکر مسکرا کر دیکھتا رہتا۔ کچھ کچھ پُراسرار انداز میں۔ یہ بات وہ اب سمجھ سکتا ہے کہ منّت کے فقیر بچے کی مسکراہٹ اس کی اکیلی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس مسکراہٹ میں ان تمام بچوں کی مسکراہٹ کا کرب بھی شامل تھا، جو اس سے پہلے یا تو جی نہ سکے یا صرف خون کا لوتھڑا بن کر کہیں گم ہو گئے۔ اس مسکراہٹ میں ان ہری چوڑیوں کی اداس کھنک بھی شامل تھی جن کے ہاتھ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈے ہو گئے۔

منّت کا فقیر نہ بن پانے کا قلق اسے ہمیشہ رہا۔

تو اس شہر کی محرم داری واقعی انوکھی تھی، اس نے سوچا۔

اسے بس ایک بات کا افسوس رہا۔ جب تک لڑکپن رہا، وہ پابندی سے محرم کی نو تاریخ کو تمام رات بھٹکتا رہا، تھکا تھکا اور خوف زدہ ہی سہی، مگر اسے کبھی وہ منظر دیکھنے کو نہ مل سکا۔

Scanned with CamScanner

وہ منظر جسے شہر کے تمام لوگ بڑے جوش اور وثوق کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ نو تاریخ کو فجر کے وقت پو پھٹنے سے پہلے ایک حیرت انگیز اور نا قابلِ فہم واقعہ پیش آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تخت پر ایک سایہ سا آکر ٹھہرا اور گزر گیا۔ بالکل ایک بادل کی طرح۔ اس ایک پل میں آس پاس کی تمام روشنی اچانک زرد اور کمزور پڑ جاتی ہے۔ غور سے دیکھنے پر صاف نظر آتا ہے کہ تخت کی اوپری محراب کچھ جھک گئی ہے۔ تخت کے برابر ایستادہ علم کے پنجے پر خون کا ایک چھینٹا سا نظر آتا ہے، پھر غائب ہو جاتا ہے۔

لیکن عین ممکن ہے کہ اس کی نظریں اس منظر سے ہمیشہ چوک گئی ہوں۔ اسے اپنی نظروں پر زیادہ بھروسا کبھی نہیں رہا۔

مگر ایک بار تو عجیب بات ہوئی تھی، اور وہ محرم کے دن ہرگز نہیں تھے۔ اسے خوب یاد ہے کہ وہ جون کی لو بھری تپتی دوپہر تھی جب اس نے دور کہیں تختوں کے اٹھنے کی آواز سنی۔ ماتمی باجا بج رہا تھا۔

امی گھبرا گئیں۔ ''یا خدا خیر!'' ان کے منھ سے نکلا۔

ابا نے ان کی طرف دیکھا اور کہا:

''تمھیں خبر نہیں، شہر میں وبا پھیل گئی ہے۔''

لو کا ایک زبردست تھپیڑا آیا اور اس نے دالان میں پڑی چق کو اڑا کر رکھ دیا۔

''کیسی وبا؟'' امی کا چہرہ فق تھا۔

''اب نام کیا لوں۔ وہی بچوں والی بیماری۔ اب تک سیکڑوں بچے مر چکے ہیں۔''

باہر لو کے تھپیڑوں میں ماتمی باجا پورے زور سے بجتا ہوا آہستہ آہستہ قریب آرہا تھا۔ کہیں مصیبت یا وبا کے دنوں میں بھی مجبور ہو کر تخت اٹھایا جاتا ہے، ماتم کیا جاتا ہے۔ امام باڑے کھل جاتے ہیں اور شہدائے کربلا سے دعا مانگی جاتی ہے۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ وبا کبھی کبھی انسانی بھیس بدل کر بھی شہر میں بھٹکتی ہے۔ بچوں کو اٹھا لے جاتی ہے۔ وہ خوفناک بوڑھا کون تھا؟ اس نے سوچا۔ عینک لگائے، لنگڑاتا ہوا، پل پل تعاقب کرتا ہوا، جگہ جگہ سے سامنے آتا ہوا، وہ خوفناک بوڑھا۔

اس چھوٹے سے قد والے فقیر کا تمام ہی سراپا بے حد مہیب تھا۔ اس کے سارے جسم پر رگیں ہی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ عینک لگاتا تھا جس کے دونوں شیشے موٹے موٹے دھاگوں کے ذریعے

Scanned with CamScanner

کانوں سے باندھ لیے گئے تھے۔ ایک اونچا سا تہبند باندھے، لکڑی کی کھڑاؤں پہنے، ہاتھ میں کٹورا لیے، وہ ہر گلی میں گھومتا ہوا مل جایا کرتا تھا، کسی عفریت کی طرح۔

شدت کے ساتھ جھانوے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کے باعث بے حد سرخ سرخ پیر کھڑاؤں میں سے جھانکتے ہوئے کریہہ نظر آتے تھے۔ محلے کے بچے اس سے خوف بھی کھاتے تھے اور موقع دیکھ کر اسے چڑاتے بھی تھے۔ جب وہ بھیک مانگنے نکل رہا ہوتا تو کچھ بڑی عمر کے بچے اس کے پیچھے آتے اور زور سے تان لگاتے:

''حمیدن کے گھوڑے کی ٹاپ گم گئی!''

وہ اچانک بے حد تیزی کے ساتھ مڑتا۔ ہاتھ میں اینٹ کا ایک ٹکڑا دبائے وہ بپھرے ہوئے گھوڑے کی طرح بچوں کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا۔ اس کی کھڑاؤں کی بھیانک کھٹ کھٹ سارے محلے کو خبردار کر دیتی۔ اس کے ہونٹ مڑ کر سؤر کی تھوتھنی جیسے ہو جاتے جن سے سفید جھاگ اڑا کرتے۔ سامنے کے دو دانت خطرناک انداز میں باہر نکل آتے۔ اپنی نسوانی سی باریک آواز میں وہ گندی گالیاں بکتا۔

یہ بہت خوفناک منظر ہوتا جسے اس کی یہ پُر اسرار، ہڈیوں کو گلا دینے والی، باریک نسوانی آواز اور بھی نمایاں کر دیتی۔

بقر عید کے موقع پر وہ خوفناک فقیر اس کے گھر پیالہ لے کر گوشت مانگنے آجاتا۔ ان دنوں اس کے یہاں قربانی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی اسے آگے بڑھنے کو کہتا تو وہ ڈھیٹ پن کے ساتھ چوکھٹ پر بیٹھ جایا کرتا اور کریہہ انداز میں مسکرا مسکرا کر عورت کی سی آواز میں نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہتا۔

تب محلے میں دور کوئی آواز لگاتا:

''حمیدن کے گھوڑے کی ٹاپ گم گئی!''

وہ اچانک وحشی گھوڑے کی طرح آواز کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے لگتا۔ تہبند کے نیفے میں اُڑسے ہوئے اینٹ کے ٹکڑے کو ہاتھ میں دبا لیتا۔ اس کی کھڑاؤں کی بھدی آواز وبا کی طرح گلی میں دور تک پھیلتی جاتی۔

اس فقیر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت بدکردار اور پُر اسرار شخص تھا۔ ایک خطرناک بات

Scanned with CamScanner

یہ بھی تھی کہ وہ اپنی چڑ بنانے والے کو ہمیشہ یادرکھتا اور کبھی کبھی خاموشی سے اس کا تعاقب کرتا۔ وہ دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے میلوں تک جاتا۔ ایسے وقت اس کی کھڑاؤں بالکل گونگی ہو جاتی۔ اینٹ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں دبا رہتا۔

یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کی اس چڑ کا آخر راز کیا تھا۔

ایک بار نہ جانے کیوں اس فقیر نے اس کی شکل بھی ذہن میں بھر لی۔ حالانکہ وہ اس کی چڑ بنانے کی کبھی ہمت ہی نہ کرسکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ اکثر اس قسم کی ناقابلِ فہم باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اسے اس پر کوئی حیرت نہیں ہے۔

ان دنوں بچپن میں وہ بے حد شوق سے شام کا دودھ لینے بھینسوں کی ڈیری میں جایا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک شام جب وہ دودھ لینے گھر سے نکلا تو فقیر اس کے پیچھے لگ گیا۔ اپنی کھڑاؤں کو گونگا کر کے، ہاتھ میں اینٹ کا ٹکڑا دبائے، کریہہ شیطان کی طرح۔

اس کو تب اس بات کا احساس ہوا جب وہ دودھ کی ڈیری میں داخل ہو گیا۔ عینک لگائے ہوئے، وہ خوفناک شیطان اس کے نکلنے کے انتظار میں ڈیری کے سامنے نالی کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

مغرب کی اذان کا وقت آ پہنچا تھا۔ آسمان پر دُھند چھا رہی تھی۔ پرندے اپنے بسیروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔

وہ دودھ کی دیگچی تھامے کب سے حیران و پریشان ڈیری کے اندر ہی کھڑا ہے۔ چھوٹی سی دیگچی کا کنارہ گھس گیا ہے۔ اس کے ناخن کنارے پر لپک لپک کر دُکھنے لگے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے بھوسا ہے اور سامنے بھینسیں ڈکرا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا اپھیل جائے گا۔

وہ ڈیری سے دودھ لے کر باہر کیسے نکلے؟

اب اس کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پیدل چلتے چلتے اس کے بدن پر ہلکا سا پسینہ آ گیا۔ ٹائی کی گرہ گھٹن سی پیدا کر رہی تھی۔ چار خانے کا کوٹ، جو وہ پہنے ہوئے تھا، اچھا خاصا گرم تھا۔ غنیمت تھا کہ ادھیڑ عمر کا ہونے کے باوجود بھی اس کا دم نہیں پھول رہا تھا۔ اس نے اپنے پسیجتے ہوئے

Scanned with CamScanner

ناک کے بانسے کو چشمہ اتار کر ہاتھ سے پونچھ دیا۔ شادی میں کھائے ہوئے پلاؤ کی ایک ڈکار نے اس کے منھ میں بساندھ بھر دی، اور تب اسے خیال آیا کہ اس قسم کے کھانے کے بعد اسے کم از کم پان ضرور کھالینا چاہیے تھا۔

پان؟

تو کیا اب وہ اپنی اداسی کے نشے کو واقعتاً اس طرح طول دینا چاہتا تھا جس طرح شہدے قسم کے لوگ بھنگ کا نشہ بڑھانے کے لیے اوپر سے مٹھائی کھاتے رہتے ہیں؟

یقیناً ایسا ہی تھا۔ بلی جیسی شکل کی وہ چوکنی سی لڑکی پلاؤ بہت اچھا پکاتی تھی۔ وہ اکثر اسے اپنے گھر پلاؤ کی دعوت پر بلاتی۔ لڑکی کا گھر بہت بڑا تھا۔ اس میں نہ جانے کتنے دالان، کتنے کمرے اور کتنے زینے اِدھر سے اُدھر چڑھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ اس کے سامنے پلاؤ کی رکابی رکھ کر خود سامنے بیٹھ جاتی، بالکل اس طرح جیسے گھر کی پالتو بلیاں کسی کھانا کھاتے شخص کے سامنے بیٹھی رہتی ہیں۔

بلی جیسی شکل کی اس چوکنی لڑکی کے پیر ہمیشہ پھٹے پھٹے رہتے تھے۔ اس کی ایڑیوں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

جب وہ کھانا ختم کر لیتا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر اچانک اپنی بند مٹھی کھولتی۔ اس میں پان کا ایک چھوٹا سا مڑا تڑا ٹکڑا ہوتا۔ وہ جلدی سے اس کے منھ میں پان کا یہ ٹکڑا ٹھونس دیتی۔ پھر اس کے ماتھے کو چومتی ہوئی کہتی:

''تم بہت نیک انسان ہو، بہت ہی نیک۔''

اس وقت اس کی کھلی ہوئی ہتھیلی پر کتھے چونے کا نشان خون کے ایک بڑے دھبے جیسا چمکتا نظر آتا۔

لیکن صرف اتنا ہی نہیں تھا۔ اس سے بھی اہم بات کچھ اور تھی۔

یومِ عاشورہ کو دوپہر بارہ بجے وہ اسے اپنے گھر بلاتی اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر دعائے عاشورہ کا ورد شروع کر دیتی۔ اسے اس امر پر یقین تھا کہ جو شخص بھی عاشورہ کے روز یہ دعا سنے گا یا پڑھے گا اس کو اس پورے سال موت نہیں آسکتی۔ اور اگر اسے مرنا ہی ہوگا تو پھر کوئی نہ کوئی بہانہ ایسا

ضرور بن جائے گا جس کی وجہ سے وہ یہ دعا سن نہیں سکے گا۔

جب وہ یہ دعا سناتی تو سر پر سفید دوپٹہ اوڑھ لیتی۔ اس کی شکل پر چھائی ہوئی بلیوں کی سی پاکیزگی کسی پُر اسرار شے میں بدلتی جاتی۔

کون سی شے؟

وہ بہت سوچنے کی کوشش کرتا، مگر اس سے زیادہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کی شکل پر اب ایک پُر جلال ضد کا سایہ ہے۔ ایسی انوکھی ضد جس کے سرے اس دنیا میں نہیں، کہیں اور ہیں۔ اور وہ ضد کے ان پُر جلال اور پاکیزہ سایوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

وہ جب اس کے گھر سے ''دعائے عاشورہ'' سن کر اٹھ رہا ہوتا تو دوپہر ڈھل چکی ہوتی اور سہ پہر کے ٹھنڈے سائے اس وسیع و عریض گھر کے آنگن اور اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے زینوں پر اپنی شکل بدلتے نظر آتے۔

اس ضد کے بارے میں اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا۔

وہ ایک بہت معمولی سی بات تھی جس پر وہ اس سے ناراض ہو کر ضد پر اڑ گئی تھی۔ حالانکہ اس معمولی سی بات میں وہ اپنی دانست میں بڑا ہی نیک اور اخلاقی فریضہ ادا کر رہا تھا۔

اس سال یومِ عاشورہ کی دوپہر، بلی جیسی چوکنی لڑکی نے نہ خود دعا کا ورد کیا اور نہ ہی اسے اپنے گھر بلایا۔

''تم خود ہی پڑھ لینا دعائے عاشورہ۔ میں نہیں پڑھوں گی۔'' اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں کہا اور اس کے پورے چہرے پر بلی کی سی خطرناک بے مروّتی چھا گئی۔

''آخر کیوں؟'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''بس، یوں ہی۔ مجھے موت چاہیے۔'' اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک ناقابلِ تشریح قسم کی سفیدی کا سایہ آکر منڈلانے لگا۔

تب اس نے اس بھیانک ضد کو واضح طور پر دیکھا، جو اس کی آنکھوں میں چمک کر رینگتی ہوئی اس کے پھٹے ہوئے پیروں اور دراڑ پڑی ایڑیوں تک جا رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

وہ ضعیف الاعتقادی کا بہت زیادہ مخالف نہیں ہے۔ اس سے یہ اندازہ تو بہر حال ہو ہی جاتا ہے کہ اس نظر آنے والی دنیا سے پرے کچھ ہو سکتا ہے۔ سارے علم کی شروعات تو اس نکتے میں پوشیدہ ہے۔

اس دوپہر کو وہ اس کے وسیع وعریض مکان سے آخری بار اٹھا تھا۔ لو چل رہی تھی۔ سڑکوں پر سفید چادر میں لپٹے تخت چلے جا رہے تھے۔

اپنے گھر پہنچ کر اس نے امی سے دعائے عاشورہ پڑھوا کر سن لی اور مطمئن ہو گیا۔

بلی جیسی چوکنی لڑکی کا پاکیزہ سراپا، پلنگ پر بکھری ایک لمبی سی خون کی قے میں تبدیل ہو کر ساری دنیا سے کب اوجھل ہو گیا، اسے یاد نہیں۔ مگر اب تک وہ پابندی سے ہر سال یومِ عاشورہ کی دوپہر کسی نہ کسی سے یہ دعا پڑھوا کر ضرور سن لیتا ہے۔ خود اسے تو عربی کا ایک لفظ بھی ادا کرنا نہیں آتا، افسوس۔

نیک لوگوں کی دنیا میں بہت ضرورت تھی، اور بہادروں کی بھی۔ بزدلی دراصل ہمت ہی کا ٹیڑھا میڑھا سا راستہ ہے۔ وہ اپنی بزدلی پر ہمیشہ نازاں رہا۔

اب یہ نشے کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد اداسی صرف ملبے کی طرح نیچے گر سکتی ہے، اوپر نہیں جا سکتی۔

چلتے چلتے اسے احساس ہوا کہ اداسی کے اس پڑاؤ پر بہت کچھ مضحکہ خیز بھی تھا، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اداسی کی اپنی انفرادی اہمیت ہے۔ وہ خود مختار ہے جس طرح ہر تعزیے کی اپنی انفرادی اہمیت ہے۔

''کہو بھائی، تعزیے دیکھ آئے؟'' دور خلا میں کسی نے پوچھا۔

''ہاں بھائی، تعزیہ دیکھ آیا۔ کھیتوں کے اُس پار، دیوار کے اُس طرف، پیچھے پیچھے چلتے خوانچے والے کی ٹمٹماتی روشنی میں۔ تاریک راتوں میں، اجنبی مقاموں کی خوف زدہ کرتی کہن سال عمارتوں اور روشنیوں کے درمیان تعزیوں کا پڑتا سایہ بھی دیکھ آیا۔ تمام عمر تعزیہ ہی تو دیکھتا رہا۔''

چلتے چلتے اب اسے ٹھہرنا ہی پڑا۔ کل بقر عید ہے۔

Scanned with CamScanner

اب وہ بکروں کے بازار میں کھڑا تھا، بقرعید کی قربانی کے لیے لگا ہوا بازار۔ ایک بڑا سا چوک تھا۔ اس چوک سے تیس قدم دائیں طرف چلو اور پھر تیس قدم بائیں طرف تو ٹھیک اسی کے گھر پر پہنچا جا سکتا ہے، مگر تیس قدم دائیں طرف چلنے سے پہلے دودھ کی ایک ڈیری کو پار کرنا ضروری ہے۔

یہ بڑا سا چوک، جہاں رسیوں میں بندھے بکرے منمنا رہے ہیں، وہاں اس کے بچپن میں سرکس لگتا تھا۔ ایک چھوٹا سا گھٹیا سرکس جو تمام محلوں میں گھوم گھوم کر لگتا رہتا تھا۔

سرکس کیا ہے؟ جانوروں کا ڈراما۔ اس المیہ کے تمام کردار جانور ہیں۔ سرکس میں اگرچہ جوکر بھی ہوتے ہیں مگر پھر بھی سب سے ایماندار جوکر تو کوئی ہاتھی، کوئی بندر یا کوئی طوطا ہی ہوتا ہے، اور دیکھنے والے کے تزکیۂ نفس کا سبب بھی وہی بنتا ہے۔

اس چوک میں بکروں کا بازار لگا ہوا تھا۔ رات شاید خاصی بیت گئی تھی، اس لیے اب یہ بازار بکھر رہا تھا۔ سفید، کالے، کتھئی اور ابلق بکرے منمنا رہے تھے۔ زمین پر گیس کی لالٹینیں رکھی تھیں جن کی نیلی رنجور روشنی میں بکروں کے گلے میں بندھی رسیوں کے سائے اور بھی موٹے اور دبیز ہو کر اِدھر اُدھر دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ اس کے پیروں کے نیچے بکروں کی مینگنیاں اور ان کے چارے کے پتے کچلے جا رہے تھے۔ چاروں طرف ناگوار سیلن اور کھراند چھائی ہوئی تھی۔

بس۔ اب اسے مڑنا تھا۔ اس کے جوتوں کی آواز آتی ہے مگر مر جاتی ہے۔ کوئی ارتعاش نہیں پیدا ہوتا۔ رستم زماں نہیں چل رہا زمین پر کہ وہ کانپے۔ ایک اکیلا، اداس اور نیک آدمی چلا جا رہا ہے۔

بہت پرانی گلی تھی۔ بچپن کی گلی، گیند اڑتی ہوئی اُدھر ہی جا کر گم ہوتی تھی۔ کھنڈر کی پشت، ایک ٹوٹے پھوٹے ویران اسکول کی پرچھائیاں، آگے جا کر دودھ کی ایک ڈیری۔ پھر وہ بائیں طرف مڑے گا اور اپنے گھر کے سامنے جا کر کھڑا ہو جائے گا۔

اب وہ اور بھی جھک کر چلا۔ زمین پر اپنی پرچھائیاں دیکھتا ہوا۔

بکروں کے منمنانے کی آوازیں اور موٹی موٹی رسیوں کے سائے پیچھے چھوٹ رہے تھے۔ گلی سنسان تھی، دور دور تک کوئی نہ تھا۔

''حمیدن کے گھوڑے کی ٹاپ گم گئی!'' وقت کے نہ جانے کتنے پرانے ٹیلوں کے عقب سے

Scanned with CamScanner

کوئی تان لگا رہا تھا۔

''رک جا، تیری ماں کی...'' سانپ کی سی پھنکار گونجی۔

چار بڑے بڑے کچے لوہے کے پستول جن میں بندوق کی گولی بھری جاتی ہے، اس کے سارے جسم پر چھا گئے۔

وہ مسکرایا۔ ''کیا بات ہے؟''

''سالے کو پکڑ کر اُدھر لے چلو۔ اُدھر گولی ماریں گے اسے۔''

وہ اسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے آگے لائے۔ دودھ کی ڈیری کے ٹھیک سامنے دیوار سے لگی ہوئی نالی کے پاس۔ بائیں طرف اس کے گھر کا راستہ تھا۔

وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ پیچھے ایک چمکدار چھری تھی، کمر سے لگی ہوئی۔ گردن سے لے کر پنڈلی تک پستول گڑے ہوئے تھے۔

اس کی ٹائی بے ہنگم انداز میں جھول رہی تھی۔

''ماردو گولی سالے کو۔''

''ماردوں گولی؟''

''اس کا پیٹ پھاڑ دو، ذبح کردو۔''

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اس کا قتل کیوں کر رہے ہیں۔ مگر اب وہ ان سے وجہ نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک نیک آدمی تھا اور شہید ہونے کے لیے تیار تھا۔ وہ اسے اسی طرح پکڑے پکڑے نالی کے پاس دیوار تک لے گئے۔ اس کے کندھے اور پیٹھ سیاہ ٹھنڈی دیوار سے لگ کر اکڑنے لگے۔

کہیں دور کالی کے مندر میں گھنٹے بجے جا رہے تھے۔

وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔

ان پستولوں کے سائے کہاں پڑ رہے تھے؟ چھری کی چمک ایک بار آنکھوں میں لہرائی تھی لیکن اس کا سایہ وہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے گمان گزرا کہ اس کے جسم پر گڑی ہوئی نالیں شاید نالوں کی پرچھائیاں تھیں۔ اصل پستول کی نال نہ جانے کہاں تھی۔ اصل نالیں اپنی اقلیدس میں ان سے مختلف ہوں گی۔ اِن کے منھ زیادہ بے ہنگم، بھدے اور چوڑے ہیں۔ یہ اُن سے زیادہ کالی اور بدشکل ہیں۔

Scanned with CamScanner

کمر میں چبھنے والی چھری صرف چھری کی پرچھائیں ہے۔اس کی چبھن صرف ایک پرچھائیں کی چبھن ہے اور اس لیے اصل شے سے زیادہ ٹھنڈی اور متلاہٹ بھری ہے۔

اچانک ڈیری کی ٹوٹی پھوٹی دیوار سے ایک اینٹ گری۔ بھورے رنگ کی ایک بلی چھلانگ لگاتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

پھر کمر پر لگی ہوئی چھری پیچھے کو ہٹی۔ جسم پر سے پستولوں کی ٹھنڈی نالیں واپس ہوئیں۔

''دھپ، دھپ۔'' آنکھوں میں سرمہ لگائے چار فحش ہیجڑوں کے بدہیئت سائے دور گلی میں بھاگتے نظر آئے، پھر غائب ہوگئے۔

تاروں کی چھاؤں میں کھڑا جھومتا ہوا وہ اپنی پرچھائیں کو دیکھتا رہا۔

نالی میں کیا سنہری جلد والی کتاب جگمگا رہی تھی؟

دیوار کے پیچھے بلی جیسی چوکنی لڑکی دعائے عاشور پڑھ رہی تھی۔

یافارج کرب ذی النون یوم عاشوراء

''تم بہت نیک شخص ہو،'' اچانک اس نے کہا اور پھر دعا شروع کردی۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نیکیاں اس کی پرچھائیں کے قدموں سے نکل کر گلی میں بیہودہ رقص کر رہی ہیں۔اس نے ان نیکیوں کی پرچھائیوں کو بھی غور سے دیکھا۔

اسے گمان گزرا کہ کہیں دور سے کوئی تخت اٹھ رہا ہے اور ماتمی باجا بج رہا ہے۔تو شہر کس مصیبت، کس وبا کی زد میں ہے؟ اس نے سوچا۔ جب کسی شہر میں سرمہ لگائے، بدکردار ہیجڑے تمھیں گندی گالیاں دیتے ہوئے بے وجہ قتل کرنا چاہیں تو کیا یہ یقین کر لینا چاہیے کہ واقعی شہر کسی وبا کی زد میں ہے؟

اس نے ناک پر اپنا چشمہ درست کیا۔اُس کی ٹائی ابھی تک بے ہنگم انداز میں جھول رہی تھی۔ اسے ٹھیک کرتے وقت اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی موٹی رسّی کو چھو رہا تھا۔

نہیں۔کوٹ میں کوئی سوراخ نہیں ہے۔ کپڑوں پر خون کا کوئی دھبا نہیں ہے۔اس کا باریک

Scanned with CamScanner

چارخانے کا کوٹ ہوا میں لہرا رہا ہے۔ کوٹ کی بائیں جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس یوں ہی محفوظ پڑے ہیں۔

وہ اپنے وجود کی پرانی رگوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہے۔ باہر آرہا ہے۔ ایک امکان، ایک اتفاق، ایک مغالطے کی طرح۔

کیا وہ اب بھی اداس تھا؟

نہیں، اداسی اپنا اخلاقی فرض پورا کر کے رخصت ہو چکی تھی۔ اداسی نے ہی اسے بچایا تھا۔ دراصل جب ہم اداس ہوتے ہیں تو اپنی ذات کے تئیں بے حد چوکنے ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی لاشعوری خود غرضی ہے۔ انفرادی اداسی سوجھ بوجھ سے بھرا نشہ ہے۔ موت سے پہلے ہی موت کے سچ کو جان لینے کا ترغیب آمیز نشہ۔ مگر افسوس کہ موت سے پہلے اس سچ کے لیے ہمارے حواس اور اعصاب تیار نہیں ہیں۔ وہ تو بس موت کو چھو کر اور چکھ کر واپس آرہا ہے۔

مگر پھر اس نے سوچا:

یہ موت کو چھونا بھی کہاں تھا؟ یہ سب تو بازاری تھا۔

قربانی، شہادت، ایثار اور موت اتنی ارزاں اشیا نہیں ہیں۔ ان کی نقل ارزاں ہے۔ وہ موت نہیں تھی، موت کی نقل اتارتا ہوا کوئی بھانڈ تھا۔ اس بھانڈ نے اس کے ساتھ بیہودہ فحش مذاق کیا تھا، اس لیے اب وہ صرف شرمندہ تھا۔ یہ ایک ایسی مکمل شرمندگی تھی جس کا مرثیہ پڑھنا بھی مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، سوائے اس کے کہ سنسان رات، تاروں کی چھاؤں اور ویران گلیوں میں پڑنے والے تاریک سایوں پر اپنا خون معاف کردے۔ بالآخر مجبور ہو کر اس نے ایسا ہی کیا۔

لیکن پھر موت کہاں تھی؟

اگر یہ صرف موت کا سوانگ، موت کی ڈمی تھا تو پھر اصل موت کہاں تھی؟ شاید اس مہیب، نادیدہ دیوار کی نظر آتی پرچھائیں کے پیچھے وہ چھپی بیٹھی تھی۔ یا کائنات کی تمام بے تکی اشیا کے اور بھی زیادہ بے تکے سایوں کے عقب میں۔

ہاں، بس ایک اہم فرق ضرور رونما ہوا ہے۔

جب پستولوں کی نالیں تمہارے جسم سے ہٹائی جاتی ہیں، جب خوفناک چھری تمہاری کمر میں

Scanned with CamScanner

چبھنا بند کر دیتی ہے، تب تم ایک نئے آدمی ہوتے ہو۔ اسی طرح جیسے اپنے غسل خانے سے نہا کر نکلنے کے بعد، یا دوپہر کے قیلولے سے جاگنے کے بعد تم ایک نئے آدمی ہوتے ہو۔

تو وہ اب ایک نئے آدمی کی طرح اپنے گھر کی طرف چلا۔ مگر صرف نئے آدمی کی طرح گھر واپس آنا کوئی بہت بڑا کارنامہ نہ تھا۔ یہاں صرف ایک بھوت کی طرح ہی محفوظ گھر واپس آیا جا سکتا تھا۔

اور یقیناً وہ واپس آ رہا تھا۔ بغیر خون میں لت پت ہوئے۔ ایک انسان کی طرح نہیں بلکہ اس کے آسیب یا سائے کی طرح۔ ایک ہمیشہ کے لیے محفوظ پریت کی طرح جس کی حفاظت اس کی نیکیاں یا کوئی دعا نہیں بلکہ اس کی اپنی بدنیت ہوائیں اور چھلاوے کرتے ہیں، اور اس لیے وہ اپنے کوٹ پر خون کے دھبے لیے بغیر آدھی رات کو اپنے گھر کے دروازے پر دستک دے سکتا ہے۔

❊❊

Scanned with CamScanner

خالد جاوید

جلتے ہوئے جنگل کی روشنی میں

ساری سوانحیں، زندگی کی کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ ان خالی گھونگوں کی طرح ہوتی ہیں جن سے ان کیڑوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا جو کسی زمانے میں ان میں رہتے تھے۔

— چسلاوٗ میووش

۱

یہ بڑی دلچسپ اور عجیب بات تھی کہ دنیا کو اس نے ہمیشہ محض زمین ہی سمجھا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ یہی سوچتا آیا تھا گویا دنیا میں انسان نہ رہتے تھے۔ بس وہاں پہاڑ تھے، پانی تھا، میدان تھے، جنگل تھے، کسی حد تک چرند و پرند کا بھی مبہم سا تصور موجود تھا، مگر انسان، وہ تو جیسے کہیں باہر سے آئے تھے۔ کسی نہ دکھائی دینے والے دور دراز اور پُراسرار مقام سے دنیا میں پھینکے گئے تھے۔ وہ ٹین کے خالی ڈبے میں باہر سے ڈالے گئے کوڑے کرکٹ یا کنکروں کی طرح تھے۔ جس طرح ڈبے میں کنکر بجتے رہتے ہیں، اسی طرح انسان بھی اپنی اپنی زبان چلاتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا نقلی طور پر مگر نا محسوس طریقے سے تقسیم شدہ ہوگئی تھی۔

انسان فطرت اور ماحول کا عنصر ہرگز نہ تھے۔ وہ تاریخ کی پیداوار تھے۔ زبان اور تاریخ سے خالی دنیا ہی اصل دنیا تھی۔

وہ ہمیشہ سے ایسا ہی سوچتا۔

Scanned with CamScanner

یہ تو ٹھیک ہے کہ دنیا پہلے صرف زمین تھی اور انسان اس میں بہت بعد میں، دیر سے آیا، گناہ کرنے کے بعد، مگر اب تو انسان کے بغیر دنیا کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ انسان دنیا کو ہمیشہ بدلتا بھی آیا تھا۔

مگر وہ... وہ تو بس آنکھیں بند کر لیتا اور دنیا اپنے تمام کہساروں، سمندروں اور جنگلوں سمیت اس کے سامنے مہربان دوست اور غمگسار کی طرح آ کھڑی ہوتی۔

اس طرح آنکھیں بند کر لینا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ ایک دینی مدرسے میں جغرافیہ کا معلم تھا۔ تمام زندگی اس نے اپنے چھوٹے سے شہر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ مدرسہ اس کے محلے میں ہی واقع تھا، مگر پوری دنیا کا نقشہ اور جغرافیہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا تھا۔ مختلف ملکوں کے طرح طرح کے جغرافیائی نقشے ہمیشہ پلندہ بنے اس کے ساتھ رہتے۔ ان میں سے بیشتر کے کاغذ بہت بوسیدہ اور میلے ہو گئے تھے۔ یہ نقشے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور وہ ان کی کترنوں کو بار بار گوند سے چپکاتا رہتا تھا۔

اس کے پاس بہت سے خالی نقشے بھی موجود رہتے جن کو بھرتے رہنا اس کا دوسرا اہم شغل تھا۔ ندیوں، پہاڑوں اور سمندروں کو پنسل کے سرے سے کاغذ پر مکمل کرتے جانا اس کے لیے جمالیاتی تجربہ بن چکا تھا۔

مدرسے میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے اپنی سی بھرپور کوشش کی تھی کہ وہاں تاریخ کا پڑھانا بند کر دیا جائے، مگر یہ ممکن نہ ہو سکا تھا۔ تاریخ سے اس کی عداوت کا سبب بھی جغرافیہ ہی تھا۔ وہ دراصل جغرافیے کو تاریخ کی آلودگی سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اکثر ایسے مضامین لکھنے کی کوشش کرتا تھا جن میں تاریخ کے ذریعے جغرافیے میں پھیلائی گئی گندگی کے بے رحمانہ رویے کو ثابت کیا جاتا تھا۔ یہ مضامین کبھی کبھی وہ اپنے بالائی گھر کی کھڑکی پر کھڑا ہو کر صرف اس لیے قدرے بلند آواز میں پڑھا کرتا کہ بولے ہوئے لفظ اور تحریری لفظ میں کسی تضاد کی نشاندہی ہو سکے۔

یہ سچ تھا کہ اسے انسانوں کی تاریخ سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ تاریخ تو آسیب کی طرح تھی۔ وہ اڑتی پھرتی تھی، کہیں ٹھہرتی ہی نہ تھی اور بڑی بے رحمی اور بے مروّتی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ مگر پہاڑ، سمندر، میدان نظر آتے تھے، ٹھوس۔ اور اگر وہ بدل بھی رہے تھے تو کم از کم اسے اس کا

کوئی واضح شعور نہ تھا۔ نقشے میں تو وہ اور بھی قائم و دائم نظر آتے تھے۔ مگر تاریخ نقشے کی آڑی ترچھی لکیروں میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ وہ واقعی بھٹکتی پھرتی تھی، ایک ہوا، ایک شے کی طرح، یا اپنا ہی گلا کاٹتی ہوئی، ہاتھ میں استرا لیے ایک بدنیت مگر احمق بندر کی طرح۔ اسے ایسے آسیب میں بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

آج اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے کاغذ پر جو لکھا تھا، اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اپنے بالائی گھر کی کھڑکی کھول کر آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔

معمولی سے محلے کا انتہائی معمولی مکان تھا۔ آم کے درخت کی کمزور اور گھٹیا لکڑی کے کواڑ وارنش یا روغن سے عاری، ریت سے گھٹا ہوا بدرنگ کھر کھرا فرش۔ بغیر چونے کی دیواروں پر قطار سے لگے ہوئے تین چار طغرے۔ تیسری منزل کا مکان تھا۔ کھڑکی کا پٹ کھولنے پر نیچے محلے کی پتلی سی گلی نظر آتی تھی، اگر مشرق کے رخ پر کھڑے ہو کر کھڑکی سے نیچے دیکھا جائے تو بجلی کا ایک کھمبا گلی کے داہنے موڑ پر تھا۔ بائیں موڑ والے کھمبے کے بالکل نیچے پانی کا ایک نل لگا تھا جس میں کبھی کبھار ہی پانی آتا تھا۔

یہ غریب لوگوں کی بستی تھی۔ سارے محلے میں قطار سے بنے ہوئے تقریباً ایک جیسی کسمپرسی بیان کرتے ہوئے مکانات تھے۔ گلی کے داہنے طرف سے موڑ سے تھوڑا آگے ہندوؤں کی بڑی آبادی تھی، مگر بائیں موڑ سے آگے دور تک مسلمانوں کی آبادی تھی۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا قبرستان پڑتا تھا، پھر کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ کھیتوں کے آخری سرے پر مرگھٹ تھا، بھنگیوں کا مرگھٹ۔ کسی زمانے میں وہاں بھنگیوں کے مردے جلائے جاتے تھے لیکن اب صرف دھول اڑتی تھی۔ ٹین کا ایک زنگ آلود ٹوٹا پھوٹا شیڈ وہاں رہ گیا تھا جو ہوا میں کھڑکھڑاتا رہتا تھا۔ اس کے کھڑکھڑانے کی آواز رات کے سناٹے میں بڑی مہیب محسوس ہوتی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ جب کبھی اس ٹین کے ہلنے کی آواز آتی ہے تو دور مرگھٹ میں شعلے بھی بھٹکتے نظر آتے ہیں۔

جہاں تک اس کے گھر کا سوال ہے تو گھر میں کھڑکی کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھی۔ ہاں، مگر وہاں بہت سے قرآن شریف تھے جو جگہ جگہ پھولدار جزدانوں میں لپٹے نظر آجاتے تھے۔ ایک بڑا سا پرانا قرآن شریف تو کھڑکی کے اوپر بنے چھوٹے سے مچان پر ہی رکھا ہوا تھا۔

گھر میں کالی چیونٹیوں کی بھی بھرمار تھی جن کے بارے میں اس کی بہن کا خیال تھا کہ انھیں کبھی نہیں مارنا چاہیے کہ یہ چیونٹیاں مذہباً دراصل مسلمان ہیں۔ ابھی وہ کالی چیونٹیاں کھڑکی کے پٹ

پر رینگ رہی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ پر دنیا کا ایک نقشہ بھی چسپاں تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ سے لکھا تھا:

''مجھے صاف صاف اور واضح طور پر محسوس ہونے لگا ہے کہ حروف اور الفاظ کی شکلیں ہی تبدیل ہوگئی ہیں۔ اگرچہ وہ صاف صاف وہی تھے جو ان کا مطلب تھا۔ مثلاً 'ب'، 'ب' ہی تھا اور 'ج' بھی 'ج'۔ مصوتوں اور مصمتوں کی صوتیات میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مذکر مونث میں مونث مذکر میں ہرگز نہیں بدل رہا تھا۔ مگر پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے رویے میں ایک نا قابلِ دید مگر کوئی اہم اور پُراسرار تبدیلی ضرور واقع ہوئی تھی۔ جیسے آپ کبھی کبھی اپنی عورت کی سرد مہری کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ ترسیل اور معنی کے تمام کونوں سے اُکھڑے اُکھڑے ناراض اور خفا سے کھڑے تھے۔ وہ کسی دوسری سمت کو جھک رہے تھے۔''

(تو کیا محض ہاتھ بدل کر لکھنے سے تاریخ ایک نخریلی عورت میں بدل سکتی تھی۔ اس کا پورا رویہ ہی کچھ سے کچھ بن سکتا تھا؟)

''میں آپ کو بتا دوں، بلکہ گوش گذار کر دوں کہ میرا کوئی ارادہ متوسط تاریخ لکھنے کا نہیں رہا ہے۔ تاریخ ویسے بھی مجھے مکھی کی طرح ہی نظر آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں، بلکہ مقابلے میں کیا، مطلقاً، جغرافیے کو ہی میں نے ہمیشہ پسند کیا ہے کہ اُس میں کم از کم ندی، پہاڑ اور گھاس وغیرہ کا ذکر تو ہوتا ہے۔ میں تو دراصل تاریخ اور جغرافیہ کے اس نام نہاد تعلق کو بے بنیاد ثابت کرنا چاہتا ہوں جس کا علمی حلقوں میں ہمیشہ سے ہی بڑا چرچا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ تاریخ کا تعلق دراصل کسی بھی شے سے نہیں ہے۔ یا اگر ہے تو صرف انسانی تقدیر سے یا خدا کی خدائی سے۔ دونوں ہی سے مجھے رتی برابر دلچسپی نہیں۔ اور اس سلسلے میں علت و معلول کا احمقانہ اصول کتنا تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے، اسے فلسفیانہ طور پر بیان کر کے میں اپنی اور آپ کی طبیعت کو پراگندہ خاطر نہیں کرنا چاہتا۔

''میں تو یہ سب لکھ ہی اس لیے رہا ہوں کہ تاریخ کے کنکھجورے کو جغرافیہ کی شفاف پیٹھ پر سے نوچ کر دور پھینک سکوں۔ اس کے لیے مجھے چمٹے میں ایک انگارہ رکھنا ہوگا... میں یہ سارا کام اپنے بائیں ہاتھ سے کر رہا تھا مگر بایاں ہاتھ آج کل بری طرح دُکھ رہا ہے۔ کندھے سے لے کر انگلیوں تک اس میں بری طرح سوجن ہے۔ وہ لال لال ہے اور اندر سے اس طرح تپ رہا ہے جیسے وہاں کسی

Scanned with CamScanner

پھوڑے کا مواد بھرا ہوا ہو۔ اینٹھن اور درد گردن تک پھیل گئے ہیں۔

''میں بائیں ہاتھ والا آدمی ہوں یعنی بیماری۔

''جب بائیں ہاتھ سے لکھنا دشوار ہو گیا تو میں نے مجبوراً دائیں ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے زندگی میں پہلے کبھی دائیں ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا۔ مگر کیا کروں، یہ کام اب اور زیادہ ٹالا نہیں جا سکتا۔

''تو اب آپ کو اتنا تو علم ہو ہی گیا ہوگا کہ میں تاریخ واریخ کی چھان پھٹک کرنے میں اپنا وقت نہیں ضائع کر رہا ہوں۔ میں تاریخ کو خالص کیوں بناؤں؟ میں تو جغرافیے کو خالص بنانے کی کوشش کر رہا ہوں، تاکہ اس خالص جغرافیے کو اس کی مکمل جمالیات اور نشاط و انبساط کے ساتھ اپنے حواس و اعصاب میں محفوظ کر سکوں؛ خالص جغرافیہ، جو ریاضی کے ہندسے کی طرح صاف شفاف، چمکتا ہوا اور ایماندار ہے۔

''لیکن اب دائیں ہاتھ سے یہ انگارہ پکڑنے پر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ صرف رسم الخط ہی نہیں بدل رہا ہے، سب کچھ بدل رہا ہے۔ اگر الفاظ اس طرح آہستہ آہستہ اپنی شکل بگاڑتے رہے تو یہ کچھ ایسی خطرناک صورتِ حال ہوگی جیسے کسی کی جنس کا پُراسرار طریقے سے بدلتے جانا، جیسے ایک نازک اندام حسینہ کے سینے پر اور چہرے پر بڑے بڑے بالوں کا اُگ آنا۔ ہے نا خطرناک بات! کیونکہ اس سے آگے چل کر سارا مفہوم، بلکہ صاف کہوں تو سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا۔

''میں دراصل بائیں ہاتھ والا آدمی ہوں۔

''مگر میں صرف 'بائیں ہاتھ والا' ہی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ تقریباً سب کچھ بائیں طرف ہی ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں یہ سوچنے میں بخل سے کام لے رہا ہوں کہ میرے اوپر تمام بلائیں، چاہے وہ آسمانی ہوں یا زمینی، بائیں طرف ہی کیوں نازل ہو رہی ہیں۔ مگر قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے، بھلے ہی اس کے جسم کا بایاں یا دایاں حصہ بالکل ہی بے کار کیوں نہ ہو جائے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر کل کلاں کو میرے اوپر فالج بھی گر جائے تو جناب، جسم کا بایاں حصہ ہی بے کار ہوگا۔''

Scanned with CamScanner

۲

اور یہ حقیقت تھی کہ وہ صرف بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا کوئی عام سا آدمی نہیں تھا۔ کیا یہ کسی قسم کا کینسر ہو سکتا تھا؟

ممکن ہے کہ جسم کا دفاعی نظام کچھ اس طرح متاثر ہوا ہو کہ ہر قسم کی بیماری، کمزوری، معذوری اور تکلیف اِدھر ہی کو چلی آ رہی ہو۔ یعنی اس کے جسم کے بائیں حصے میں۔ ویسے جراثیم کے بارے میں تو کوئی تجسس نہ تھا، کہ وہ تو آسمان سے ست روی کے ساتھ نیچے اتر ہی رہے تھے؛ خلا سے آ رہے تھے، بوندوں کی طرح انسانوں کے مقدر پر گرتے ہوئے۔ تجسس تو یہ تھا کہ آخر یہ سب کیا تھا جو اس کے جسم کے بائیں طرف کو ہی متاثر کرتا تھا۔ شاید اس کینسر کے پاس اور کوئی کرشمہ ہی نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کے بائیں نظامِ اعصاب پر ہی اپنی ڈگڈگی بجائے؟

مگر موت بھی تو تھی۔ مسئلہ تو بیماری کے بعد مرنے کا تھا۔ موت تو صرف بائیں طرف ہی نہیں آتی۔ مگر یہ بھی کون جانتا ہے کہ کوئی شخص بیمار ہی پڑ کر مرے گا۔ اب یہ تو بظاہر ایک مضحکہ خیز مگر درحقیقت ایک پُر اسرار فہرست کو پڑھنا ہے کہ اس کی بائیں آنکھ سے پانی نکلتا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ پھڑکتی رہتی تھی۔ پیر کی رگ اکثر کھنچ جایا کرتی تھی مگر وہ صرف بایاں پیر ہوتا تھا۔ بائیں طرف کے گردے میں ہمیشہ سوجن رہتی تھی۔ اس میں پتھری بن گئی تھی۔ بائیں پیر کے انگوٹھے میں اکثر ٹھوکر لگ جایا کرتی تھی۔ اس میں پیپ پڑ کر ناخن نیلا پڑ جایا کرتا تھا۔ بچپن میں کبھی پیٹ میں درد ہوتا تو وہ صاف محسوس کرتا کہ درد دراصل پیٹ کی الٹی طرف ہی ہو رہا ہے۔ منھ میں بائیں طرف کی ڈاڑھ گل گل کر گر چکی تھی اور وہاں اکثر درد رہتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ بچپن میں نزلہ بگڑ جانے کے باعث اس کے کان بند رہنے لگے تھے اور ان میں ہر وقت ہوا سیٹیاں سی بجاتی رہتی تھی۔ مگر الٹا کان زیادہ تر بہتا بھی رہتا تھا۔ اکثر رطوبت نکل کر کان کی لو سے بہتی ہوئی گردن تک پہنچتی تھی۔ ایسے وقت اگر بہن اسے دیکھتی تو بہت پیار کے ساتھ روئی یا کسی کپڑے کی دھجی سے اسے صاف کر دیتی۔ بائیں طرف بغل میں چھوٹے چھوٹے بے شمار کالے مسے تھے۔

حد تو یہ تھی کہ اُمس بھرے دنوں میں اس کا پورا بایاں جسم گرمی دانوں سے پھل جایا کرتا، مگر دائیں طرف ایک ننھا سا دانہ بھی نہ ابھرتا۔

Scanned with CamScanner

اور کوئی یقین کرے یا نہ کرے، اس ستم ظریفی سے تو وہی واقف تھا کہ کچھ عرصے سے اس کے بائیں فوطے میں پانی آ گیا تھا اور وہ پھول کر غبارہ بنتا جا رہا تھا۔ اس صورت میں اٹھنا بیٹھنا اس کے لیے کم تکلیف دہ نہ تھا۔

اب جہاں تک اس کے جسم کے دائیں حصے کا سوال تھا تو ادھر بچپن سے لے کر اب تک ایک آدھ بار صرف خراش ہی آ گئی ہوگی۔ ورنہ موچ ہو یا کوئی چوٹ، سب بائیں طرف ہی وقوع پذیر ہوتا تھا۔ دایاں تو صاف اور بے داغ پڑا تھا۔ وہ الٹے پیر پر زور دے کر، قدرے بائیں کو ہی جھک کر چلتا تھا، لہٰذا نہ صرف یہ کہ الٹے پیر کی ایڑی ہمیشہ دکھتی رہتی تھی بلکہ اس پیر کی چپل کی ایڑی بھی ہمیشہ گھسی اور شکستہ حالت میں نظر آتی تھی۔

اس کا گلا دائمی طور پر خراب رہتا تھا اور اسے ہمیشہ ہلکی ہلکی کھانسی رہتی تھی، مگر جب منھ پھاڑ کر وہ آئینے میں اپنا گلا دیکھنے کی کوشش کرتا تو صرف بایاں غدود ہی سوجا ہوا اور سفید پیپ سے بھرا ہوا نظر آتا۔ کبھی کبھی دل سا گھبراتا اور سینے میں بائیں طرف میٹھا میٹھا درد محسوس ہوتا۔ اس وقت وہ سینے کے دائیں طرف درد ہونے کی دعا مانگا کرتا۔ ریڑھ کی ہڈی کی گریا اکثر اِدھر اُدھر ہو جاتی مگر درد، وہ تو ٦٠
صرف بائیں طرف ہی ہو رہا ہوتا۔

یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر لفظ ''بیماری'' کی تصویر اتاری جا سکتی تو اس کے جسم کے بائیں حصے سے بہتر کوئی منظر نہ ہوتا۔ یہ کسی کینوس کی سیاہی نہیں بلکہ اصل اور خالص بیماری کی مکمل تصویر ہوتی۔

آخر کیوں؟ کچھ بھی دائیں طرف کیوں نہیں ہوتا۔ ساری مصیبت، تمام آفت آخر بائیں طرف ہی کیوں تھی؟

آخر تھا نا بہت عجیب اتفاق اور ساتھ ہی مضحکہ خیز بھی جس پر ٹھٹھا مار کر ہنسا جا سکتا تھا۔ یعنی وہ صرف بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا ایک عام سا آدمی نہ تھا۔

''تو بائیں طرف چلنا کیوں اچھا ہے؟'' بچپن میں اس نے باپ سے سوال کیا تھا۔

''امن و امان کے لیے،'' باپ نے جواب دیا۔

''امن وامان کے لیے...امن وامان کے لیے...''اس نے دہرایا۔
مگر شاید صرف بائیں طرف چلنا ہی اچھا تھا اور سب برا تھا۔

اس دن جمعرات تھی۔ کسی کے گھر سے فاتحہ کا سالن آیا تھا۔ مرغ کا سالن۔ وہ جلدی سے ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ تام چینی کے پیالے میں بوٹیاں اور شوربہ چمک رہا تھا۔ اس نے خوش ہو کر نوالہ توڑا۔

لکڑی کا ایک موٹا سا بیت اس کے بائیں ہاتھ پر پڑا، وہ درد سے بلبلا گیا۔ ہاتھ لال ہو گیا۔ نوالے میں پھنسی ہوئی مرغ کی بوٹی فرش پر بکھر گئی۔ وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

''اور کھا الٹے ہاتھ سے! اگر تو نے الٹے ہاتھ میں نوالہ تھاما تو آج ہاتھ ہی توڑ کر الگ کر دوں گا!'' باپ غصے میں چیخا اور اس کی لمبی سفید داڑھی زور زور سے ہلنے لگی۔ وہ محلے کی مسجد میں موذن تھا۔

''کتنی بار سمجھایا ہے کہ الٹا ہاتھ شیطان کا مسکن ہے، ناپاک ہے۔ اس سے آب دست لیا جاتا ہے۔'' باپ دوبارہ گرجا۔

ایسا ہمیشہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہ کھانے کے سامنے سہما سہما سا بیٹھا رہتا۔ جب باپ مسجد میں اذان دینے کے لیے گھر سے باہر جاتا تو چھوٹی بہن اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور اپنے سیدھے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اسے کھلانے لگتی۔ اس وقت اس کی دائیں آنکھیں سے آنسو اور بائیں آنکھ سے شاید پانی بہنا شروع ہو جاتا۔ وہ جب بھی سونے کے لیے لیٹتا تو بائیں طرف کروٹ لے کر ہی اسے چین ملتا اور نیند آتی۔ تب باپ اسے جھنجھوڑ کر سوتے سے اٹھا دیتا۔

''پھر لیٹا اس طرح! بائیں کروٹ سے لیٹنا یا سونا سنت نہیں ہے۔ تمام عمر آنتیں سڑتی رہیں گی!''

ڈر کے مارے اس کا پیشاب نکل جاتا۔

مگر افسوس کہ یہ تمام نصیحت اور ڈانٹ پھٹکار رائیگاں ہی گئی۔ نہ اس نے بائیں ہاتھ سے کام کرنا چھوڑا اور نہ ہی کبھی دائیں طرف کروٹ لے کر اس کی آنکھ لگ سکی۔

Scanned with CamScanner

ایک دن اس کا باپ اسے نیک اور جنتی آدمی دیکھنے کی آرزو دل میں لیے لیے اس دنیا سے چلا گیا۔ اس دن محلے کی مسجد میں کسی اور نے اذان دی اور اس امر کا انکشاف اس پر باپ کے مرنے کے بعد ہی ہوا کہ اس کے گھر میں کتنے بہت سے قرآن شریف موجود تھے۔

اب شام بیت گئی تھی۔ اندھیرا اچھل چلا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا بولے ہوئے لفظ اور تحریری لفظ کی آپسی ہم آہنگی کو پرکھ رہا تھا۔

''میر باقی بابر کا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو دراصل ابراہیم لودھی کا صوبیدار تھا۔ ابراہیم لودھی سے اس کی غداری ایک پُر اسرار امر ہے اور اس کی وجوہات اس کی غداری سے بھی زیادہ پُر اسرار۔ اس نے پہلے سے تعمیر شدہ ایک مسجد بڑی خوش دلی کے ساتھ بابر سے منسوب کر دی۔ جس طرح لوگ اپنی تخلیق کردہ کتاب کو کبھی کبھی کسی بڑے ادیب وغیرہ کے نام کر دیتے ہیں۔ اس کا یہ اقدام ایک بڑے جغرافیائی خطے پر امن و امان کا پیش خیمہ بھی تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ سڑک پر بائیں طرف چلتے ہوئے امن و امان اور سلامتی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''میں نے مندرجہ بالا عبارت کو بائیں ہاتھ سے لکھنے کی ایماندارانہ کوشش کی تھی۔ مگر کیا کروں؟ مجبور ہوں۔ درد کی لہر سے پورا ہاتھ تنا رہا ہے۔ اب یہ کام تو مجھے کرنا ہی ہے، سوسیدھے ہاتھ سے ہی سہی۔ تاریخ کے جبر سے آزادی ہی میرا اوّلین اور آخری مقصد ہے۔ مگر مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ تاریخ کا جبر تو ایک مہمل سی بات ہوئی۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ 'جبر' اپنی ماہیت میں ہوتا ہی صرف 'تاریخ' ہے، اور کچھ نہیں۔ اب اس بات کو کچھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ چاہے ایک جھٹکے میں آپ کے ہاتھ پیروں کے انگوٹھوں کو کاٹ کر پھینک دیا جائے یا ان کے ناخن اُکھاڑ دیے جائیں، تو یہ سب تاریخ ہے۔

''ہاں تو اصل میں گرم ممالک کے رہنے والوں کے لیے جمہوریت اور سرد ممالک والوں کے لیے بادشاہی مناسب ہے۔ جس طرح ایک واستوکار الگ الگ مقاموں پر اپنے لیے بنائے گئے مکانوں کی مٹی انھیں مقامات سے منتخب کرتا ہے، ملکوں کا مقصد بھی اسی طرح طے ہوتا ہے۔ اور پھر جیوتش بھی تو ہے۔ وہ تو جغرافیے کا سب سے اہم عنصر ہے۔ ستارے اور سیارے ایک جغرافیائی اکائی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ان کا اثر ملکوں پر نہ پڑے گا تو کیا محض انسانوں کے مقدر پر پڑے گا؟

Scanned with CamScanner

''اور یوں تو ملک ایک روحانی اکائی ہے۔ ہر ملک اور اس کی تاریخ پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک عظیم روحانی تجربے میں بدل جاتی ہے۔ کیونکہ جب خدا اپنے آپ کو عظیم وسعت میں دیکھنا پسند کرتا ہے تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی قلب ماہیت مملکت میں کرے۔ ویسے تو خیر خدا نقطے میں سمٹ جائے پھر بھی وسعت کا سراغ ہی دیتا ہے۔ اب دیکھیے کہ نادار، لاچار، اپاہج اور مظلوم، سب میں اس کا قیام ہے۔ یہ سب وسعت کی مثالیں نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور وسعت میں طول البلد اور عرض البلد کی شمولیت کس قدر لطیف ہے، اس کے بارے میں بیان کرنا تو یقیناً تضیع اوقات ہوگا، جس کے لیے فی الحال میں تیار نہیں ہوں۔ مگر یہ بات ایک بار پھر قبول کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے جغرافیہ سے عشق ہے۔ مجھے آرمینیا کے گھاس کے میدان اور بھیڑیں بہت اچھی لگتی ہیں اور دوسری بات یہ کہ میں بائیں طرف سے سخت بیمار ہوں۔

''میرا سارا بایاں کمزور ہے۔''

۳

یہ کبھی نہیں پتا چل پایا کہ اس کے گھر میں جغرافیہ کے اتنے نقشے کہاں سے اکٹھا ہو گئے تھے۔ بہت سے کلامِ مجید، حدیث وفقہ کی کتابیں، طب کے نسخے اور ڈھیر سارے مخطوطے تو اس کے باپ اور دادا کے زمانے سے گھر میں اکٹھا ہوتے چلے گئے ہوں گے، مگر جغرافیہ کے اتنے ڈھیر سارے نقشے؟ ان میں سے بیشتر تو متروک ہو چکے تھے۔ وہ کسی اور زمانے کا جغرافیہ پیش کرتے تھے۔ اگر اس کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ان پھٹے حال اور متروک نقشوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا۔ مگر ان کا کاغذ گل کر پھٹنے لگتا تو وہ بے حد تن دہی کے ساتھ اس کو اپنی جگہ پر چسپاں کر کے ہی دم لیتا۔ مجال ہے کہ کوئی پہاڑ، کوئی ندی، کوئی سمندر، نقشے پر سے سرک کر کہیں غائب ہو جائے۔ وہ تتلی سے تتلی کترن کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا۔

اگرچہ اس احساس سے وہ بھی بیگانہ نہ تھا کہ جس دور میں وہ جی رہا تھا، اس میں شاید جغرافیہ کی موت واقع ہو چکی تھی۔ نئی ٹیکنالوجی اور نئے شعبدوں والے انسان نے جغرافیہ میں یقین کرنا بند کر دیا تھا۔ دنیا پتا نہیں کون سے گاؤں میں بلکہ ''چھپر'' میں بدل گئی تھی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا فقط ایک نیلے غبار کے سوا؟

Scanned with CamScanner

مدرسے میں، جہاں وہ پڑھاتا تھا، دنیا کا نقشہ اس کی پشت پر دیوار سے ٹنگا رہتا۔

''بتاؤ۔کوہِ قاف کہاں ہے؟'' وہ تقریباً دہاڑتا۔

جب کوئی طالب علم نقشے کو غور سے دیکھ کر جواب دینے کی کوشش کرتا تو وہ اپنے بائیں ہاتھ میں رول اٹھا کر بغیر پیچھے مڑے، اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے رول کو اپنے سر یا کندھے سے اوپر لے جاتے ہوئے پیچھے دیوار پر ٹنگے ہوئے دنیا کے نقشے پر زور سے مارتا اور رول ناقابلِ یقین طور پر ٹھیک کوہِ قاف پر پہنچ کر گویا چپک سا جاتا۔

''یہ رہا کوہِ قاف، بحیرۂ اسود سے بالکل ملا ہوا!'' وہ جوش اور مسرت سے چیختا اور اس کی بائیں آنکھ بری طرح پھڑکنے لگتی۔

ویسے اس خیال سے وہ بھی متفق تھا کہ اس سیارے کو ''زمین'' کا نام دینا گمراہ کن تھا کیونکہ اصل میں تو یہ ایک ''مہاساگر'' تھی۔

جہاں تک زمین کی اندرونی حالت کا سوال تھا تو اس ضمن میں اس کی واقفیت دوسروں کی طرح بہرحال محدود تھی۔ وہ بس یہی جانتا تھا کہ یہ بہت بھاری تھی اور شاید لوہے کا ایک ٹھوس جسم تھی۔ اس اندرونی لوہے کے گولے پر ایک موٹی تہہ بہت گرم پگھلی ہوئی چٹانوں کی تھی۔ اور اس تہہ کے اوپر زمین کی وہ پپڑی تھی جس پر انسان رہتے تھے۔ اس پپڑی کے کچھ حصے دوسروں سے کچھ اوپر نکلے ہوئے تھے۔ خشک حصہ زمین کہلاتا تھا۔ نشیبی حصہ پانی سے ڈھکا تھا جس کو سمندر کا نام دیا گیا تھا۔

نقشے پر پانی کا نیلا رنگ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ گھنٹوں اسے دیکھتا رہتا۔ سمندروں کا گہرا نیلا اتھاہ پانی ساتھ ہی اسے اداس بھی کر دیتا۔

پہاڑ اسے ہمیشہ پُر اسرار، افسردہ مگر قوتِ استقلال سے بھرے ہوئے نظر آتے۔ وہ زمین کو سایہ دار قناتوں کی طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ پہاڑ دو قدرتی خطوں کو جدا بھی کرتے تھے مگر یہ کہنا آسان نہ تھا کہ کہاں ایک قدرتی خطہ ختم ہوتا ہے اور کہاں دوسرا شروع ہوتا ہے۔ اونچی سرزمین پہاڑیوں سے آہستہ آہستہ ڈھالو ہوتی ہوئی خشک ہو کر ریگستان میں بدل جاتی تھی۔

اسے نقشے میں یہ سب دیکھ کر بہت الجھن ہوتی تھی کہ ہر چند ایک خط نقشے میں دو قدرتی خطوں کو الگ کرتا ہے مگر درحقیقت یہ کہنا مشکل ہے کہ خط کہاں سے کھینچا جائے۔ اس کی یہ الجھن کبھی

Scanned with CamScanner

کبھی اتنی بڑھتی کہ ناک کے بائیں نتھنے سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا۔

اور پھر وہ زلزلے بھی تو تھے جو زمین کے اندر ایک اندھیری تنہا دراڑ پیدا کر کے اس کے ہی وجود کے ایک حصے کو دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیتے تھے۔ مختلف براعظم جو کبھی ایک تھے، صرف ان بھیانک اور بدنیت زلزلوں کی ہی دین تھے۔ ایک حصہ کھسکنے لگتا تھا۔ خاموشی کے ساتھ کہیں اور چلے جانے کے لیے۔ مگر اسے خوف نہ زلزلوں سے آتا نہ ان خوفناک کالی آندھیوں سے جو کچھ دیر کے لیے نہ صرف دنیا کو تاریک کر دیتی تھیں بلکہ اس کا مقدر ہی بدل کر رکھ دیتی تھیں۔ اسے چندن کے جنگلوں سے بھی ڈر لگتا جن پر مشہور ہے کہ صد سالہ بوڑھے سانپ دبلے ہو کر اڑتے ہوئے آتے ہیں۔ کمزور، بوڑھے اور مہیب حد تک دبلے پتلے سانپ نہ جانے کہاں سے اپنے تاریک اور سنسان بلوں کو اور بھی ویران کر کے چندن کے درختوں سے آکر چمٹ جاتے ہیں۔ ان سانپوں کے جسم سے چھو کر آنے والی ہوا انسان اور چرند و پرند سب کے لہو کو منجمد کیے دیتی ہے، لقوہ مارے دیتی ہے۔ یہ موت کی زہریلی خوشبو ہے۔ وہ اکثر نقشے میں چندن کے درختوں اور ان پر لپٹے دبلے بوڑھے سانپوں کو تلاش کرنے کی بے معنی اور ناکام کوشش کرتا۔

یوں تو دنیا کا، بلکہ کسی بھی ملک کا پھیلا ہوا نقشہ اس کے لیے طمانیت کا باعث تھا مگر پھر بھی وہ اکثر نقشے میں مشرقی ہمالیہ کے ان خطوں کو تلاش کرنے لگتا جہاں کے باشندے جنگل کے ایک چھوٹے سے حصے کو جلا ڈالتے ہیں۔ اس جلے ہوئے جنگل کی راکھ کچھ عرصے کے لیے وہاں کی مٹی کو زرخیز بنا دیتی ہے۔ وہ سوچتا کہ پہاڑ کی ڈھلانوں پر جلتے ہوئے جنگل کی روشنی دور سے بہت خوبصورت نظر آتی ہوگی، مگر خوبصورتی کی اپنی ایک نجی دہشت بھی تو ہوتی ہے۔

نقشے میں ہی اکثر وہ ایسی جگہیں یا نقطے تلاش کرنے کی تگ و دو میں بھی لگا رہتا جو اس لیے وہاں نظر آنا ممکن نہ تھے، کہ یا تو نقشے کا سائز ایسے مقامات کے لیے چھوٹا پڑ جاتا تھا یا اس کا کاغذ میلا اور گھس گیا تھا۔ مثال کے طور پر بلند کوہستانوں کی وہ گہری، بے سراغ تاریک وادیاں جن میں پرندے نہ جانے کون سے پراسرار دکھ اور ناقابل فہم مایوسی سے تنگ آکر گر گر کر خودکشی کرتے تھے۔ مگر وہ موہوم نقطے نقشے پر ہمیشہ ندارد رہے۔ ایسے وقت اسے اپنے سارا پایاں جسم چیونٹیوں اور خارش کی زد میں آیا ہوا محسوس ہوتا۔

اگرچہ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ سب بدل رہے تھے۔ یعنی سردی گرمی میں تبدیلی آرہی تھی۔ تمام ندیوں کے ماخذ سکڑتے جا رہے تھے۔ برف کے تودوں نے اپنا راستہ بدلا تھا۔ میدانی علاقوں میں

Scanned with CamScanner

مانسون اجاڑ منھ لیے سنکیوں کی طرح بھٹکتا تھا۔ وہ بارش بھی نہ جانے کب سے نہیں ہوئی تھی جو تاریخ کو دھو کر جنگل کو ہرا کر دیتی ہے۔ یعنی اشیا ٹھیک اپنی پٹڑی پر نہیں چل رہی تھیں۔ مگر بہر حال یہ تشفی بخش تھا کہ وہ سب اس زمین پر موجود تھے۔ کم از کم ابھی تو ان کے ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ مثال کے لیے وہ آتش فشاں بھی تو تھے جو اپنی آگ اُگل کر تھک کر سو گئے تھے۔ وہ قبروں کی مانند تھے۔ ان کے دہانوں پر جھاڑیاں اور پودے اُگ آئے تھے۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی جھیلیں نمودار ہوگئی تھیں۔ وہ اب ویران پڑے تھے اور اس لیے وہاں آبادی بسنا شروع ہوگئی تھی، جس طرح قبرستان کے آس پاس بازار لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ مگر کون وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ اب دوبارہ نہ زندہ ہو سکیں گے؟

جغرافیہ کا وہ ایک بوسیدہ سا رنگین نقشہ کیا تھا، ایک سجی سجائی محفل، ایک بقعۂ نور اور ایک کارنیوال جیسا اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

جب وہ تھک جاتا اور اس کے بائیں کان میں سیٹیاں سی بجنا شروع ہو جاتیں تو گیا ہستان اور وسیع و عریض کوہستانی جنگل اس پر اپنا سایہ کرنے لگتے۔ جنوب مغربی مانسون اپنی پوری قوت کے ساتھ چلتا ہوا آتا اور پہاڑ کی چوٹیوں سے ٹکرا کر سفید کہرے میں بدل جاتا۔ طوفانی بارش اور گرج چمک میں وہ ایک جوگی کی طرح آسن مارے بیٹھا رہتا اور اس کے بائیں جسم پر ابھرے ہوئے گرمی دانے ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جاتے۔

یا کبھی کبھی وہ خود کو شاندار، خوبصورت اور گھنے چیڑ کے درختوں میں چکر کھاتا ہوا محسوس کرتا۔ ان درختوں کے نیچے زمین پر بھورے پھول پھیلتے رہتے جن کی خوشبو اس کے دم کو تازہ کر دیتی۔ جب وہ اور قریب سے گزرتا تو اسے نظر آتا کہ جہاں کہیں چیڑ کے درخت کا چھڑا اُکھڑ گیا ہے وہیں پر گاڑھا گاڑھا گوند نکل کر سطح پر جم گیا ہے۔

وہ نقشے پر پنسل پھیرتے وقت اکثر کسی پہاڑ چشمے کے کنارے کنارے بہت سے جھرنوں اور دونوں اطراف کے گھنے جنگلوں کا دشوار گذار سفر طے کرتا ہوا بہت بلندی پر پہنچ جاتا جہاں ہوا بہت ٹھنڈی تھی، چشمے کا پانی بھی برف تھا۔ وہ دیکھتا کہ چشمہ برف کے ڈھیر میں بنے ہوئے ایک سوراخ سے بہہ رہا تھا، پہاڑ کی بلندیوں تک برف ایک دریا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ یہ منجمد دریا گلیشیر تھا۔ کچھ قومیں بھی ایسی ہی تھیں، تاریخ میں ہرگز نہیں بلکہ صرف زمین پر، جو منجمد نظر آتی تھیں، اس گلیشیر کی

Scanned with CamScanner

طرح۔ مگر یہ آہستہ آہستہ بلندیوں سے نیچے کھسکتا ہوا، لڑھکتا ہوا اور پگھلتا ہوا دریا کی شکل میں بدل رہا ہے۔ کتنی قومیں اسی طرح جلاوطن ہوتی جاتی ہیں، بغیر جلاوطنی کے احساس کے۔ ندیوں میں بدل کر بھی ان کا مقدر اختتام تک نہیں پہنچتا۔ دنیا کے اوپر بہتی ہوئی، جاتی ہوئی، پیچ در پیچ تنگ گھاٹیوں سے نکلتی ہوئی ندیاں، جن کا دراصل کوئی وطن نہ تھا۔

ہاں، چٹانوں کے بارے میں سوچ کر وہ اداس ہو جاتا۔ پہاڑ رفتہ رفتہ گھس رہے تھے۔ تغیر آہستہ آہستہ مگر مسلسل ہو رہا تھا۔ سمندر ان چٹختے پہاڑوں سے بھر رہا تھا۔ کچھ چٹانیں ٹوٹ رہی تھیں تو کچھ بن بھی رہی تھیں۔ افسوس کہ سب چٹانوں کی عمر ایک نہ تھی۔

مزے کی بات یہ تھی کہ اسے کچھ خطرناک چیزوں سے بھی انس تھا۔ مثلاً اپنی حرکات سے چٹانوں کو موڑ دینے اور زمین کی سطح پر بڑی بڑی جھریاں ڈال دینے والے ہولناک زلزلے یا ریگستانوں میں چلنے والی دھول بھری آندھیاں اور ساحلی علاقوں میں آنے والے سخت اور بھیانک طوفان۔ ان سب سے اس کا بے حد رومانی تعلق تھا۔

مگر سب سے زیادہ رومان تو وہاں تھا، اور وہی سب سے خوبصورت، سب سے نیک اور سب سے زیادہ بااخلاق بھی تھے، یعنی جنگل۔ طرح طرح کے جنگل۔ سخت بارش ہونے والے علاقوں میں سال بھر ہرے رہنے والے سدابہار جنگل، یا خود کو سورج کی گرمی سے بچانے کے واسطے اپنی پتیاں خاموشی سے گرا دینے والے اداس مانسونی جنگل؛ برائے نام بارش والے علاقوں میں خاردار جھاڑیوں والے بیمار جنگل یا بہت زیادہ اونچائی پر پائے جانے والے چوڑی پتیوں اور بغیر شاخوں والے درختوں سے بنے ہوئے اور رعونت سے بھرے ہوئے جنگل۔ وہ ان جنگلوں میں خوش ہو ہو کر راستہ بھول جاتا اور ان کی ہواؤں میں اس کا بایاں جسم جھومنے لگتا۔

تو یہ تھی ایک سجی سجائی محفل جہاں وہ خود اپنے وجود سے بھی کب کا بیگانہ ہو چکا تھا۔

۴

یقیناً یہ سچ تھا کہ اپنی تمام زندگی میں اس نے شہر سے باہر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ محلے تک سے باہر نکلنے کا اتفاق برسوں میں ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب دورہ پڑتا تو مدرسے والوں کو اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر

تک بھی چھوڑنا پڑتا تھا۔ دورے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب پڑ جائے گا۔ مرنے سے پہلے (اس کی ماں اسے پیدا کرنے کے ایک سال بعد ہی چل بسی تھی) ایک بار اس کی ماں نے اس کے باپ کو بتایا تھا کہ ایک رات اسے دودھ پلانے کے بعد جب وہ اسے سیدھا کر کے بستر پر اپنے برابر لٹا رہی تھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے کا بایاں حصہ بری طرح چمک رہا ہے۔ وہاں ایسی روشنی تھی جیسے ہزار ہا چراغ جل رہے ہیں۔ کچھ ایسے چراغ جن سے چہرے کو آگ بھی لگ سکتی تھی۔ اس شیر خوار بچے کا چہرہ بے حد سنجیدہ سا نظر آتا تھا مگر اس کے ہونٹوں سے جھاگ اڑ رہے تھے اور چہرے کی سنجیدگی قہر آلودگی میں بدلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ اور پیر کو بری طرح اینٹھ رہا تھا۔

لیکن اس کے باپ کو اس واقعے پر کبھی یقین نہ آیا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ان دوروں کی دوبارہ شروعات باپ کے مرنے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ اس کی بہن، جو اس سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی، ان دوروں کے بارے میں سب سے زیادہ جانتی تھی۔ ان دوروں کو پوری طرح پاگل پن قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس کی بہن جو محسوس کرتی وہ صرف یہ تھا کہ وہ چڑچڑا سا ہو جاتا تھا؛ بائیں طرف کا چہرہ بری طرح لال نظر آنے لگتا تھا اور اس پر ایک قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی جو دیکھنے میں اچھی نہیں لگتی تھی اور کسی پُر اسرار یا خطرناک بلکہ ہلاکت خیز شے کی طرف اشارہ کرتی تھی، کیونکہ ایسے وقت میں اس کے چہرے کا دایاں حصہ ویران اور تاریک پڑا ہوتا۔ دوسری اہم بات اس دورے میں یہ تھی کہ چلتے وقت ایسا صاف طور پر محسوس ہوتا جیسے اس کے بائیں جسم اور دائیں جسم کے درمیان ایک کشتی سی جاری ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ان دوروں میں وہ قاعدے سے چل نہیں پاتا تھا اور لوگوں کو اسے پکڑ پکڑ کر گھر تک چھوڑنا پڑتا تھا۔ مگر یہ دورے بہت مختصر سی مدت کے ہی ہوتے۔ ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ گھر میں سوائے غربت کے اور کوئی شے نہ تھی۔ بہن کے پاس کچھ روپیہ تھا جو اس نے اپنے حج پر جانے کے لیے پس انداز کر رکھا تھا۔

ایک دفعہ اس کی بہن اسے شاہ دانہ صاحب کے مزار پر ضرور لے گئی تھی۔ وہاں اس کے بائیں جسم پر آسیب کا سایہ بتایا گیا تھا۔ وہ مزار پر جا کر بری طرح افسردہ ہو جایا کرتا۔ وہاں اگربتی کے دھویں، خوشبو، پھول اور شیرینی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ قوالیوں کے شور میں خاموش بیٹھا خالی خالی نظروں سے مزار پر چڑھی ہوئی چادروں کو دیکھتا رہتا تھا۔ بہن اسے دم کیا ہوا پانی پلاتی، بازو پر تعویذ

Scanned with CamScanner

باندھتی۔ مگر کئی بار مزار پر حاضری دینے کے بعد بھی اس کے دورے یا بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

بہن نے اپنی تمام زندگی اس کے ساتھ رہ کر ہی گزار دی تھی۔ بہت پہلے ایک بار جب اس کی عمر چودہ سال کی تھی تو گھر میں آنے جانے والے ایک رشتے کے بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس وقت شاید اس کی بہن کے دل میں کچھ امنگیں جاگ اٹھی تھیں، مگر ٹھیک اسی وقت وہ گھر میں آگیا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے تھپڑ مارتے مارتے بہن کا منھ زخمی کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے بہن کے دل کی تمام امنگیں اور ارمان ہمیشہ کے لیے پتا نہیں کہاں جا کر دفن ہو گئے۔ وہ وقت سے پہلے ہی بے حد بوڑھی نظر آنے لگی اور تقریباً ہر وقت قرآن شریف پڑھتے رہنے کے سوا اس کی کوئی دوسری خاص مصروفیت نہیں رہی۔

اس گھر میں واقعی قرآن شریف کتنے تھے!

اس وقت بھی جب کھڑکی پر کھڑا وہ اپنی تحریر کو محویت کے ساتھ پڑھ رہا تھا تو ایک بڑا سا قرآن شریف ٹھیک اس کے سر پر بنے ہوئے مچان پر رکھا تھا۔

''میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ بدنیت حاسد مکھی کی طرح اس پر بھنبھنا رہی ہے، اسے ناپاک کرتی ہوئی۔ آپ کو اسے بھگانا پڑے گا، جغرافیہ کو خالص طور پر محسوس کرنے کے لیے اپنے شعور کے تمام مفروضوں کو، تمام مغالطوں کو، ایک طرف قوسین میں رکھنا ہوگا تاکہ اسے بالکل اسی طرح سمجھا جاسکے جس طرح آلۂ حواس اسے محسوس کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے انسان ایک ننگے پستان کے سامنے تھرتھراتا ہے۔

''یہ سب کام لفظوں کے ذریعے ہی ممکن ہے، مگر صرف تحریری لفظ ہی یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے، کیونکہ بولا گیا لفظ نہ دایاں ہوتا ہے نہ بایاں، اور ساری غلط فہمیاں یا خوش فہمیاں لکھے گئے لفظ کے ذریعے ہی تشکیل پاتی ہیں۔ یہ بات مجھے بہت پریشان کر رہی ہے مگر ساتھ ہی یہ بہت معنی خیز بھی ہے کہ دائیں ہاتھ سے لکھتے وقت الفاظ میری نافرمانی کیوں کرنے لگے ہیں؟ اگرچہ میں اس نافرمانی کی وضاحت کرنے کے قابل نہیں ہوں پھر بھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ میری روح کے کسی جز کا مذاق بنا رہے ہیں، اسے چھیڑ رہے ہیں۔ لیکن اس مذاق کی سزا بھی ایسی ہے جیسے کسی کے چھیڑنے پر شہد کی مکھیوں کا ڈگارا اسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔

''میرا وجود بھی اب لفظوں کے ساتھ اس طرح اڑا پھرتا ہے جیسے شہد کی مکھیوں کا ڈگارا۔ وجود •

Scanned with CamScanner

میرے جسم کو بھول جاتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کا خالی، ویران، بدنما چھتا... کسی پیڑ کی شاخ میں اٹکا ہوا، کسی دروازے کے بدرنگ کواڑ کے کونے میں چپکا ہوا میر اضوی اور خود سر وجود موذی شہد کی مکھیوں کی طرح لفظوں کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ لفظ جو شعور کی دھند میں دائروں کی طرح گھوم رہے ہیں، ہواؤں کے شانوں پر بیٹھے الفاظ یوں ہی تفریح بازی میں مصروف ہیں کہ اچانک میری ضرب ان پر پڑتی ہے۔

''تب یہ جسم، ایک خالی چھتا، ایک بدرنگ سفیدی سے بنا ہوا خانہ دار اجسام، بس کپکپاتا رہتا ہے، ڈولتا رہتا ہے۔ جسم کی طرح نہیں، جسم کی پرچھائیں کی طرح۔ خالی ویران چھتے میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں۔ بس وہ ننگی شاخوں پر ناچتا ہے، کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔

''تمھیں واپس آنا ہوگا۔ لفظوں کو اپنی اصل شکل کی طرف۔ ورنہ میں ڈنک مار کر ان کا چہرہ اس طرح سُجادوں گا جس طرح شہد کی مکھی اپنے چھیڑنے والے کو ڈس کر سجا دیتی ہے۔

''دائیں بائیں میں اتنا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دھوکے بازی ہے۔ آخر بایاں اور دایاں ہے کیا؟ کیا اِدھر دوسری روح ہے اور اُدھر دوسری؟

''بائیں روح، دائیں روح؟''

اس کے بائیں کان سے رطوبت بہہ رہی تھی اور اس میں زور زور سے سیٹیاں بج رہی تھیں۔

یہ جسم کا پیچیدہ جغرافیہ تھا۔

۵

''تو بائیں طرف چلنا کیوں اچھا ہے؟'' بچے نے باپ سے پوچھا تھا۔

''امن وامان کے لیے،'' باپ نے جواب دیا تھا۔

''امن وامان کے لیے... امن وامان کے لیے...'' بچے نے دہرایا تھا۔

ہر قسم کے جغرافیائی نقشے کا علم یوں تو اُسے بھرپور تھا اور نقشے کی باریک سے باریک تکنیک کو وہ مکمل طور پر جانتا تھا۔ نقشہ اس کے لیے آئینے کی طرح تھا جس پر جھک کر وہ گویا اپنا چہرہ تکتا رہتا تھا۔ کسی جھیل کے کنارے نہیں، بلکہ اپنے میلے سے بستر پر بیٹھ کر۔ یہ نرگسیت تھی مگر معکوس۔

Scanned with CamScanner

مگر پھر بھی، پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی مشرق اور مغرب کی سمت کا تعین وہ نہ کر پاتا۔ وہ مشرقی خطوں کو کبھی کبھی مغرب میں تلاش کرنے لگتا تھا۔ ایک سیدھا سا اصول ویسے تو یہ تھا کہ مغربی خطے ہمیشہ اس کے بائیں ہاتھ پر رہتے تھے مگر پتا نہیں کیوں وہ انھیں دائیں ہاتھ پر تلاش کرنے لگتا تھا، حالانکہ اس قسم کا مغالطہ تو اسے ویسے بھی ہوتا ہی رہتا تھا۔ ان دنوں میں بھی جب اس پر وہ دورے نہیں پڑا کرتے تھے، وہ سیدھا منھ اٹھائے اپنے گھر کو جا رہا ہوتا، اچانک وہ تمام درخت، مکانات، دکانیں اور ان کے سائن بورڈ اس کے الٹے ہاتھ کی طرف پڑنے لگتے جو دراصل اس کے دائیں ہاتھ کی طرف تھے۔ یہاں تک کہ پانی کا وہ نل بھی جو اس کی گلی کے موڑ پر تھا کبھی تو دائیں طرف آ جاتا اور کبھی بائیں طرف۔

مگر مسجد کے گنبد اور میناروں سے راستہ بھولنے کا یا بھٹک جانے کا اندیشہ تقریباً ختم ہو جاتا کیونکہ وہ بہت دور سے ہی نظر آ جاتے۔ مگر یہاں بھی وہ مسئلہ تو برقرار تھا کہ مسجدیں جو اس نے زیادہ تر بائیں ہاتھ کی طرف دیکھی تھیں اور ان کے بائیں ہاتھ کی طرف ہونے کا اس کا یقین بھی تھا، اچانک کسی نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر دائیں ہاتھ پر نمودار ہو جاتیں۔ یہ الجھن اس کے لیے بے حد ذاتی نوعیت کی تھی اور ایک آدھ بار اپنی بہن کو اس بارے میں بتا دینے کے علاوہ وہ کسی کو اس میں شریک نہ کر سکا تھا۔

مدرسے کے عقب سے جاتی ہوئی پتلی ویران سڑک کے کنارے وہ تالاب اسے پسند تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ سارے تالاب اسے بہت پسند تھے اور وہ ان کو دیکھنے کے لیے محلے سے نکل کر آس پاس مضافات میں بھی چلا جاتا۔ ایسے تالاب اسے بہت پُر اسرار نظر آتے جن میں جل کھمبی اُگ آئی ہو۔ ان کی دلدل لامتناہی امکانات سے بھر کر آسیب زدہ سی ہو جاتی تھی۔ وہ ندیاں بھی اسے بہت زیادہ پسند تھیں جن کے بہاؤ کو اِدھر اُدھر روک کر ان میں سنگھاڑے کی بیلیں اُگا دی جاتیں۔ مگر یہ منظر دیکھنے کے لیے اسے جاڑوں کی شروعات کا انتظار کرنا پڑتا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا جب صبح اور شام دونوں پر نامعلوم سی افسردہ دھند چھانا شروع ہو جاتی۔ اس زمانے میں وہ راستہ بھولا کرتا۔ مگر شاید یہ راستہ بھولنا نہیں تھا بلکہ صرف دائیں اور بائیں کا فرق فراموش کر جانا تھا، اور اس کا انجام یہ تھا کہ جل کھمبی سے پٹے ہوئے سبز تالاب اور سنگھاڑے کی بیلوں سے ڈھکی کمزور ندیاں کبھی دائیں تو کبھی بائیں نمودار ہو کر شیطنت سے اسے چڑاتی بھی رہتیں اور اپنے متحرک امکانات کی آسیبیت سے اسے دہشت زدہ بھی کرتی رہتیں۔

اور یہ واقعی دہشت ہی کی بات تھی کہ اس کا منھ ناک کی سیدھ میں اپنے گھر کی طرف ہوتا، مگر

Scanned with CamScanner

اچانک اسے احساس ہوتا کہ وہ تو گھر سے دور بہت دور اس کی طرف سے پیٹھ کیے مخالف سمت میں کہیں چلا جا رہا تھا۔

حواس باختہ ہو کر بھٹکتے رہنے کے بعد آخر کار جب اپنے گھر کی چوکھٹ اسے نظر آتی تب جا کر اس پر اپنے مغالطے کا بھید کھلتا۔

''سنو، آج پھر میرے ساتھ وہی ہوا،'' وہ اعصاب زدہ ہو کر بہن سے کہتا۔

''کیا ہوا؟'' بہن گھبرا کر سوال کرتی۔

''وہ تالاب پھر اُدھر کو پڑا،'' وہ بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کرتا۔

''تمھارا منھ کدھر کو تھا؟''

''گھر کی طرف۔''

اور تب بہن اسے 'مت کٹے' کے بارے میں بتاتی۔ 'مت کٹا' بھی شیطان کی ہی ایک قسم ہے۔ روزِ ازل سے اس کے مقدر میں ایک ہی کام لکھ دیا گیا ہے۔ سفر پر نکلے ہوئے لوگوں یا راہ گیروں کو اپنی راہ سے بھٹکا دینا۔ یہ ایک کمزور اور چھچھورا شیطان ہے جو کبھی بھی بہت زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہوتا۔ بس وہ راستہ چلتے آدمی کے کہیں سے بھی پیچھے پڑ سکتا ہے۔ دبے پاؤں، خاموشی کے ساتھ۔

''تمھارے پیچھے 'مت کٹا' لگ گیا ہوگا،'' بہن اطمینان سے فیصلہ سناتی۔

مگر افسوس کہ لاکھ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے پر بھی آج تک کوئی 'مت کٹا' اسے کبھی نظر نہ آسکا۔

جہاں تک نقشے میں طول البلد اور عرض البلد یا خطِ سرطان اور خطِ استوا کا سوال تھا تو اس سلسلے میں اس کا ذہن بالکل صاف تھا۔ اور مقامی وقت کی بابت تو بچپن سے ہی اس نے یہ شعر نما کہاوت ذہن نشین کر رکھی تھی کہ ''مشرق میں جاؤ تو وہ وقت کم ہے، مغرب میں جاؤ تو وہ وقت زیادہ ہے۔'' یہ کتنی شاندار بات تھی کہ وقت کی اس معمولی سی پیچیدگی کو حل کرنے کے بعد مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے تضادات اور مسائل اس کی نظروں میں ہیچ اور مضحکہ خیز بن کر رہ گئے تھے۔

اس نے دائیں ہاتھ سے لکھا:

''آخر بایاں دایاں، دایاں بایاں ہے کیا؟

''دائیں ہاتھ سے اتنا لکھنے کے باوجود وہاں نہ کوئی درد ہے نہ اکڑن کا احساس۔ انگلیاں جیسے

Scanned with CamScanner

پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ رہی ہیں اور میرے ساتھ مسئلہ اب یہ نہیں رہا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا۔ مسئلہ یہ درپیش آیا ہے کہ دائیں ہاتھ سے جو لکھا جا رہا ہے وہ کسی چھلاوے کی طرح میرے ضمیر اور میری روح پر چپت رسید کرتا ہوا دور بھاگتا جا رہا ہے۔ غائب ہو رہا ہے۔ یہ سب اس طرح ہو رہا ہے جیسے کوئی جنگ چل رہی ہو۔ مگر جنگ کن کے درمیان؟

''شاید دائیں اور بائیں کے درمیان۔ مگر آخر کیوں؟ کیا میں کسی موسیقی کے ساتھ کوئی گڑبڑ کر رہا ہوں، کیا میں کسی سُر کو غلط لگا رہا ہوں؟ یقیناً میں غلط رقص کر رہا ہوں اور میرے بھاؤ اور مدرائیں ضرورت سے زیادہ دائیں ہوتی جا رہی ہیں۔ اس طرح یہ رقص ایک ہولناک اور اندھیری دنیا کی طرف جھکتا جا رہا ہے۔ افسوس کہ لفظوں کی ظاہری شکل وہی ہے۔ یہاں تک کہ خطِ نستعلیق، خطِ نسخ میں بھی بدلتا نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہی یہ خطِ مرموز ہے۔ یہاں کوئی رمز نہیں ہے۔

''کیا دنیا کی ساری سیاست اسی طرح بدعنوانی، مکاری اور تشدد میں بدل جاتی ہے اور محبت، نفرت میں؟ اس طرح کہ لفظ اور حرف اسی طرح پڑھا جاتا، اسی طرح لکھا جاتا ہے مگر محبت نفرت کی طرح محسوس کی جاتی ہے اور انصاف سنگین جرم کی طرح؟

''یہ درست ہے کہ الفاظ ہی سب کو تحفظ بخشتے ہیں۔ مگر کیا تحفظ کے بدلے آپ اپنے شعور کا سودا کرلیں گے اور لافانی ہونے کے لیے اپنی آتما کا سودا؟ یہ لین دین فاوسٹ کے شیطان کے ساتھ ہی ممکن ہے، شیطان جس کا اپنا محاورہ ہے اور اپنا روزمرہ۔ دائیں ہاتھ سے لکھنے پر یہ محاورہ بلند آواز میں سنائی پڑتا ہے۔ لفظوں سے ایک کمینہ بھیانک ہوا نکلتی ہے جو سب کچھ مسخ کر دینے سے زیادہ سب کچھ دوسری طرح سے مستحکم کرنا چاہتی ہے۔ اور دراصل یہی اصل اور سب سے زیادہ بری بات ہے۔

''شاید اسی لیے تاریخی شعور سے بڑی حماقت دوسری کوئی نہیں ہوسکتی۔ واقعات کو یاد رکھنے میں اصل عیب پوشیدہ ہے۔ ورنہ واقعات کی خود اپنے آپ میں کوئی اہمیت نہیں۔ مذہب اور تاریخ دونوں ہی زمین کے گلے میں پڑے ہوئے ڈراؤنے ہڈیوں کے ہار کے مانند ہیں۔ ان کی وجہ سے زمین کا چہرہ اپنے پورے جغرافیہ سمیت ایک بھوت کی طرح نظر آنے لگا ہے۔ اس ہڈیوں کے ہار کو زمین کے گلے سے کھینچ کر الگ کرنا ہوگا۔

''مگر اس کے لیے ایک لمبی بارش کا انتظار کرنا ہے۔ ایک طویل بارش جو تب تک ہوتی رہے گی

Scanned with CamScanner

جب تک یہ خوفناک ہڈیاں گل کر نہ بکھر جائیں۔اور دنیا اپنے خالص، نیک اور دل فریب جغرافیے کے ساتھ محسوس کی جاسکے۔

''مگر افسوس کہ فی الحال یہ سب لکھنا ایک بھیانک تضاد کے سوا کچھ نہیں۔دماغ کا بھی بٹوارا ہو چکا ہے۔یہ الفاظ بائیں ہاتھ سے چھوٹ کر اپنی منطقی قوت زائل کر چکے ہیں۔اب دائیں دماغ کا کمینہ پن ہے۔وہ بہت پرانا ہے اور پُراسرار بھی۔وہ گونگا ہے اور صرف استعارے کی زبان سمجھتا ہے۔استعارہ جس نے دنیا میں سب سے زیادہ گڑبڑ پیدا کی ہے۔وہ چھچھوندر کے مانند ہے جس کی بدبو اور کراہیت اس سے آگے آگے چلتی ہے۔ایک گیلی لجلجی لکیر کی طرح جس کے معنی کچھ نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ کچھ عیش طبع لوگ اسے رمزِ بلیغ کہہ کر خود بھی آرام سے بدبو خارج کر سکتے ہیں۔''

مگر...وہ...وہ بہت بعد میں پیدا ہوا۔بایاں دماغ بے چارہ نیا تھا۔کنواری دلہن کی طرح نیا۔('پرانا' اور 'نیا' کہنے میں کسی تاریخی شعور کو تلاش کرنا بے سود ہے اور اگر ایسا لگ رہا ہو تو یہ دائیں ہاتھ سے لکھنے کا قصور ہے۔)وہ خودرو گھاس کی طرح اُگ آیا۔پرانے نے نئے کو سارا تاریخی شعور کچرے کی طرح سونپ دیا۔یہ کیسا تضاد تھا کہ سارا تاریخی شعور بائیں طرف پڑا ہوا مر رہا تھا، سڑ رہا تھا۔

تو انسانی دماغ، انسانی روح کا بٹوارا ہو چکا تھا۔صرف چھپکلیاں سالم و ثابت رہ گئی تھیں۔ان کے پاس وہی پرانا دایاں دماغ تھا جو صدیوں سے چلا آرہا تھا۔وہ اس دماغ سے نکل کر اور دیوار پر رینگ رینگ کر ہنستی تھیں۔

اس کے بائیں پیر کی رگ اچانک پھڑکنے لگی۔وہ لکھتے لکھتے رکا تو کھڑکی کے بدرنگ پٹ پر تکونے سروں اور چوڑے منھ والی سات آٹھ چھپکلیاں نمودار ہو گئیں اور کالی چیونٹیوں کی قطار کی طرح دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

۶

وہ ایک طویل قامت شخص تھا۔بے حد دبلا پتلا۔آنکھیں غیر معمولی حد تک چمکدار مگر پھر بھی افسردہ افسردہ نظر آتی تھیں۔سر تقریباً گنجا تھا اور اس پر خشکی کی موٹی سی تہہ دار پپڑی جمی ہوئی تھی۔داڑھی ہمیشہ بے ترتیبی سے بڑھی رہتی جسے دیکھ کر اکثر اس کی بہن کہا کرتی:

''اس سے تو بہتر ہے کہ تم داڑھی رکھ لو۔ تمھاری شکل ابا سے کتنی ملتی ہے۔ ویسی ہی نورانی اور پاکیزہ۔ اگر تم ان کی طرح داڑھی رکھ لو تو بالکل ابا کی طرح ہی لگو گے۔''

''ابا... ابا...'' وہ بے خیالی میں دہراتا اور بہن اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھنے لگتی۔ ویسے تو اسے مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر پتا نہیں کیوں سال میں کچھ دن ایسے بھی ہوتے تھے جب اس کے پاس سوائے قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے دوسرا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ بھی ایک قسم کا دورہ ہی تھا۔ ان دنوں بہن اس سے بہت خوش نظر آتی مگر جب وہ دھول بھرے مچان پر سے قرآن شریف کو اٹھانے لگتا تو وہ اسے بری طرح ٹوکتی بھی:

''اسے سیدھے ہاتھ سے تھام کر قلب سے لگاتے ہوئے احتیاط کے ساتھ اتارو۔ ایسے بے ادبی ہوتی ہے۔ تم اگر چاہتے تو اپنا سارا کام سیدھے ہاتھ سے کر سکتے تھے مگر تم نے ابا کی بات کبھی نہ مانی۔''

اس وقت اپنی بہن کا چہرہ اسے اپنے باپ کی طرح نظر آنے لگتا اور نہ جانے کیوں اسے یہ محسوس ہوتا جیسے اسے ناقابلِ برداشت حد تک پیشاب لگ رہا تھا۔

ان دنوں آس پاس کے حالات خراب چل رہے تھے، جب بہن کا حج کے لیے بلاوا آ گیا۔

''تم حج کے لیے جا رہی ہو؟ باہر نکل کر دیکھو، آدمی جلائے جا رہے ہیں!'' اس نے برہمی سے کہا تھا۔

''اگر مجھے موت آنی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ مگر مدینے والے نے مجھے بلایا ہے۔'' بہن نے عقیدت مندی کے ساتھ پُر استقلال لہجے میں جواب دیا۔

وہ بہن کو اپنی چمکدار مگر بے حد افسردہ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ٹھیک اسی وقت اس کے بائیں کان میں سیٹیاں سی بجیں۔ اس کا چہرہ تبدیل ہو گیا، اور اس نے بچوں کی طرح ہمک کر کہا:

''واپس آ کر مرغا پکانا۔ میں سیدھے ہاتھ سے کھا لوں گا۔''

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں بہت سا مرغا پکاؤں گی۔ اور چاہے جس ہاتھ سے کھانا۔'' بہن مامتا سے بھر گئی۔

مگر شاید وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ فرش پر بکھری ہوئی فاتحہ کے سالن کی بوٹیاں تک رہا تھا اور اس

Scanned with CamScanner

کے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔

بہن نے حج کے لیے روانہ ہوتے وقت اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ بے اختیار اسے اپنے باپ کا اذان دینے کا انداز یاد آ گیا۔

''خدا تمھیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں تمھاری طبیعت کے لیے وہاں دعا کروں گی اور واپسی میں آبِ زمزم بھی لاؤں گی۔''

''دعا... دعا...'' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دہرایا۔

بہن زور زور سے رونے لگی۔

اب رات بہت گزر گئی تھی۔ بہن کو گئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ کھانا اسے مدرسے سے مل جایا کرتا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ابھی تک اسے وہ دورہ نہیں پڑا تھا۔ ہاں ایک دو بار وہ راستہ اور سمت ضرور بھول گیا تھا لیکن ان دنوں جس انداز میں وہ جو کچھ لکھ رہا تھا، اسے جنون ضرور قرار دیا جا سکتا تھا۔

جون کی حبس بھری رات۔ اس کا سارا بدن اندر سے کھول رہا تھا مگر مساموں سے پسینے کی ایک بوند بھی نہ ٹپکی تھی۔ پسینہ نہ جانے کہاں راستہ بھول گیا تھا۔ لکھتے لکھتے وہ تھک گیا۔ اس نے کاغذ اور قلم ایک طرف رکھ دیے اور اپنے گندے میلے سے بستر پر اکڑوں بیٹھ کر تکیے کے نیچے سے دنیا کا نقشہ نکال کر اس پر جھک گیا۔ سر پر بہت مدھم روشنی کا بلب ڈوری سے بندھا لٹک رہا تھا۔ اس کی زرد اور بیمار روشنی میں اسے محسوس ہوا جیسے دنیا کے نقشے پر سارا بایاں حصہ سادہ پڑا تھا، سادہ اور تاریک۔ وہاں پانی بھی نہ تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا جیسے نقشے کے بائیں طرف کا سارا جغرافیہ اچانک کسی غیر معمولی طاقت کے زیرِ اثر غائب ہو گیا ہو یا زیرِ زمین چلا گیا ہو۔ اس نے نقشے کی بنیادوں میں اترنے کی کوشش کی، مگر نہیں وہاں تو زمین بھی نہ تھی۔ وہاں صرف سناٹا تھا۔ خالص سناٹا۔ زمین سے اور ہر امکان سے خالی سناٹا۔

وہ گھبرا کر اٹھا۔ شاید پلنگ زور زور سے ہل رہا تھا۔

کیا زلزلہ آ رہا ہے؟ ایک پل کو اس نے سوچا۔

مگر اس کے حلق میں کوئی شے پھنس رہی تھی اور اسے بخوبی علم تھا کہ اس شے کو کچھ لکھ کر ہی دور کیا جا سکتا تھا۔ اس نے تقریباً جھپٹتے ہوئے قلم کو دوبارہ ہاتھ میں پکڑا۔ بائیں ہاتھ میں۔ مگر وہ قلم پر دباؤ

Scanned with CamScanner

نہ ڈال سکا۔ اس نے جلدی سے قلم کو دائیں ہاتھ میں لے لیا۔ مگر نہیں، اب بے سود تھا۔ حلق میں پھنسی ہوئی شے پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ لکھے جانے کا التباس ہی تھا۔ کاغذ پر صرف مکروہ کیڑے رینگ رہے تھے۔ اس رینگن کو وہ اپنے تمام بائیں جسم پر محسوس کر رہا تھا۔

کچھ متلی جیسا بھی تھا۔ مگر یہ کیسی متلی تھی جو صرف حلق سے ہی نہیں، شاید سارے بائیں جسم سے پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ یہ متلی سے زیادہ کوئی خطرناک شے تھی۔

لیکن اس کا دایاں جسم۔ وہاں کوئی بے چینی، کوئی تکلیف اور کوئی الجھن نہ تھی۔ وہاں سب کچھ شانت تھا۔ سمادھی میں گئے ہوئے جوگی کی طرح شانت اور مطمئن اور بے نیاز۔

وہ بہت مایوس ہو گیا مگر یہ ایک ادھوری مایوسی تھی کیونکہ اس کے چہرے کے بائیں طرف وہی غیر معمولی چمک تھی جیسے وہاں آگ دہک رہی ہو۔ صرف دائیں طرف اندھیرا تھا۔ گہرا اندھیرا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے قریب آ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے قریب آ کر اسے احساس ہوا کہ باہر تیز ہوا چل نکلی ہے: ایسی ہوا جس کے پیچھے پیچھے ایک عظیم بارش چلتی ہے۔

''تو کیا وہ بارش آ پہنچی ہے؟'' اس نے خیال کیا۔

ایک بادل بے دلی کے ساتھ آسمان پر پھیل رہا تھا۔ مگر نہیں۔ اس نے غور سے دیکھا اور سمجھ گیا کہ یہ بادل نہیں دھند تھی۔ بادل اور دھند میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کم و بیش دو مختلف سیاستوں جیسا، یا دو مختلف مذہبوں جیسا۔ دھند میں پانی کہاں، اور اگر ہو بھی تو اتنا کم کہ اس کے ہونے کا امکان بھر ہی کیا جا سکتا تھا۔ دھند میں مٹیالی دھول اور کالا دھواں گرہ در گرہ سانپوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بھورا بادل نظر آتی تھی۔ وہ اس قسم کی دھند دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا، اس لیے زیادہ دیر اس سے بدحظ نہ ہو سکا۔

دور، گلی کے بائیں موڑ کے پار، کھیتوں کے بعد، بھنگیوں کے مرگھٹ میں ٹین کا شیڈ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس کی آواز رات کے سناٹے میں کربناک محسوس ہوئی۔ ہوا سے اس کا پاجامہ سرسرانے لگا۔ کیا یہ ہوا چندن کے درختوں کو چھو کر آ رہی تھی؟

دفعتاً اس کا جی بے اختیار زور زور سے رونے کو چاہا۔

Scanned with CamScanner

نہیں۔ یہ رونے کی خواہش نہ تھی۔ یہ غصے کی ایک بھیانک اور تباہ کن لہر تھی۔ ایک ناقابلِ یقین غصہ جو اسے اپنے تمام دائیں جسم پر آ رہا تھا۔

''یہ کیسا ایک صوفی درویش کی طرح بیگانہ اور بے نیاز بنا ہوا میرے جسم میں آ کر بیٹھ گیا ہے۔ یہ پورا دایاں۔ ہر تکلیف، ہر دکھ، ہر چوٹ اور ہر احساس سے مبرا، ایک اونچے منبر پر براجمان، گھمنڈی دایاں!'' وہ بڑبڑایا۔ ساتھ ہی اس کا غصہ اور بھی شدید ہو گیا۔ بائیں کان سے ڈھیر سی رطوبت بہہ نکلی اور اس کی تپتی ہوئی گردن پر ایک ٹھنڈی لکیر بہنے لگی۔

اچانک اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ فوری طور پر اس کے بائیں ہاتھ میں حیرت انگیز طریقے سے ایک پُر اسرار مگر تشدد آمیز طاقت عود کر آئی ہے۔ شاید اس کی پوری بائیں روح غصے سے پاگل ہو گئی ہے۔

وہ کھڑکی سے مڑا۔ ہوا کے ایک جھونکے میں بستر پر پڑا ہوا نقشہ پھڑپھڑایا۔ ایک پل کو اپنے غصے کو دبانے کی خاطر اس نے سوچا کہ مچان پر سے قرآن شریف اتار کر تلاوت شروع کر دے۔ مگر وہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہا کیونکہ اس کا پورا بایاں جسم آپے سے باہر اور دائیں جسم سے کشتی لڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے بائیں چہرے پر آج پھر مدتوں بعد وہی خطرناک چراغ جل رہے تھے۔ اب یہ اس کا آخری داؤ تھا۔ مدتوں سے جاری دائیں اور بائیں کی کشتی میں ہمیشہ چھپا کر رکھا گیا ہوا ایک کمینہ اور ہلاکت انگیز داؤ۔

''نہیں چھوڑوں گا! آج اسے جلا کر راکھ کر دوں گا!'' وہ دانت پیستے ہوئے غرایا۔

اس نے پلنگ کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کے تیل کی بوتل کو باہر نکالا۔

۷

''تو بائیں طرف چلنا کیوں اچھا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''امن و امان کے لیے،'' باپ نے جواب دیا۔

''امن و امان کے لیے... امن و امان کے لیے...'' اس نے دہرایا۔

وقتی طور پر بے حد طاقتور ہو جانے والے بائیں ہاتھ سے اس نے پہلے مٹی کے تیل کی بوتل کا ڈھکن کھولا، پھر حد درجہ احتیاط اور کمالِ خوبی کے ساتھ تیل کو اپنے سر پر اس طرح انڈیلا کہ تیل کی ایک بوند بھی سر کے بائیں طرف نہ پھیل سکی۔ اس کوشش میں وہ ایک لمبے درخت کی طرح نظر آیا جو کسی آندھی یا نادیدہ طاقت کے زیرِ اثر دائیں طرف کو جھک رہا ہو۔ مٹی کا تیل اب سر کے دائیں طرف سے بہتا ہوا نیچے آ گیا یہاں تک کہ پیر کے پنجے پر رسنے لگا۔

باہر ہوا واقعی تیز ہو چلی تھی۔ جھونکے گھر کے اندر چلے آ رہے تھے۔ ان جھونکوں سے اس کے میلے بستر کی چادر اور وہاں بکھرے ہوئے جغرافیہ کے نقشے اڑنے لگے۔ تب اس نے اپنے اس چالاک اور ہوشیار پُر تشدد بائیں ہاتھ سے دیا سلائی پکڑی۔ اس کا پورا بایاں جسم جاگ رہا تھا، چوکنا، برہم، جوشیلا اور انتقام کے جذبے سے لبریز۔ اس کے دائیں جسم پر حملہ کرنے اور اسے فنا کر ڈالنے اور جلا ڈالنے کے لیے بالکل تیار اور چست۔

یہ نہیں پتا کہ رات کتنی بیت گئی تھی۔ گلی سنسان پڑی تھی۔

گھر کے اندھیرے میں دیا سلائی کا شعلہ چمکا۔

ہاں یقیناً آگ پہلے دائیں طرف ہی لگتی محسوس ہوئی تھی مگر بعد میں اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کدھر سے کدھر کو پھیلی ہوگی۔

وہ بڑی اندوہناک اور ہذیانی چیخیں تھیں۔ اس کا سارا بدن جل رہا تھا۔ وہ گھبرا کر زینے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گھر سے باہر بھاگا۔ محلے کی گلی میں۔ اس کے حلق سے لگاتار ہولناک چیخیں جاری تھیں۔ وہ حواس باختہ ہو کر گلی میں کبھی دائیں تو کبھی بائیں طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کے جسم سے آگ کی لپٹیں بلند ہونے لگیں۔

محلے کے چند مکانوں کی اوپری کھڑکیاں کھلیں، پھر فوراً ہی بند ہو گئیں۔ ان دنوں زندہ انسانوں کا اس طرح جلنا ان کے لیے کوئی حیرت انگیز امر نہیں رہ گیا تھا۔ لوگ جلائے ہی جا رہے تھے۔

وہ دراصل پانی کے اس نل کی تلاش میں تھا جو گلی کے بائیں موڑ پر کھمبے کے نیچے لگا ہوا تھا۔ مگر شاید وہ سمت بھول رہا تھا۔ دور آسمان کی گھاٹیوں میں کوندا ہو رہا تھا۔ یہ جنوب مغربی مانسون آنے کے

Scanned with CamScanner

دن تھے۔ان دنوں خزاں میں تہلکہ رہتا ہے اور گرج چمک کے طوفان آتے ہیں۔

تیز ہوا کے جھونکوں میں اس کا سارا جسم ایک طویل قامت لپکتا ہوا شعلہ نظر آیا۔ وہ گھبرا کر اپنی جگہ ایک آتشیں بگولے کی طرح تیزی سے گھومنے لگا۔ اس کے آتش بازی جیسے چک پھیری کرتے ہوئے جسم پر کتے بھونکنے لگے۔

آہستہ آہستہ اس کی ناک کی چربی پگھلنے لگی اور سفید سفید چکنائی اس کے پورے چہرے پر بہنے لگی۔ اس چکنائی سے اس کے چہرے کے شعلے اور بھی بھڑکے۔ آس پاس چرانده پھیل گئی۔ اس کے جسم کی ساری کھال سکڑ کر غائب ہونے لگی۔ اس کا دراز قد راچانک بونے میں تبدیل ہونے لگا۔

دفعتاً پھر وہ تیزی کے ساتھ گلی کے بائیں موڑ کی طرف بھاگا، اگیا بیتال کی طرح۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے لگے پانی کے نل کے پاس جا کر وہ زمین پر گر پڑا اور بے تحاشا چلاتا ہوا لوٹیں لگانے لگا۔ کتے بھونکتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگے۔

پھر شاید ہمت کر کے وہ ایک بار پھر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ جل رہا تھا۔ اس کے جلتے ہوئے جسم کی روشنی میں اس کا ہیولہ اس سے الگ اچھل رہا تھا۔ گلی کچھ دیر کو روشن ہوئی جیسے کوئی تنہا آدمی وہاں مشعل لیے بھٹک رہا ہو۔ وہ جل رہا تھا، دھڑا دھڑ۔ درخت کی طرح نہیں بلکہ پورے جنگل کی طرح۔ اس روشنی میں گلی کے مکان، کھڑکیاں، منڈیریں، نالیاں، نالیوں پر اُگی ہوئی خودرو گھاس اور دیواریں بے تکے اور بے معنی انداز میں روشن ہو گئے۔ گھروں کی چھت پر تاریخ ایک بدنیت غبی بندر کی طرح استرا ہاتھ میں لیے اپنا گلا کاٹتی نظر آئی۔

اس کے جلتے ہوئے جسم کی روشنی میں یہ سب دیکھنا قطعی مایوس کن تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی وہ ہولناک اور ہذیانی چیخیں مدھم ہونے لگیں۔ شعلے نیچے ہونے لگے۔ وہ ایک بار گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر پانی کے نل کے نیچے لیٹ گیا۔ چرانده اور دھوئیں میں لپٹا اس کا راکھ ہوتا ہوا جسم سکڑا سکڑایا، سڑک کے کنارے پڑا تھا۔

آسمان پر کوندا لپکا، تیز بوندیں پڑیں۔

وہ جل گیا تھا لیکن اس نے خود کو گہرے نیلے پانیوں میں ڈوبے محسوس کیا۔ اس نے پانی کی خاموش آواز سنی جو صرف اس لیے محسوس ہوئی کہ وہ اس کے آس پاس پھیلے بے کراں سناٹے سے کچھ

Scanned with CamScanner

زیادہ بلند آہنگ تھیں۔

روشن گلی پھر سے تاریک ہوگئی۔ بس وہاں چراندھ رہ گئی تھی۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب اچانک جغرافیہ اس کی جلی ہوئی آنکھوں کے آگے پرانے مہربان دوست کی طرح آکر کھڑا ہوگیا۔

سمندر بھی آیا تھا۔ نیلا گہرا سمندر، اس کے راکھ ہوتے ہوئے تلووں کو چھو چھو کر سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔

سب ہی آئے تھے۔ پہاڑ، دریا، ٹیلے، ریگستان اور چندن کے درخت سے لپٹے ہوئے بوڑھے سانپ بھی۔ شاید وہ بارش بھی جس کا اسے ہمیشہ سے انتظار تھا۔

اور تب بڑی نرمی کے ساتھ ٹھنڈے چیڑ کے درختوں نے اس کے کوئلہ چہرے کو اپنے سائے میں ڈھک لیا۔

یہ وہی دنیا تھی۔ انسانوں سے یکسر خالی، جیسا کہ اس نے ہمیشہ دنیا کو سمجھا تھا۔ بس ایک زمین جس کی زرخیزی جلی ہوئی ہڈیوں اور راکھ سے ہمیشہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔

❋❋

وجاہت مسعود

یک خوابِ خوش و لے...

(۲۶ منتخب کالم)

Scanned with CamScanner

تعارف

اردو زبان معاشرے کے فوری اور درپیش مسئلوں کے بارے میں گہری نظر اور تجزیاتی انداز رکھنے والی تحریروں کے سلسلے میں خاصی مفلس ہے۔ اخباری صنعت کے پھیلاؤ اور صحافت کے ابتذال اور موقع پرستی کے نتیجے میں اردو اخباروں کے ادارتی صفحوں پر جو تحریریں کالموں کے زمرے میں چھپتی ہیں ان میں سے بیشتر حقائق کے سلسلے میں احتیاط، تجزیے کی گہرائی اور تاریخی شعور سے محروم ہوتی ہیں۔ ان پر ایسے سوقیانہ، جذباتی اور اکثر اشتعال انگیز انداز بیان کا غلبہ ہوتا ہے جو پڑھنے والوں کو اس قدامت پرست، غیر حقیقت پسند اور جنونی ذہنیت پر مبنی نقطۂ نظر کی گرفت سے نکلنے نہیں دیتا جسے اسی قسم کے تحریری اور تقریری مواد کی مدد سے ان پر طاری کر دیا گیا ہے۔

صحافت کے اس زوال میں ایک اہم عنصر ادبی تحریروں کی معاشرے اور اس کے مسائل سے بیگانگی کا بھی کارفرما ہے۔ عمدہ صحافت عمدہ ادب سے ہی قوت حاصل کرتی ہے، لیکن اردو ادب، خصوصاً فکشن، سے صحافت اور معاشرے کے دوسرے شعبوں کو رہنمائی اور تقویت فراہم کرنے کی توقع سعادت حسن منٹو کے جانے کے بعد سے کوئی ہوشمند شخص نہیں کر سکتا۔ ہمارے فکشن نگار، جن کو سرکاری اور غیر سرکاری جغادری نقادوں کی طرف سے متواتر یہ پٹیاں پڑھائی جاتی رہی ہیں کہ قحط، فسادات، استحصال، افلاس، قدامت پرستی وغیرہ تخلیقی ادب کا موضوع بننے کے لائق نہیں، رفتہ رفتہ معاشرے کا قریبی مطالعہ کرنے کے شغل سے دستبردار، اور غالباً اس صلاحیت سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پچاس برس کے پاکستانی اردو ادب کو پڑھ کر اس معاشرے کی نہایت دھندلی اور نامکمل تصویر بنتی ہے۔

آئندہ صفحات میں اردو اور پنجابی کے ادیب وجاہت مسعود کے ۳۶ کالموں پر مشتمل ایک انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کالم انھوں نے پچھلے ڈیڑھ برس میں بی بی سی اردو کی ویب سائٹ کے لیے تحریر کیے اور اس نشریاتی ادارے کے شکریے کے ساتھ یہاں شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان کالموں کو آپ اردو تحریروں کے اس انبار سے بنیادی طور پر مختلف پائیں گے جنھیں اردو اخباروں میں کالموں کی ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ ان کم و بیش سو صفحات میں ان بیشتر سیاسی اور معاشرتی مسائل کا ذکر آ گیا ہے جو اس وقت پاکستانی معاشرے کو درپیش ہیں اور ان سے بننے والی مجموعی تصویر میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ مسائل کن تاریخی عوامل کا نتیجہ ہیں اور ہمارے معاشرے کو کس سمت میں لیے جا رہے ہیں۔ ان تحریروں کی دو اور خوبیاں عمدہ نثر اور متین انداز بیان ہیں، اور یہ خوبیاں پاکستان کی اردو صحافت سے قریب قریب رخصت ہو چکی ہیں۔

Scanned with CamScanner

وجاہت مسعود ۱۹۶۶ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی زبان وادب میں ایم اے کیا۔ ۲۰۰۶ء میں انھوں نے برطانیہ کی لیڈز یونیورسٹی سے انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی اور یوروپی قانون میں ایل ایل ایم کی سند حاصل کی۔ وہ صحافت سے منسلک رہے ہیں اور انگریزی اخبار دی نیوز کا فن اور ادب سے متعلق صفحہ مرتب کرتے رہے ہیں۔

وجاہت مسعود متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں: جمہوریت کیا ہے؟ (۱۹۹۹ء)؛ سیکیولرازم کیا ہے؟ (۲۰۰۳ء)؛ بنیادپرستی کیا ہے؟ (۲۰۰۳ء)؛ تنقیدی شعور کیا ہے؟ (۲۰۰۴ء)؛ جمہوریت کے سو برس (۲۰۰۵ء)۔ اس کے علاوہ ماہنامہ نوائے انسان کے لیے وجاہت مسعود کے لکھے ہوئے اداریوں کا مجموعہ نصابِ گل (۲۰۰۵ء) اور پنجابی نظموں کا مجموعہ والٹن کیمپ نہیں مُکیا (۲۰۰۲ء) بھی شائع ہو چکے ہیں۔

Scanned with CamScanner

سن پینسٹھ کا جذبہ یا قوم کی توہین

پاکستان میں آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو آنے والا زلزلہ اس خطے میں رونما ہونے والا بدترین سانحہ ہے۔ اس میں بے پناہ جانی اور مالی نقصان پر عوام میں گہرے رنج وغم کے علاوہ زلزلہ زدگان کی بھرپور امداد کا جذبہ پیدا ہونا بالکل فطری امر ہے۔ تاہم اس دوران یہ عجیب بات سامنے آئی کہ مقامی ذرائع ابلاغ میں قوم کی طرف سے مصیبت زدگان کی مدد کو ایک خاص تواتر سے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستانی عوام میں پیدا ہونے والے جذبے سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۶۵ء کا یہ بے محل تذکرہ زلزلے کے کچھ روز بعد تب شروع ہوا جب عوام کی طرف سے زلزلہ زدگان کی غیر موثر مدد کے ضمن میں فوج کے ادارے پر تنقید سامنے آئی۔ غیر جمہوری حکمرانی کی شکار ریاستوں میں حکومتوں کو اپنے جواز کے لیے نظریاتی دعووں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پھر ان نظریات کو حقائق کی دھوپ سے بچانے کے لیے شخصیات اور واقعات کو تقدیس کا جامہ پہنایا جاتا ہے تاکہ ان پر تنقید کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔

سنہ پینسٹھ کی پاک بھارت جنگ کو پاکستان میں کچھ ایسا ہی مقدس کارنامہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ بعض مبصرین کے مطابق یہ پاکستان کی تاریخ کا کچھ ایسا روشن باب نہیں تھا۔ یہ جنگ تو سازش، نااہلی اور دھوکا دہی کی ایک ترشول تھی جو اس خطے کے عوام کے سینے میں اتاری گئی۔ اس جنگ سے پاکستانی عوام کے معاشی امکانات کو شدید نقصان پہنچا، خطے کے دو بڑے ممالک یعنی ہندوستان اور پاکستان میں دشمنی اور نفرت کا بیج بویا گیا، پاکستان کے دونوں حصوں میں خانہ جنگی اور علیحدگی کی بنیاد پڑی، پاکستان میں سیاسی قوتوں پر فوج کی بالادستی کو مزید استحکام ملا۔

سید سبط حسن سخن در سخن میں لکھتے ہیں کہ ''انسانی تاریخ میں جنگ ستمبر جیسی بے

معنی لڑائی شاید ہی کہیں لڑی گئی ہو،'' مگر پاکستان کا حکمران طبقہ سبطِ حسن کے کمیونسٹ ہونے کے وجہ سے ان کی گواہی کو معتبر نہیں سمجھتا۔ آیئے پاکستان کے چار اعلیٰ سول اور فوجی اہلکاروں کی تصانیف کی روشنی میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ پر ایک نظر ڈالیں۔

میرا بیان (My Version) کے مصنف جنرل موسیٰ خان اس جنگ میں پاکستانی بری فوج کے سربراہ تھے۔ پہلا معرکہ (The First Round) ایر مارشل اصغر خان کی تصنیف ہے جو جنگ سے کچھ ماہ قبل تک پاکستانی فضائیہ کے سربراہ تھے اور جنگ کے دوران صدر پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے مختلف ممالک کا دورہ کر رہے تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کی خودنوشت سوانح کا عنوان آخری کمانڈر انچیف ہے۔ گل حسن جنگ کے دوران جی ایچ کیو میں تعینات تھے اور جنگی حکمت عملی طے کرنے کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر تھی۔ ایوب خان کے دس برس الطاف گوہر کی تصنیف ہے جو عہدے کے اعتبار سے تو سیکرٹری اطلاعات تھے لیکن انھیں ایوب خانی نظام میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ اس جنگ میں پاکستان کی اخباری کامیابیوں کے وہی خالق تھے۔

اس جنگ کے بارے میں پاکستان کا سرکاری نقطۂ نظر یہ ہے کہ ''بزدل دشمن نے رات کے اندھیرے میں پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ہماری بہادر فوج نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے''۔

پاکستان میں پڑھے لکھے افراد کی بڑی تعداد 'آپریشن جبرالٹر' کے نام سے بھی نا آشنا ہے جو اس سال ۸ راگست سے جاری تھا۔ آٹھ ہزار پاکستانی فوجی (گلوبل سیکیورٹی آرگنائزیشن کے ریکارڈ میں یہ تعداد ۲۲ سے ۳۰ ہزار تک بیان کی جاتی ہے) اس امید پر کشمیر میں داخل کیے گئے تھے کہ کشمیری عوام ان سے مل کر بھارتی فوج کو نکال باہر کریں گے۔ مگر بقول الطاف گوہر ''کشمیریوں نے پاکستانی فوجی پکڑ پکڑ کے بھارتی فوج کے حوالے کر دیے''۔ یہ خوش فہمیوں کا وہی سلسلہ ہے جو ایک طرف کشمیر پر قبائلیوں کی چڑھائی اور دوسری طرف کارگل سے جا ملتا ہے۔

جنرل موسیٰ خان ۲۸ راگست تک زچ ہو چکے تھے کہ ان کے ''سپاہیوں کے پاس لڑنے کے لیے پتھروں کے سوا کچھ نہیں تھا''۔ اس موقع پر چھمب جوڑیاں سیکٹر میں جنرل اختر حسین ملک سے کمان لے کر جنرل یحییٰ کو دی گئی اور گھیرے میں آئے ہوئے سپاہیوں کو بچانے کے لیے پاکستانی فوج نے بین الاقوامی سرحد پار کی۔ بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی معروف اصطلاح میں 'جارحیت'

Scanned with CamScanner

کہلاتی ہے۔ اِدھر ہفتوں سے جاری اس بھرپور لڑائی کی پاکستانی عوام کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا، اور بعض تو اب تک یہی سمجھتے ہیں۔ صدر پاکستان کو لاہور پر بھارت کی پندرھویں فوج کے حملے کی اطلاع پاکستانی فضائیہ نے دی جسے اس پورے منظر سے لاتعلق رکھا گیا تھا۔

اس لڑائی میں سیالکوٹ کے قریب چونڈہ کے محاذ پر ٹینکوں کی لڑائی کا بہت شہرہ ہے۔ اس محاذ پر پاکستانی فوج کے پاس عام گولہ بارود تو تھا مگر ٹینک شکن گولے سرے سے تھے ہی نہیں۔ سترہ روزہ جنگ میں پاکستان نے دفاع کی بجائے حملہ کرنے کی واحد کوشش ۱۱ ستمبر کو کھیم کرن کے قصبے کے پاس کرنا تھی۔ مقامی کمانڈر نے علاقے کا ٹھیک سے مطالعہ نہیں کیا۔ بھارت نے مادھوپور نہر کا بند کھول کر ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ پاکستانی فوج کو حملہ ترک کرنا پڑا۔ اس حملے کے بارے میں صدر پاکستان کی بریفنگ دھری کی دھری رہ گئی۔

جنرل موسیٰ لکھتے ہیں کہ بغیر سوچے سمجھے آدم پور، پٹھان کوٹ اور ہلواڑہ جیسے دور دراز مقامات پر چھاتہ بند دستے اتارنے کا فیصلہ غلط تھا۔ دو سو کے لگ بھگ فوجیوں میں سے واپس آنے والوں کی تعداد دس سے بھی کم تھی۔ ان کا کمانڈر بھی گرفتار ہو گیا۔

سیٹو (Seato) اور سینٹو (Cento) کمیونسٹ جارحیت کے خلاف معاہدے تھے اور ہندوستان کمیونسٹ ملک نہیں تھا، مگر پاکستان میں عام شکوہ کیا جاتا ہے کہ امریکہ نے اس موقع پر سیٹو اور سینٹو معاہدوں میں شمولیت کے باوجود پاکستان کی مدد نہیں کی۔ دنیا کے اہم ممالک پاکستان کی کارروائی کو نرم لفظوں میں غیر دانشمندی سمجھتے تھے۔

جنگ شروع ہونے کے دس دن بعد صدر ایوب، بقول الطاف گوہر، اپنی کرسی میں نڈھال پڑے تھے اور عوام کو کلمے والی تقریر، جنگی ترانوں، پاکستانی فوج کے کارناموں اور سبز پوش بزرگوں کی کارکردگی کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر حمید نسیم ناممکن کی جستجو میں لکھتے ہیں کہ اگر جنگیں ترانوں کے بل پر جیتی جاتیں تو ۱۹۷۱ء میں پاکستانی ترانے ۱۹۶۵ء سے بھی بہتر تھے۔ عقابی وزیر خارجہ بھٹو صاحب کی خواہش اور توقع کے عین مطابق پاکستان میں خیال پھیل گیا کہ ایوب خان جیتی ہوئی جنگ تاشقند میں مذاکرات کی میز پر ہار آئے۔

Scanned with CamScanner

جنگ میں بھارت کے ۳۰۰۰ فوجی ہلاک ہوئے تھے اور پاکستان کے ۳۸۰۰۔ ہوائی جہازوں اور ٹینکوں میں پاکستان کا نقصان ہندوستان سے دگنا تھا۔ بھارت کے ۲۰۱ مربع میل رقبے کے مقابلے میں پاکستان کا ۷۰۲ مربع میل رقبہ بھارت کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ لڑائی اگر سرحدوں کی بجائے اخبارات اور ریڈیو پر لڑی گئی تھی تو ایوب خان پر الزام درست ہے۔

پاکستانی عوام نے ۱۹۶۵ء میں واقعی بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا تھا، مگر یہ جذبہ جنگی ہسٹیریا اور بے خبری کا آمیزہ تھا۔ جنرل یحییٰ نے جنگ کے بعد فوجی ناکامیوں کے احتساب کی تجویز یہ کہہ کے رد کردی تھی کہ عوام کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے کچھ جھوٹ قائم رکھنا پڑتے ہیں۔ اس جنگ میں اگر عوام کا جوش وخروش قابلِ قدر تھا تو حکمرانوں کی طرف سے اس اعتماد کا استحصال افسوسناک قرار دیا جاسکتا ہے۔

بے شک شمالی پاکستان میں اکتوبر ۲۰۰۵ء کا زلزلہ ایک قدرتی آفت تھی اور دنیا کی کوئی حکومت اس پیمانے پر اچانک تباہی کے لیے مکمل طور پر تیار نہیں ہوتی، تاہم پاکستان کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات میں حکومت کے لیے محض زلزلے کی تباہ کاری سے ہٹ کر بھی کچھ خدشات تھے۔ نیم جمہوری اور نیم شخصی حکومتوں کے لیے اس قسم کی وسیع اتھل پتھل میں ایک اہم سوال حکمرانی کے جواز کو تنقید سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کے نیم تخیلاتی واقعات کا ذکر کرنے سے دراصل ایوب خان کی شخصی حکومت کی نیم تاریخی کامیابیوں کی بازآفرینی مقصود ہے۔

پاکستان میں مختلف حکومتوں نے عشروں کی محنت سے مخصوص سیاسی اور سماجی تصورات پر مبنی ایک ایسا اجتماعی ماڈل بنایا ہے جو تاریخ، معاشی حقائق اور سماجی سائنس سے بیگانہ ہے۔ جنگجوئی کی اینٹوں پر ہمعصر دنیا سے بیگانگی کا گارا چونا تھوپ کر ایک کچا قلعہ تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کی فصیلوں پر پاکستانی رائے عامہ دکھی سورما کی طرح کھڑی ہے جو جدید دنیا سے نفرت بھی کرتی ہے اور قدم قدم پر اس کی محتاج بھی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں پاکستانی عوام کے غیر حقیقی تصورات کو یاد کرنا گویا اس اجتماعی نمونے کو مستحکم کرنا ہے۔ ایک خدشہ یہ تھا کہ امدادی کارروائیوں میں کوتاہی کی بنا پر فوج پر تنقید نہ ہو۔

صدر صاحب نے پہلے تو طمطراق سے دفاع اور امدادی کارروائیوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ معاملات بتایا۔ پھر ایک روز بعد ہی ایف ۱۶ طیاروں کی خریداری ملتوی کرنے کا اعلان کیا گیا۔ پھر خبر آئی کہ یہ سودا محض اپریل تک ملتوی کیا گیا ہے۔ ادھر زلزلے کے بعد سویڈن سے جدید ہتھیاروں

نیز وزیراعظم کے استعمال کے لیے دو جدید طیارے خریدنے کی خبریں بھی آئیں۔ ایک اعلیٰ فوجی شخصیت نے تنقید کے جواب میں بھنا کر یہ بھی کہہ دیا کہ زلزلہ زدگان کی مدد فوج کی پیشہ ورانہ ذمہ داری نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے واپڈا، اسٹیل مل اور ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیاں چلانے اور اس قسم کی دوسری غیرفوجی 'ذمہ داریوں' کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ان حالات میں سنہ پینسٹھ کی طرف بار بار اشارہ دراصل فوج کا تاثر بحال کرنے کی کوشش ہے۔

پاکستان میں سیاسی کشمکش کی تکون میں فوج کے علاوہ معروف سیاسی جماعتیں ہیں جو پارلیمانی جمہوریت کی بحالی چاہتی ہیں اور تیسرے کونے پر نیم مذہبی طاقتیں ہیں جو دراصل اب فوج کی جگہ براہ راست سیاسی بالادستی کی خواہش مند ہیں۔ صدر کی جانب سے مذہبی اور جہادی تنظیموں کی تعریف کا اشارہ پاتے ہی ذرائع ابلاغ میں مذہبی جماعتوں کی تعریف کا سیلاب امڈ آیا۔ لاکھوں شہریوں کی انسان دوستی کو نظرانداز کرتے ہوئے ان مذہبی تنظیموں کی تائید کا مقصد شاید ممکنہ شہری ابھار کو نظریاتی مخمصے میں تبدیل کرنا تھا۔ اس میں بھی سنہ پینسٹھ کا تذکرہ مفید ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی لڑائی پاک بھارت تصادم کا استعارہ بنا دی گئی ہے۔ امن کی کوششوں کے ماحول میں اس لڑائی کا بار بار ذکر کرنے والے موقعے سے فائدہ اٹھا کر رائے عامہ کو اپنے ڈھب پر رکھنا چاہتے ہیں۔

زلزلے پر تبصروں میں ایک اور زاویہ بار بار عذابِ الٰہی اور عوام کے مفروضہ گناہوں کا تذکرہ تھا۔ مرنے والوں کی بڑی تعداد تو مٹی گارے کے گھروندوں میں بسنے والی مخلوق تھی۔ خدا کی ذات اصل گناہگاروں سے ایسی بے خبر تو نہیں ہو سکتی۔ اسی طرزِ فکر کا ایک رخ مغرب پر تنقید کی صورت میں سامنے آیا کہ وہ خاطر خواہ امداد کا اعلان نہیں کر رہا۔ اِدھر ناٹو کے امدادی دستوں کا پاکستان پہنچنا تھا کہ قومی خودمختاری میں مداخلت کا واویلا سنائی دینے لگا۔ یہ سب رویے ہیئتِ مقتدرہ کے ترجیحی اجتماعی نمونے کی بالواسطہ تائید کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا احوال سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عوام کو زمینی حقائق سے بے خبر رکھنا مقتدر طاقتوں کا مقصد ہے۔ حالیہ زلزلے کے بعد ۱۹۶۵ء کا اس تسلسل سے ذکر سننے سے خدشہ پیدا ہو چلا ہے کہ کہیں ایک بار پھر عوام کے جوش و جذبے کو نااہلی اور سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھانے کا سامان تو نہیں کیا جا رہا۔

Scanned with CamScanner

۲۲/نومبر ۲۰۰۵ء

*

سیاسی عمل سے انکار کا رویہ

پاکستان میں زلزلہ زدگان کی مدد کے لیے منعقدہ ڈونرز کانفرنس کی کامیابی سے نہ صرف ڈگمگاتی ہوئی حکومت کو خاصا سہارا ملا ہے بلکہ پشتینی نمک خواروں کو بھی سیاسی قیادت کو 'لتاڑنے' کا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ دشنام کی اس فہرست میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے۔ ''سیاسی رہنما بے عمل ہیں۔ عوام میں اپنی مقبولیت کھو بیٹھے ہیں۔ وہ کوئی مثبت کام کرنے کی بجائے محض باتیں بگھارنا اور تنقید کرنا جانتے ہیں۔'' یہ الاپ گزشتہ ۵۰ برس میں بڑے تسلسل سے دہرایا گیا ہے۔ پاکستان میں سیاسی عمل کا انحطاط مختلف مراحل سے گزرتا ہوا گزشتہ ۲۰ برس میں گویا اپنے منطقی انجام کو پہنچا ہے، تاہم جمہوری مکالمے اور سیاسی عمل سے انکار کا رویہ ہماری تاریخ کے تار و پود میں گندھا ہوا ہے۔

اگر آپ نے کبھی مختلف تعلیمی درجوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طالب علموں کے اردو اخبارات میں انٹرویو پڑھے ہیں تو شاید آپ نے محسوس کیا ہو کہ ان نونہالوں سے ایک سوال سیاست دانوں کے بارے میں ضرور پوچھا جاتا ہے اور ان ہونہاروں نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا: ''ہمیں سیاست سے نفرت ہے؛ ڈاکٹر، انجینئر یا سول سرونٹ بن کے قوم کی خدمت کریں گے۔'' گویا سیاست میں حصہ لے کر قوم کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی سانس میں مثالی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ ہونہار بروا قائداعظم محمد علی جناح کا نام لینا نہیں بھولتے۔

ہم عصر جنوبی ایشیا پر سند کا درجہ رکھنے والے سٹینلے والپرٹ نے زلفی بھٹو آف پاکستان کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں جہاں جہاں بھٹو صاحب کے کسی ناقابل دفاع یا ناقابل توجیہہ رویے کا ذکر آیا ہے، مصنف رومن اردو میں ایک لفظ ''سیاست'' لکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ والپرٹ صاحب سیاست کے انگریزی مترادف سے آگاہ نہیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ اردو

میں اس لفظ کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ انگریزی زبان میں کسی شخص کو سیاسی کہنا گویا اس کے باشعور اور ذمہ دارانہ سماجی رویے کا اعتراف ہوتا ہے۔ ادھر ہمیں کسی کو عیار، دھوکے باز اور کائیاں قرار دینا ہو تو ہم سلیس اردو میں کہتے ہیں، بھئی وہ شخص بڑا سیاسی ہے، یا پھر کہتے ہیں، میاں سیاست نہ کرو، کام کی بات کرو۔

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان تعلیمی، سماجی اور معاشی اعتبار سے خاصا پسماندہ تھا چنانچہ یہاں سیاسی روایت بھی کمزور تھی۔ کانگریس عوامی تنظیم اور جدوجہد کے ان گنت مراحل سے گزر کر سیاسی پختگی کو پہنچی تھی؛ دوسری طرف مسلم لیگ کے اوراق میں عوامی رابطے، تنظیم اور جدوجہد کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں تحریکِ پاکستان کے کارکن تو بے شمار ہیں لیکن چند مستثنیات کے ساتھ تحریکِ آزادی کا کارکن نسخے میں ڈالنے کو نہیں ملتا۔

مسلم لیگ کی تنظیمی کمزوری پر مستزاد تقسیم کی اکھاڑ پچھاڑ تھی۔ پاکستان بننے کے ایک ہفتے بعد ہی صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت برطرف کر دی گئی۔ لیاقت علی خاں سیاسی مخالفت پر ایسے ٹپٹائے کہ فروری ۱۹۴۸ء میں دستور ساز اسمبلی کے فلور پر سہروردی کے خلاف قابلِ اعتراض زبان استعمال کی۔ سیاسی عمل کا آغاز غداری کے الزام سے ہو تو الٹے پاؤں کا یہ سفر جمہوریت کی بجائے آمریت پہ ختم ہوتا ہے۔ پاکستان کی بانی جماعت عوام کے اعتماد کی بجائے حیلے بہانوں سے حکومت کرنے کا سوچنے لگی۔

ریاست کے جدید نمونے میں آئینی اور جمہوری عمل سے انحراف اندھیری رات میں دروازہ کھلا چھوڑنے کے مترادف ہے۔ ایسے گھر میں چور اور درندے گھس آتے ہیں۔ افسر شاہی نے سوچا کہ اگر آئین، زبان اور قومیتوں پر لڑتے جھگڑتے سیاست دانوں نے عوامی تائید کے بغیر ہی حکومت کرنا ہے تو پھر انتظامی مہارت اور تجربے سے بہرہ ور افسر شاہی کیوں نہ حکومت کرے۔ پھر جلد ہی بابو صاحبان کی انگلی پکڑے فوج اقتدار میں چلی آئی۔ دلیل یہ کہ فوج ایک منظم ادارہ ہے جو پارلیمانی ہلڑ بازی کی بجائے مستعدی سے مسائل حل کر کے ملک کو سیدھے راستے پر ڈال دے گا۔

اس میں اڑچن یہ ہے کہ اگر غیر جمہوری اور غیر سیاسی تدابیر سے مسائل حل ہو سکتے ہیں تو پھر اقتدار دوبارہ سیاستدانوں کے سپرد کیوں کیا جائے؟ سو غیر نمائندہ حکمرانوں کا ایک اہم منصبی فریضہ جمہوریت کی مذمت اور سیاستدانوں کی کردار کشی قرار پایا۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سے ہر فوجی حکومت کل

Scanned with CamScanner

وقتی بنیادوں پر یہ کام تن دہی سے کرتی چلی آ رہی ہے۔ دوسری طرف اقتدار میں آنے والی کوئی بھی سیاسی قیادت اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اپنی قومی فوج کی سرعام مذمت نہیں کر سکتی۔ اس کشمکش کا حتمی نتیجہ سیاسی عمل سے برگشتگی کی صورت میں برآمد ہوا۔

جمہوریت کی طرف پیش رفت سیدھی شاہراہ پر مسلسل سفر نہیں ہے۔ جمہوری عمل طویل، صبر آزما اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ معاشرتی ارتقا میں ہزار رکاوٹیں آتی ہیں لیکن جمہوریت کا لطیف دودھ تیر بہدف صدری نسخوں کی ملاوٹ قبول نہیں کرتا۔ سیاسی کارکنوں کو پختگی تک پہنچنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ پاکستان میں یہ ہوتا رہا کہ جتنی دیر میں سیاسی قیادت کی ایک نسل تیار ہوتی ہے اگلی فوجی حکومت دھڑن تختہ کرنے کو آن موجود ہوتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے بعد تو گویا اس رہنمائی کا کھٹکا بھی نہیں رہا۔

تمدنی قوتوں پر عسکری بالادستی کی ربع صدی دیکھ لینے کے بعد صحافیوں، وکلا، سول افسروں اور پیشہ ورانہ طبقات کی بڑی تعداد نے گویا ماورائے آئین حکمرانی کے ساتھ ان کہا سمجھوتا کر لیا ہے۔ کہنا چاہیے کہ طویل خشک سالی کے باعث پانی کی سطح اتنی نیچے چلی گئی کہ مستقل بنجر پن نے آلیا۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات شخصی سیاست کا نقطۂ آغاز تھے۔ ذات پات اور شخصی اثر و نفوذ کی بنیاد پر سیاست کا نقطۂ اختتام ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں سامنے آیا جب کسی سیاسی جماعت نے منشور تک پیش کرنے کی زحمت نہیں کی؛ حتیٰ کہ پورے ملک میں ایک بھی بڑا جلسہ منعقد نہیں ہوا۔

پاکستان کی موجودہ سیاسی قیادت نے فوجی بالادستی میں اپنے شعور کی آنکھ کھولی تھی۔ آج پاکستان میں کوئی سیاسی جماعت یا رہنما ایسا نہیں جس نے کہیں نہ کہیں غیر جمہوری یا غیر آئینی سلسلہ جنبانی یا سمجھوتے نہ کیے ہوں۔ ٹریڈ یونینوں، صحافتی تنظیموں، بار کونسلوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سیاسی شعور کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ سیاسی بیداری کے ان سرچشموں کو یا تو سایۂ عاطفت میں لے لیا گیا ہے یا ان کے پر کاٹ دیے گئے ہیں۔

پاکستان میں کسی منتخب حکومت نے اپنی آئینی مدت پوری نہیں کی۔ رائے دہندگان کبھی کسی برسرِ اقتدار جماعت کو ووٹ کے ذریعے تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حتیٰ کہ جن انتخابات میں کوئی متحارب فریق اقتدار میں نہیں تھا، رائے دہندگان ٹھیک ٹھیک جانتے تھے کہ ان دیکھی مقتدر قوتوں کی جانب سے کس جماعت کو اذنِ اقتدار ملا ہے۔ پاکستان میں کوئی انتخاب دھاندلی کے

Scanned with CamScanner

الزامات سے خالی نہیں رہا کیونکہ خود مختار اور غیر جانبدار الیکشن کمیشن کی روایت موجود نہیں ہے۔

فی الوقت سیاسی منظرنامے میں سیاسی کارکن نام کی جنس معدوم ہے۔ جماعتی وابستگی کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بیشتر انتخابی حلقوں میں روایتی حریف خاندانوں کو نمائشی طور پر کسی سیاسی جماعت کی مدد درکار ہوتی ہے۔ مقابلہ صرف یہ ہے کہ کون حکومتِ وقت کی سرپرستی جیتنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دوسرا حریف سیاسی بقا کے لیے وقتی طور پر حزبِ اختلاف کا رخ کر لیتا ہے۔

جن معاشروں میں ریاست کے تنخواہ دار ادارے خود کو 'حساس' قرار دیں وہاں رائے عامہ بے حس ہو جایا کرتی ہے۔ جاندار رائے عامہ کی عدم موجودگی میں سیاسی عمل اپنی موت آپ مر جاتا ہے اور سیاسی قیادت نہیں پنپتی۔ کسی قوم کا، خاص طور پر اگر وہ سولہ کروڑ محنتی، باصلاحیت اور بنیادی طور پر دیانتدار انسانوں پر مبنی قوم ہو، تمدنی، علمی اور جمہوری امکان مردہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن موجودہ مایوس کن تصویر کی جڑیں ایک ہی بنیادی علت سے جڑی ہوئی ہیں کہ پاکستان میں ریاستی اداروں نے سماج پر تحکمانہ بالادستی قائم کر رکھی ہے۔

سیاسی عمل تو معاشرے کے گلی کوچوں سے جنم لیتا ہے۔ ایسے میں سیاسی جماعتوں کی ناگفتہ بہ صورت حال کا پھلکا اڑانا تو زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہے۔

۲۹ نومبر ۲۰۰۵ء

❋

جب احمدیوں کا وجود جرم ٹھہرا

پاکستان کے قیام کا مطالبہ اقلیتوں کے تحفظ کے نام پر کیا گیا تھا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کی صورتِ حال خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔

۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء کی صبح وسطی پنجاب کے قصبے منڈی بہاؤالدین میں احمدیہ فرقے کی مسجد پر نامعلوم موٹر سائیکل سواروں کی اندھا دھند فائرنگ سے آٹھ نمازی جاں بحق اور متعدد افراد زخمی ہو گئے۔

اس 'مظلوم فرقے' کے خلاف معاشرتی امتیاز اور اشتعال پذیری کا یہ عالم ہے کہ صدر اور وزیر اعظم کی رسمی مذمت کے سوا بیشتر سیاسی اور سماجی رہنماؤں کی آواز تک سنائی نہیں دی۔ اردو کے ان شذرہ نویسوں کی اکثریت خاموش رہی جو افغانستان میں تورا بورا کے پہاڑوں پر جہازی حجم کا مرثیہ رقم کرتے ہیں۔

۱۲ نومبر کو ضلع ننکانہ صاحب کے قریب ایک قصبے سانگلہ ہل میں مشتعل مسلم ہجوم نے تین گرجا گھر، ایک کانونٹ، ایک ہائی سکول اور مقامی مسیحی آبادی کے متعدد مکانات نذرِ آتش کر دیے۔ خوش قسمتی سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، اگرچہ ہزاروں مسیحی شہریوں کو جان بچانے کے لیے گھر بار چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ فریقین کے متعدد افراد گرفتار ہوے۔ احمدی شہریوں کے مقابلے میں مسیحی آبادی کے ساتھ اتنی رعایت برتی گئی کہ وزیر اعلیٰ نے بنفسِ نفیس سانگلہ ہل کا دورہ کرنے اور عدالتی تحقیقات کا حکم دینے کی زحمت گوارا کر لی۔

حالات و واقعات کا تانا بانا کچھ بھی ہو، پاکستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت اور اقلیتوں کے حقوق کی ناگفتہ بہ صورت حال ان معمولات کے بغور جائزے کی متقاضی ہے۔ پاکستان کے بانیوں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ پاکستان کسی ایک مذہبی گروہ کے لیے بنایا جائے گا۔ بلکہ مسلم لیگ نے مذہب کی بنیاد پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی شدید مخالفت کی تھی۔ مسلم لیگ کا مطالبہ اپنی اصل صورت میں تسلیم کیا جاتا تو پاکستان میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کا تناسب ۶۰ اور ۴۰ فی صد کے قریب ہوتا۔ اسی طرح ۳ جون کے تقسیمِ ہند کے منصوبے میں تبادلۂ آبادی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ تقسیم کے موقعے پر رونما ہونے والے فسادات میں فریقین کے قانون شکن عناصر کا ہاتھ تھا جو اپنے مذموم مفادات کے لیے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔ برصغیر کی تاریخ کا کوئی سنجیدہ طالب علم سوچ بھی نہیں سکتا کہ درجۂ اول کی قیادت یعنی قائداعظم، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کسی بھی سطح پر فسادات میں ملوث تھے۔ تاہم فسادات کے نتیجے میں حالت امن میں انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انخلا سامنے آیا اور پاکستان میں مسلمان آبادی کا تناسب ابتدائی اندازوں سے بہت زیادہ ہوگیا۔ اس کے دو خطرناک نتائج سامنے آئے۔

اولاً یہ کہ بچی کھچی مذہبی اقلیتوں کی سیاسی اور سماجی حالت نہایت کمزور ہوگئی۔ ثانیاً یہ کہ مسلمان آبادی کی اتنی بڑی اکثریت کے پیشِ نظر مذہبی سیاست کرنے والے عناصر کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ بانی پاکستان کے واضح اعلان ''مذہب کا ریاست کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں'' کے باوجود ریاست

Scanned with CamScanner

کے لیے مذہبی شناخت کا مطالبہ شروع کر دیں۔

اس خطرناک کھیل کے اصل مضمرات تب سامنے آنا شروع ہوئے جب جمہوری عمل کمزور ہوا اور اس کے نتیجے میں سیاسی قیادت کے اخلاقی قد کاٹھ اور ریاست کے اداراتی اختیارات کو زنگ لگنے لگا۔ سیاسی قیادت نے آئین سازی کی بجائے 'قراردادِ مقاصد' جیسے حیلوں بہانوں کی آڑ ڈھونڈنا شروع کر دی۔ یہ صورت حال مذہبی منافرت کے نام پر دکان چمکانے والوں کے لیے کھلی دعوت تھی۔

۱۹۵۳ء کے احمدی مخالف فسادات گویا آنے والے دنوں کی ابتدائی تصویر تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب اقبال اور ملّا میں ایک نامور عالمِ دین کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے کہا تھا کہ ابھی تو ہم نے ایک فرقے کی خبر لی ہے، بعد میں دوسروں کی طرف رخ کریں گے۔ ان فسادات پر تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پاکستان کی بہترین سرکاری دستاویزات میں شمار کی جاتی ہے۔

پاکستان میں معاشرت اور سیاست کا نیا رنگ ڈھنگ دیکھ کر سب سے پہلے اینگلو انڈین آبادی نے ملک چھوڑنا شروع کیا۔ یہ ایک نہایت تعلیم یافتہ، مہذب اور قانون پسند جماعت تھی جو طب، تعلیم، ریلوے اور فضائیہ جیسے شعبوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی تھی۔ متوقع معاشرتی اور ریاستی تحفظ کی صورت نہ پا کر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اینگلو انڈین آبادی کی اکثریت پاکستان چھوڑ گئی۔ کراچی میں چند گھرانوں کو چھوڑ کر آج پاکستان میں اینگلو انڈین آبادی کا نام و نشان نہیں ملتا۔

۱۹۷۴ء میں پارلیمانی قانون سازی کی عجیب و غریب مثال سامنے آئی جب ریاست نے اپنے شہریوں کے ایک گروہ کا عقیدہ متعین کرنے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی۔ وزیرِاعظم بھٹو کے الفاظ میں ''نوے سال پرانا مسئلہ حل کر دیا گیا''۔ تاہم انھیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اصولوں پر سمجھوتے بازی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا؛ ایسا کرنے سے جمہوریت دشمن قوتیں مضبوط ہوتی ہیں۔ ریاست کا کام اپنے شہریوں اور ان کے تمام طبقات کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ عقیدے کا تعلق ہر انسان کے انفرادی ضمیر سے ہے۔ اگر پارلیمنٹ اس طرح کی امتیازی قانون سازی کر سکتی ہے تو فوجی آمر کو اپنے مفادات کے لیے اپریل ۱۹۸۴ء کا فرمان جاری کرنے سے کیسے روکا جا سکتا تھا؟ 'اینٹی احمدی آرڈیننس' نامی اس فرمان کی رو سے احمدیوں کے لیے سرِعام کلمہ پڑھنا، نماز ادا کرنا، سلام کرنا، عبادت کے لیے اکٹھے ہونا حتیٰ کہ مسلمانوں جیسے نام تک رکھنا جرم قرار پایا۔ دوسرے لفظوں میں احمدیوں کا وجود ہی جرم قرار دے دیا گیا۔

Scanned with CamScanner

اس قانون کے تحت سیکڑوں احمدی مقدمات بھگت رہے ہیں اور سزائیں جھیل رہے ہیں۔

پاکستان میں غیر مسلم آبادی کا تناسب اتنا کم ہے کہ مسلمان اکثریت کے ساتھ کسی حقیقی سیاسی یا معاشی تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل تضاد تو جدید پاکستانی ریاست اور ان عناصر میں ہے جو مذہب کے نام پر حکومت پر زبردستی قبضہ کرنا اور شہریوں کو اپنے ترجیحی طرزِ حیات کی پابندی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ریاست کے اختیارات کو وقتی سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھایا جارہا ہے۔ اس جھگڑے میں عورتوں اور مذہبی اقلیتوں کی حیثیت اس گھن کی ہے جو گیہوں کے ساتھ پس رہا ہے۔ ریاست امتیازی قوانین اور سیاسی مراعات کی صورت میں بھیڑیوں کے سامنے چند ٹکڑے ڈال کر سمجھتی ہے کہ وہ جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

پاکستان میں جرائم کی شرح انتہائی بلند اور امن و امان کی صورت حال مخدوش ہے۔ ایسے میں جرائم پیشہ گروہوں نے انتہا پسند عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔ یہ صورت حال پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کے لیے نہایت تشویش ناک ہے۔ آبادی میں ان کا تناسب نہایت کم سہی لیکن ۱۶ر کروڑ آبادی کے ملک میں ان کی تعداد ۴۸ر لاکھ ہے۔ براعظم یورپ میں ۲۷ ممالک ایسے ہیں جن میں سے کسی کی کل آبادی ۵۰ر لاکھ سے زیادہ نہیں۔

ترقی یافتہ دنیا کو بظاہر دور دراز اور ترقی پذیر ملک پاکستان کی مذہبی اقلیتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوسکتی اور بیرونی احتجاج کی چھوٹی موٹی آوازوں کو پاکستان داخلی خودمختاری کے نام پر رد کردیتا ہے۔ تاہم دہشت گردی کے عالمی خطرے سے دوچار دنیا کو احساس ہونا چاہیے کہ پاکستان میں مذہب کے نام پر امتیازی سلوک سے دراصل وہ معاشرتی ماحول پروان چڑھتا ہے جس میں دہشت گردوں کو بہترین پناہ گاہیں میسر آتی ہیں؛ جہاں نفرت انگیز تقریر و تحریر کا دور دورہ ہے۔

یک رخے ذرائع ابلاغ، امتیازی قوانین، پسماندہ نصابِ تعلیم اور موقع پرست سیاسی قیادت نے اس معاشرے کو مہذب دنیا کے لیے تشویش ناک خطے میں بدل دیا ہے۔

۷ر دسمبر ۲۰۰۵ء

❁

حدود آرڈیننس اور حقوقِ نسواں

۱۸۲۹ء کی بات ہے۔ برطانوی گورنر جنرل لارڈ بینٹنک نے ایک قانون کے ذریعے ستی کی رسم کو جرم قرار دے دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس اقدام کے پیچھے کلکتہ کے ایک اصلاح پسند ہندو مدبر راجہ رام موہن رائے کا ہاتھ تھا جو بیس برس سے ستی کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ آج بھی ہندوستان میں کبھی کبھار کسی خاتون کو مردہ شوہر کی چتا میں جلانے کی خبر سننے میں آ جاتی ہے، مگر اس کی قانونی حیثیت جائز معاشرتی رسم کی نہیں بلکہ جرم کی ہے۔

اس کے ٹھیک سو برس بعد ۱۹۲۹ء میں بمبئی کے ایک دبلے پتلے روشن خیال قانون داں محمد علی جناح نے ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز سے ایک قانون منظور کرایا جس کی رو سے کمسن بچوں کی شادی کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا، مگر مسلمان مذہبی پیشواؤں کا ایک غول خم ٹھونک کے میدان میں آ گیا اور اس قانون کی مخالفت کرتے ہوئے سیکڑوں کمسن بچوں کے زبردستی نکاح پڑھوائے گئے۔ قوم کی اس کم نگاہی کے باعث کم عمر میں شادی پر پابندی کا قانون عملی طور پر غیر موثر ہو گیا۔

قوموں کی ترقی یا پسماندگی کے اشارے ایسی ہی باتوں سے متعین ہوتے ہیں۔ آج محمد علی جناح سے وفاداری کا دم بھرنے والے ان مذہبی پیشواؤں کے کچھ جانشین پاکستان کی قومی اسمبلی میں بیٹھے ہیں جنھوں نے گزشتہ ہفتے (۶ ردسمبر ۲۰۰۵ء کو) حدود قوانین کی امتناعِ زنا دفعات میں ایک معمولی ترمیم کو بلڈوز کر دیا۔ قومی اسمبلی کے رکن کنور خالد یونس نے مسودۂ قانون تجویز کیا تھا کہ زنا بالجبر کے مقدمات میں چار بالغ مسلم مردوں کی عینی شہادت کی شرط ختم کر دی جائے۔ زنا بالجبر کا شکار ہونے والی مظلوم عورت اس جرم کے چار بالغ مسلم مرد گواہ کہاں سے لائے؟ اگر چار بالغ مسلمان اپنی موجودگی میں اس جرم کو روک نہیں سکتے تو وہ عدالت میں گواہی دینے کیوں آئیں گے؟ دنیا بھر میں زنا بالجبر کے بیشتر واقعات میں کوئی عینی گواہ موجود نہیں ہوتا۔ یہ مظلوم عورت کے ساتھ انتہائی زیادتی ہے کہ اس سے واقعے کے گواہ پیش کرنے کے لیے کہا جائے جبکہ اس جرم کی اطلاع

Scanned with CamScanner

دیتے ہی وہ قانون میں ایک اصطلاحی سقم کی بنا پر بذاتِ خود مجرم ٹھہرتی ہے۔ حدود کے قانون میں زنا اور زنا بالجبر میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، چنانچہ زنا بالجبر کی شکایت کرنے والی خاتون اگر موقعے کے چار عینی گواہ پیش نہ کر سکے تو اپنی شکایت کی روشنی میں زنا کی مرتکب قرار پاتی ہے۔

انسانی معاشرے میں کسی بھی جرم کی ان گنت شکلیں ہو سکتی ہیں۔ کوئی شخص لڑکیوں کے ہاسٹل میں گھس کے یہ جرم کر سکتا ہے جہاں اگر کوئی گواہ ہوگا تو صرف عورتیں ہوں گی۔ کوئی اور مجرم کسی غیر مسلم گھرانے میں جا کے اس جرم کا ارتکاب کر سکتا ہے جہاں موقعے کے گواہ صرف غیر مسلم ہوں گے۔ ایسے سنگین جرم میں عورتوں اور غیر مسلم شہریوں کی گواہی رد کرنا انتہائی ناانصافی ہے۔ ۱۹۸۳ء میں تو اس قانون کی مدد سے زنا بالجبر کی شکایت کرنے والی صفیہ نامی ایک تیرہ سالہ نابینا لڑکی کو اپنے ملزمان شناخت نہ کر سکنے پر سزا سنائی گئی تھی جسے اندرون اور بیرونِ ملک شدید احتجاج پر ختم کیا گیا۔

اگست ۱۹۹۷ء میں سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس اسلم ناصر زاہد کی سربراہی میں قائم سینیٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اعداد و شمار کے ذریعے بتایا تھا کہ حدود قوانین کے اجرا سے پاکستان میں خواتین قیدیوں کی تعداد پانچ گنا بڑھ گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر خواتین حدود قوانین کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔ کسی قانون کی افادیت اس کے اطلاق اور اثرات سے جانچی جاتی ہے۔ اطلاق کی صورت یہ ہے کہ ۲۶ برس میں کسی ایک مرد ملزم پر حد جاری نہیں ہو سکی جبکہ متعدد عورتوں کو کوڑوں اور سنگساری کی سزائیں سنائی جا چکی ہیں۔ جہاں تک اثرات کا تعلق ہے تو وزارتِ داخلہ کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۹۵ء میں عورتوں کے اغوا کے مقدمات کی تعداد ساڑھے چھ ہزار تھی جو ۲۰۰۴ء میں ساڑھے نو ہزار سے تجاوز کر گئی۔

ربع صدی سے متعدد حکومتی اداروں اور کمیٹیوں نے حدود قوانین کو بدلنے بلکہ منسوخ کرنے کی سفارش کی ہے۔ یکے بعد دیگرے حکومتوں نے اس قانون کو بدلنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے لیکن اس کے لیے درکار سیاسی عزم کا اندازہ ۶ دسمبر ۲۰۰۵ء کی پارلیمانی کارروائی سے کیا جا سکتا ہے۔ قبل ازیں نام نہاد غیرت کے نام پر قتل کے خلاف جو قانون منظور کیا گیا تھا اسے قصاص و دیت کو تحفظ دے کر عملی طور پر غیر موثر کر دیا گیا تھا۔ اس بار حکومتی ارکان نے مجوزہ مسودۂ قانون کو متحدہ مجلس عمل کے ارکان سے مل کر رد کیا۔ رائے شماری کا نتیجہ سامنے آنے پر اسمبلی کا فلور ایم ایم اے کے پارلیمانی ارکان کی تالیوں سے گونج

Scanned with CamScanner

اٹھا۔ یہ اندازہ مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ اس غیر منصفانہ قانون کو برقرار رکھنے میں دراصل کسے دلچسپی ہے۔

مسودۂ قانون کی مخالفت کرتے ہوئے پارلیمانی امور کے وزیر ڈاکٹر شیر افگن نے دلیل دی کہ حدود قوانین کو آٹھویں آئینی ترمیم کے ذریعے آئینی تحفظ حاصل ہے چنانچہ اسے عام قانون سازی کے ذریعے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اُدھر ایم ایم اے کے رکن اسمبلی ابوالخیر صاحب کا ارشاد تھا کہ حدود آرڈیننس خدائی قانون ہے اور پارلیمنٹ اُسے تبدیل نہیں کر سکتی۔ یعنی پارلیمنٹ جس قانون کو آئینی تحفظ دے سکتی ہے، اسے تبدیل کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ وزیر قانون وصی ظفر نے یہ گرہ لگانا ضروری سمجھا کہ مغربی ملکوں کے برعکس پاکستان میں عورتوں کو مکمل مساوات اور آزادی حاصل ہے۔ مغرب ہو یا مشرق، عورتوں کے ساتھ ناانصافی کے واقعات ہر جگہ پیش آتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مغرب میں حکومتیں برے قوانین کے ذریعے ان ناانصافیوں کو تحفظ فراہم نہیں کرتیں۔

مسودۂ قانون کے تجویز کنندہ کنور خالد یونس کا کہنا تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۹ء میں یہ قانون سعودی عرب کو خوش کرنے کے لیے بنایا تھا کیونکہ دنیا کے ۵۷ مسلم اکثریتی ممالک میں یہ قانون صرف سعودی عرب اور پاکستان میں نافذ ہے۔

تاہم پاکستان کی سیاسی تاریخ سے آشنا حلقے ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ فروری ۱۹۷۹ء میں جب یہ قوانین نافذ کیے گئے، سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل کی سپریم کورٹ میں سماعت آخری مراحل میں تھی اور فوجی آمریت کے خلاف تحریک کی قیادت دو خواتین بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے ہاتھ میں تھی اور اس قانون کا ایک ممکنہ پہلو پاکستان میں عورتوں کی سماجی اور سیاسی حیثیت کم کر کے حکومت مخالف تحریک کی قیادت کو کمزور کرنا بھی تھا۔

حدود قوانین کو خدائی قانون قرار دینے والے جانتے ہیں کہ اسلامی فقہ کے مستند ماہرین متفق ہیں کہ قرآن میں رجم کی سزا کا کوئی ذکر نہیں جو پاکستان کے حدود قوانین کا حصہ ہے۔ حتیٰ کہ وفاقی شرعی عدالت حضور بخش کیس (PLD 1981, 145) میں ۲۰ برس پہلے رجم کو غیر شرعی قرار دے چکی ہے، جسے بعد ازاں حکومتی اپیل (PLD 1983, FSC 255) کے نتیجے میں برقرار رکھا گیا تھا۔

مذہب کے نام پر قانون سازی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ مذہبی جنون میں مبتلا افراد کو ایک اور ہتھیار مل جاتا ہے۔ قانون اور انصاف کے گلے میں ایسا ڈھول پہنا دیا جاتا ہے جسے بجانے پر سب

Scanned with CamScanner

مجبور ہوتے ہیں۔

کچھ عرصے سے حکومت کو پاکستان کے بیرونی تاثر کی کافی فکر ہو رہی ہے۔ دوسری طرف پے در پے ایسے واقعات سامنے آئے ہیں جن سے پاکستانی عورتوں کی حقیقی حالتِ زار واضح ہوئی ہے۔ ان واقعات کی تشہیر پر اربابِ اختیار بہت نالاں ہیں۔ سماجی دانشوروں کا کہنا ہے کہ جرائم کے واقعات سے کسی ملک کا تاثر خراب نہیں ہوتا؛ معاشروں کا تاثر جرائم کے خلاف حکومتوں کی غیر موثر قانون سازی اور قانون پر عمل درآمد میں ناکامی پر خراب ہوتا ہے۔

عورتوں کے حقوق پر سرکاری کانفرنسوں سے کیا حاصل، اگر حکومت ایک غیر منصفانہ قانون میں معمولی سی ترمیم پر بھی تیار نہیں؟ ایسے میں عورتوں کے حقوق کے لیے نمائشی اقدامات کا ڈھنڈورا پیٹنا تو ان غریبوں کو کیک کھانے کا مشورہ دینا ہے جنھیں روٹی نصیب نہیں ہوتی۔

۱۴ر دسمبر ۲۰۰۵ء

❁

خبر کا جبر

پچھلے برس لندن بم دھماکوں کے چند ہی روز بعد برطانوی پولیس نے خودکش دہشت گردوں کے نام جاری کردیے۔ دو روز بعد پاکستان کے ایک کثیرالاشاعت اخبار (روزنامہ جنگ) کے صفحۂ اوّل پر ایک دو کالمی خبر شائع ہوئی کہ نامزد دہشت گرد حبیب حسین سعودی عرب میں زندہ موجود ہے۔ مقصد یہ باور کرانا تھا کہ دھماکوں کی ذمہ داری ناروا طور پر بے گناہوں پر ڈالی جا رہی ہے۔ کچھ روز بعد برطانوی پولیس کے نامزد کردہ دہشت گرد صدیق خان کی وڈیو سامنے آئی۔ اسی اخبار میں صفحۂ اوّل کے نچلے حصے میں تین سطر کی یک کالمی خبر میں وڈیو کی اطلاع دی گئی۔

حسیب حسین والی خبر افواہ تھی۔ لیڈز میں مقیم اس کے والدین نے خود پولیس کو اس کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی، لیکن اردو پڑھنے والوں کے لیے اس افواہ میں دلچسپی کا بہت کچھ سامان پیدا کیا گیا

تھا۔ دوسری طرف صدیق خان کی وڈیو واضح ثبوت تھی کہ پولیس نے صحیح خطوط پر تفتیش کی تھی، لیکن اخبار نے خبر کی پیشکش اور لفظوں کے انتخاب سے پڑھنے والوں کو گمراہ کرنے کی پوری کوشش کی۔

خبر کا یہ جبر مخصوص مفادات رکھنے والے صحافیوں، اخباری اداروں اور سرکاری اہلکاروں کا گٹھ جوڑ ہے — ایک خاص سیاسی نقطۂ نظر کو غیر محسوس طریقے سے پڑھنے والوں تک پہنچانا، پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیات کو دیر تک پروان چڑھانا اور پھر اعلان کرنا کہ ذرائع ابلاغ، سیاسی رہنما اور فیصلہ ساز ادارے اس گمراہ رائے عامہ کے پابند ہیں۔ یہ بات مکمل طور پر فراموش کر دی جاتی ہے کہ حقائق سے ناواقف، تجزیے سے قاصر اور تنقیدی شعور سے عاری یہ رائے عامہ انھی افراد اور اداروں نے پیدا کی ہے جو اس کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

پاکستان میں بہت سے ادارے بیک وقت انگریزی اور اردو اخبارات شائع کرتے ہیں۔ مشاہدہ یہ ہے کہ ایک ہی ادارے کے اردو اور انگریزی اخبارات میں نقطۂ نظر اور خبروں کی پیشکش میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ انگریزی اخبار میں حقائق اور غیر جانبدار تجزیے کو خاصی جگہ دی جاتی ہے جبکہ اردو پڑھنے والوں کو جذباتی تاثرات اور متعصب تبصرے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ انگریزی میں لکھنے والا صحافی اسی ادارے کے اردو اخبار میں لکھنا چاہے تو اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے قطع نظر، اس پالیسی کے دو مقاصد ہیں۔ پہلا تو یہ کہ بیرونی دنیا میں جہاں انگریزی اخبارات پڑھے جا سکتے ہیں، مقامی صحافت کی آزادی اور غیر جانبداری کا رنگ جمایا جائے۔ لیکن زیادہ اہم مقصد یہ ہے کہ اردو پڑھنے والے عوام کو سیاسی، معاشی اور سماجی حقائق سے بے خبر رکھا جائے۔ انگریزی داں طبقہ اپنی مختصر تعداد اور مراعات یافتہ حیثیت کے باعث سیاسی صورتحال پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں یہ طبقہ بہتر تعلیمی معیار کی بنا پر خبر اور پراپیگنڈے میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، چنانچہ اسے کسی قدر متوازن خبریں دینے میں کوئی حرج نہیں۔ کہیں کہیں تحقیقی صحافت کے کسی نمونے کو صحافتی آزادی کی مثال کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاہم چائے خانوں اور بسوں ویگنوں میں اردو اخبار پڑھنے والوں کو فوج، مذہبی سیاست، کشمیر اور جہاد کی بھاری خوراک پلانا ضروری ہے۔

پاکستانی صحافت میں صورت حال ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ آزادی کے ابتدائی برسوں میں

Scanned with CamScanner

اردو صحافت پر عوام دوستی، اصول پسندی اور حکومت پر تعمیری تنقید جیسے رجحانات غالب تھے۔ ضمیر نیازی مرحوم کہتے تھے کہ چھوٹے موٹے واقعات کو چھوڑ کر روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار جیسے اداروں نے انگریزی صحافت کی بھی رہنمائی کی۔ اس رجحان پر پہلی کاری ضرب ۱۹۶۰ء میں لگی جب پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر ریاستی قبضہ کر کے بقول قدرت اللہ شہاب 'نیا ورق' الٹا گیا۔ اس نئے ورق پر صحافت کا معیار، آئی اے رحمٰن کے بقول، یہ تھا کہ صدر ایوب خان کی والدہ کے انتقال کی خبر پاکستان کے سب سے بڑے انگریزی اخبار کی شہ سرخی تھی۔

دس برس بعد یحییٰ خان کے وزیر اطلاعات نوابزادہ شیر علی خاں نے مذہب اور سیاست کی آمیزش سے 'نظریۂ پاکستان' کا قوام تیار کیا تو صحافت کے دونوں پلڑوں میں قریب قریب ایک جیسی صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ اگر آئی ایچ برنی یا مظہر علی خاں قلم بیچنے پر تیار نہیں تھے تو جابر سلطان کی اجازت سے لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ بہر صورت خط تقسیم کے دونوں طرف صحافت کا معیار زوال پذیر تھا۔ ہفت روزہ 'شہاب' کا کارٹون قابو میں تھا نہ روزنامہ جسارت کی سرخی میں توازن تھا۔ کہتے ہیں کہ اس دور کی صحافت کی نمائندہ مثال روزنامہ آزاد میں عباس اطہر کی تخلیق کردہ سرخی ''اِدھر ہم، اُدھر تم'' تھی۔

پھر ضیاء الحق کی اقتدا میں محمود اعظم فاروقی وزیر اطلاعات بنے۔ فسطائی اور اشتراکی پراپیگنڈے کے تمام آزمودہ ہتھکنڈے پاکستانی صحافت پر آزمائے گئے۔ تب تک پاکستان کے ابتدائی صحافیوں کی نسل مر کھپ چکی تھی۔ ان کے بیرون ملک تعلیم پانے والے بچے انگریزی صحافت یا زیادہ سرسبز وادیوں میں نکل گئے تھے۔ جو چند سر پھرے باقی تھے انھیں مرچوں کی دھونی دے کر نکالا گیا۔ باقیوں نے امیر المومنین کی اطاعت کر لی۔

اردو صحافت میں نئے الفاظ متعارف کرائے گئے۔ مذہبی جماعتوں کی بجائے 'دینی جماعتیں' اور مسلمانوں کی بجائے 'اُمہ' جیسے لفظ استعمال ہونے لگے۔ خدا حافظ 'اللہ حافظ' ہو گیا۔ سالانہ بجٹ پر اداریوں میں اقبال کے اشعار سے کام لیا جانے لگا۔ وطن دشمنی اور غداری کی پہلے سے موجود اصطلاحات پر 'مذہب سے بیزاری' کا طعنہ بڑھایا گیا۔ فن اور ثقافت، 'فحاشی اور عریانی' ہو گئے۔ سیاسی کارکن 'کالعدم' جبکہ مولوی صاحبان 'علمائے کرام' اور 'مشائخ عظام' ہو گئے۔ روشن خیالی کو 'مادر پدر آزادی' لکھا جانے لگا۔ بے اصولی کو 'شرافت کی سیاست' قرار دیا گیا۔ اخبارات میں ذات برادری

Scanned with CamScanner

اور قبیلے کی عصبیتوں پر خیال انگیز تبصرے لکھنے والوں کی مانگ بڑھ گئی۔

کسی صحافی نے ایرانی انقلاب کا پرچم اٹھالیا تو کسی کو خلیج کا خالص اسلام راس آ گیا۔ اخبارات پہ کڑی مگر نادیدہ سنسر شپ کے باعث خبر مفقود تھی۔ ادارتی صفحوں پر کالم نگاروں کی بن آئی۔ ان کالموں میں وزیر اعلیٰ سے اپنی گاڑی کے لیے ایر کنڈیشنر مانگنے یا ممکنہ شائقین کے لیے اپنا فون نمبر لکھنے کی آزادی ہے بشرطیکہ گاہے گاہے حکومت وقت خاص طور پر ہمہ مقتدر حلقوں کی مدح سرائی کا سلسلہ جاری رہے۔

مغرب میں دہشت گردی کے تجزیہ نگار شاید یہ نہیں جانتے کہ میڈرڈ اور لندن میں دھماکوں کا اصل نشانہ تو وہ رائے عامہ ہے جو ڈاکٹر قدیر خان کو قومی ہیرو اور امریکی سازش کا شکار سمجھتی ہے؛ جسے باجوڑ پر درجنوں کالم پڑھنے کو ملتے ہیں مگر جو بلوچستان میں مرنے والوں کی تعداد نہیں جانتی۔

۸ر جنوری ۲۰۰۶ء

❊

بلوچ احساس مسترد نہیں کیا جا سکتا

بلوچستان میں برسوں سے سلگتی کشیدگی، آگ اور خون کے بڑے منظر میں بدلتی نظر آ رہی ہے۔ ریاست اور بلوچ قوم پرستوں میں مسلح تصادم کی یہ پانچویں کڑی ہے۔ اس تنازعے کا پہلا منظر خان قلات اور قائد اعظم میں سمجھوتے کے چند مہینے بعد ہی یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو فوجی چڑھائی کی صورت میں سامنے آ گیا تھا۔ بلوچ بغاوت کی دوسری کڑی ۱۹۵۸ء میں شروع ہو کر ۱۵ر جولائی ۱۹۶۰ء کو نام نہاد معاہدۂ امن کے علی الرغم سرکردہ بلوچ رہنماؤں کی پھانسی پر منتج ہوئی۔ ۱۹۶۳ء میں منتخب بلوچ نمائندوں کی بغاوت یحییٰ خان کی آمد تک جاری رہی۔ بلوچوں کے خلاف بھٹو صاحب کی کارروائی جنرل ضیا کے مارشل لا تک چلتی رہی۔

موجودہ فوجی کارروائی میں ہمیشہ کی طرح اخفا اور بدتدبیری کی گہری دھند موجود ہے۔ سیاسی مخالفین کو غدار قرار دیا جا رہا ہے۔ مبینہ غیر ملکی ہاتھ کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔ بلوچوں کے اجتماعی

Scanned with CamScanner

امکان (potential) پر انگلی اٹھائی جا رہی ہے۔ قومی یک جہتی کے نام پر حقیقی مسائل سے نظر چرائی جا رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح پاکستانی عوام کو حقیقی صورت حال سے بے خبر رکھا جا رہا ہے۔

صوبائی تنازعات کی تاریخ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں ہر فوجی حکومت کے دوران کسی نہ کسی ایسے صوبے میں تصادم کا شاخسانہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے جسے فوج میں مناسب نمائندگی حاصل نہیں ہوتی۔ ایوب خان کے عہد میں بلوچستان میں چڑھائی ہوئی۔ یحییٰ خان مشرقی پاکستان گنوا بیٹھے۔ ضیاء الحق دور میں سندھ بندوقوں سے گونجتا رہا۔ موجودہ فوجی بندوبست میں بلوچ کشیدگی قریب پانچ برس سے جاری ہے۔

اس تنازعے کا ایک فریق تو بلوچ سردار ہیں۔ دوسرا فریق بلوچ عوام ہیں۔ تیسرا فریق پاکستان کے ریاستی ادارے ہیں۔ صورت حال کا چوتھا ممکنہ فریق پاکستان کے دیگر صوبوں کے عوام ہیں جن کی بڑی تعداد حالات سے بے خبر بھی ہے اور بڑی حد تک لاتعلق بھی۔ اس چوتھے فریق کی عدم موجودگی مسئلے کے بنیادی سبب کی نشاندہی کرتی ہے۔

تمام معاشروں میں قدیم نظام حکومت سے جدید قومی ریاست بدلنے کے عمل میں کچھ خطوں اور گروہوں کو مشکل حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ کرد قومیت ترکی، ایران اور عراق میں منقسم ہے تو یورپ میں روما قبائل اور دوسرے خانہ بدوش گروہ موجود ہیں۔ امریکہ میں ریڈ انڈین ہیں تو شام اور بحرین میں مذہبی اقلیتیں بالادست ریاستی شناخت سے بیگانگی کا شکار ہیں۔ جدید ریاست، اپنی مخصوص جغرافیائی حدود نیز شہری اور ریاست کے براہ راست تعلق کے باعث، بلوچستان جیسے قدیم معاشرتی نمونوں کو غیر ضروری مداخلت معلوم ہوتی ہے۔ اس کا حل نہ تو نسلی، لسانی اور ثقافتی شناختوں کو جھٹلانا ہے اور نہ ریاست کی عملداری کمزور کرنا ہے۔ ایسے پیچیدہ حالات کا قابل عمل حل عوام کی امورِ سیاست میں بامعنی اور استحقاقی شمولیت ہے۔ تمام باخبر مبصرین متفق ہیں کہ پاکستان میں بامعنی سیاسی عمل کا راستہ روک دیا گیا ہے چنانچہ ملک کے مختلف حصے سیاسی اقتدار اور فیصلہ سازی کے معاملے میں احساسِ محرومی کا شکار ہیں۔

ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ بلوچستان میں مسلمہ قبائلی سرداروں کی تعداد ۱۲۰ سے زیادہ نہیں اور ان میں سے ۱۰۰ کے لگ بھگ سردار غیر مشروط طور پر حکومت کے حامی سمجھے جاتے ہیں۔ اگر مسئلہ محض قبائلی سرداروں کے مفادات کا ہے تو سوال کیا جا سکتا ہے کہ بلوچ عوام کی اتنی بڑی تعداد اپنے

Scanned with CamScanner

سرداروں کی اکثریت کے خلاف مٹھی بھر سرداروں کا نقطۂ نظر کیوں تسلیم کرتی ہے۔ اس کا واضح مطلب لیا جا سکتا ہے کہ بلوچستان میں وسیع پیمانے پر احساسِ محرومی پایا جاتا ہے۔ اس خیال کی حمایت اور تردید میں اعداد و شمار کے گورکھ دھندے سے قطع نظر، حقیقی مسئلہ یہی ہے کہ پاکستان میں آئین کو بے وقعت کر دیا گیا ہے۔ آئین ہی وہ دستاویز ہے جو عوام کو ریاست سے جوڑتی ہے۔ آئین کی فصیل گر جائے تو مسائل کا سیاسی حل ممکن نہیں رہتا؛ مکالمہ رک جاتا ہے اور باہمی اعتماد کا بحران پیدا ہوتا ہے۔

بلوچستان کے قوم پرست حلقے چار بنیادی خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گوادر بندرگاہ بننے سے صوبے کے جنوبی خطے میں آبادی کا تناسب بدل جائے گا اور بلوچ اپنی ہی زمین پر اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ بندرگاہ کی انتہا پسند مخالفت سے قطع نظر، معتدل بلوچ حلقوں کا مطالبہ ہے کہ بندرگاہ بننے کے بعد یہاں آنے والوں کو ایک خاص مدت تک رہائشی حقوق کے حصول نیز مقامی سیاست میں حصہ لینے سے روکا جائے۔ سرکاری موقف یہ ہے کہ ایک ہی ریاست کے شہریوں کو نقل مکانی کرنے اور سیاسی عمل میں حصہ لینے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ تاہم سرکاری حلقے ان سوالات کا جواب نہیں دیتے کہ گوادر میں فوجی اداروں اور افسران کو قریب ۶۵ ہزار ایکڑ زمین الاٹ کی گئی ہے۔ چند سو روپے فی ایکڑ زمین کی قیمت دیکھتے ہی دیکھتے ۱۵ لاکھ روپے فی ایکڑ تک جا پہنچی ہے۔ یہ زمین واضح طور پر مطلوبہ ہنر مند افراد کے نہیں بلکہ مراعات یافتہ طبقات کے ہاتھ میں جا رہی ہے جو اس بندرگاہ کے معاشی مواقع سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ گوادر سے کراچی تک تو سڑک تعمیر ہو چکی، مگر گوادر اور کوئٹہ کے درمیان سڑک محض کاغذوں پر موجود ہے۔

بلوچ قوم پرستوں کا دوسرا اہم اعتراض گوادر کے قریب چھاؤنی کی تعمیر نیز صوبے میں ۶۰۰ کے قریب نیم فوجی چوکیوں پر ہے۔ امن و امان کے لحاظ سے بلوچستان دو حصوں میں تقسیم ہے۔ صرف ۵ فی صد حصے پر پولیس کی عملداری ہے اور ۹۵ فی صد حصہ نیم فوجی اداروں کے زیرِ اہتمام ہے۔ بلوچ قوم پرستوں کو گوادر اور دوسرے کچھ شہر پولیس کے سپرد کرنے پر اعتراض ہے۔ اصولی طور پر تو چھاؤنی کی تعمیر معاشی اور تمدنی مواقع پیدا کرتی ہے، لیکن بلوچستان میں فوجی مداخلت کی طویل تاریخ کے پیشِ نظر چھاؤنی کے قیام پر تشویش ناقابلِ فہم نہیں۔

تاریخی طور پر بلوچستان جیسے مرکزی اقتدار سے کٹے ہوئے علاقوں میں اختیارات نچلی سطح پر

رہے ہیں اور عام آدمی کے لیے انصاف کی صورت حال کبھی مثالی نہیں رہی، چنانچہ بلوچ عوام کو مطلق العنان مقامی سردار کی بجائے جدید ریاستی بندوبست کا حصہ بننے پر خوش ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ پاکستانی ریاست کے ادارے بدعنوانی کی شہرت رکھتے ہیں اور سیاسی عمل کی عدم موجودگی میں ان پر کوئی روک ٹوک بھی نہیں۔

بلوچستان معدنی وسائل سے مالا مال ہے۔ ضلع ڈیرہ بگٹی سے ہر روز ۷۰۵ ملین مکعب فٹ گیس نکالی جاتی ہے جو پاکستان کے کونے کونے میں پہنچتی ہے۔ یہاں پر جگہ جگہ قیمتی پتھروں اور کوئلے کی کانیں ہیں۔ تیل کے بے پناہ ذخائر ہیں۔ انتہا پسند قوم پرست بلوچ پاکستان سے پیچھا چھڑا کر جدید عالمی معیشت میں ان وسائل سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ادھر ریاست اپنی آئینی عملداری سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہے۔ اعتدال پسند قوم پرستوں کا کہنا ہے کہ گیس کی سالانہ ۸۷ ارب روپے کی آمدنی سے بلوچستان کو محض ۵ ارب روپے ملتے ہیں۔ سرکاری بیانات کے مطابق ایک آدھ سردار کو ملنے والی بے پناہ مراعات صوبے کے عوام کی خوشحالی کا نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔

وسائل کی تقسیم کے سوال میں ایک پیچیدگی یہ ہے کہ رقبے کے اعتبار سے بلوچستان پاکستان کا ۴۳ فیصد حصہ ہے لیکن اس کی ستر لاکھ آبادی کل آبادی کا صرف ۵ فیصد ہے۔ قومی وسائل کی تقسیم آبادی کے اعتبار سے کی جاتی ہے اور بلوچستان کے حصے میں آنے والے ۵ فیصد وسائل انتظامی امور پر صرف ہو جاتے ہیں اور ترقیاتی امور کو پوری توجہ نہیں ملتی۔ بلوچستان کے لیے ۴۳ فیصد حصے کا مطالبہ اس لیے سنجیدہ نہیں کہ دوسری طرف سندھ محصولات اور پنجاب آبادی کی بنیاد پر ایسے ہی مطالبات پیش کر سکتے ہیں۔ تاہم آبادی اور رقبے میں عدم توازن کو دور کرنے کے لیے اسی طرح کی کوئی صورت نکالنا پڑے گی جیسے قومی اسمبلی اور سینیٹ میں توازن قائم کیا گیا ہے۔

سیاسی اقتدار سے محرومی بلوچ عوام کا ایک اہم شکوہ ہے۔ اس کے جواب میں ریاست بلوچوں کی تاریخی پسماندگی اور مقامی سرداروں کی عوام دشمنی پر الزام دھرتی ہے۔ لیکن اس دلیل کا کیا جواب دیا جائے کہ بلوچ عوام یا مقتدر طبقوں نے جب بھی سیاسی عمل میں حصہ لینے کی کوشش کی، انھیں مایوسی کا منھ دیکھنا پڑا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں ریاست قلات سے معاہدے کے ۲۰ دن بعد ہی فوجی چڑھائی کر دی گئی۔ ۱۹۶۱ء میں معاہدۂ امن کے بعد بلوچ رہنماؤں کو پھانسی دی گئی۔ ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے لیے

Scanned with CamScanner

منتخب بلوچ رہنما چند ماہ بعد کوئٹہ کی قلی کیمپ جیل پہنچ گئے۔ میر غوث بخش بزنجو معتدل ترین بلوچ مدبر سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں انھوں نے آئین سازی میں بنیادی کردار ادا کیا اور ایک برس کے اندر اندر گورنر بزنجو اور وزیر اعلیٰ مینگل حیدر آباد جیل پہنچ گئے۔ ۱۹۸۸ء میں اکبر بگٹی وزیر اعلیٰ بنے اور ۱۹۸۹ء میں ان کی حکومت برخاست کر دی گئی۔ پھر عطا اللہ مینگل کے بیٹے اختر مینگل کی حکومت برطرف کی گئی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں دس سال کے اندر صوبائی خود مختاری کی ضمانت دی گئی۔ تیس برس بعد یہ ضمانت اور آئین دونوں طاق پر دھرے ہیں۔ ایسے میں بلوچوں کے احساسِ محرومی کو محض کسی تنگی ذہن کا فتور قرار دے کر رد نہیں کیا جا سکتا۔

عوام سے بیگانگی اختیار کرنے والی ریاستیں عوام پر کاٹھی ڈالنے کے لیے تاریخ اور سیاست میں من مانی پیوند کاری کرتی ہیں۔ سیاسی ماہرین کے مطابق پاکستانی ریاست نے قومی تشخص میں اردو زبان، ہندوستان دشمنی، سیاسی اسلام اور ایٹم بم کے چار پیوند لگائے ہیں۔ اردو بنیادی طور پر متحدہ ہندوستان کی سیاست سے جڑے ہوئے پنجابی اور مہاجر حلقوں کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان سے بلوچستان کی سرحد نہیں ملتی۔ مذہب کی بنیاد پر قوم کی تعمیر بنگال کی علیحدگی سے کھوکھلی ہو چکی۔ ایٹم بم سے بلوچوں کا تعلق صرف اتنا ہے کہ پاکستان ریاست نے بلوچوں کو اعتماد میں لیے بغیر ایٹم بم کا تجربہ چاغی کے پہاڑوں میں کیا تھا۔

برطانوی راج میں تیار کیے گئے ضلعی گیزیٹرز میں ہندوستانی خطوں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے بلوچوں کو 'خوددار قوم' قرار دیا گیا تھا۔ جدید ریاست میں وقار کا تصور مساوات اور حقوق سے جڑا ہوا ہے۔ معاشرے میں یکجہتی کے لیے تمام گروہوں کو سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں، مگر یہ سمجھوتے سیاسی مکالمے اور مشترکہ مفادات کی روشنی میں کیے جاتے ہیں۔ بندوق کی گولی سے منوائے گئے سمجھوتے دیرپا نہیں ہوتے۔ زمینی حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کے پہاڑ بلند بھی ہیں اور سنگلاخ بھی۔ بلوچ عوام کے دلوں تک رسائی سیاسی عمل ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

۹ رجنوری ۲۰۰۶ء

❋

Scanned with CamScanner

پاکستان: عورتوں کا دن ۱۲ ر فروری کیوں؟

دنیا بھر میں عورتوں کا دن ۸ ر مارچ کو منایا جاتا ہے مگر پاکستان میں یہ دن ۱۲ ر فروری کو منایا جاتا ہے۔ اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ ۱۹۸۳ء میں جنرل ضیاالحق نے اسلام کے نام پر ۱۸۶۲ء کے قانونِ شہادت میں ترمیم کی تھی تو اس کے تحت عورتوں کی گواہی کو مردوں کے مقابلے میں آدھا قرار دے دیا تھا۔ اس سے ٹھیک تین برس پہلے فروری ۱۹۷۹ء میں حدود قوانین کے نفاذ سے عورتوں کی قانونی، سماجی، معاشی اور سیاسی حیثیت کو خاصا دھچکا پہنچا تھا۔ قانونِ شہادت میں تبدیلیوں سے عورتوں کی حیثیت میں مزید کمی کا سخت اندیشہ تھا۔ بظاہر ۱۹۷۹ء کے حدود قوانین کا تعلق صرف جنسی بے راہ روی سے تھا لیکن عملی طور پر حدود قوانین نے عورتوں کو انسان کے درجے سے گرا کر محض ایک جنسی شے کی حیثیت دے دی۔ عورتوں کی تعلیمی ترجیحات، پیشہ ورانہ انتخاب اور سیاسی رائے کو جنسی تناظر میں دیکھا جانے لگا۔ حتیٰ کہ عورتوں کا لباس بھی حدود قوانین کی زد میں آ گیا۔ ۱۹۷۹ء میں قیدی عورتوں کی کل تعداد سو سے بھی کم تھی۔ اب یہ تعداد ۶۰۰۰ سے تجاوز کر چکی ہے۔

۱۹۸۳ء میں قانونِ شہادت میں ترمیم کے موقع پر مذہب پسند حلقوں نے طفل تسلی دینے کی کوشش کی کہ قانون میں عورتوں کی نصف گواہی کا تعلق محض مالی معاملات سے ہوگا — گویا معاشیات کی تعلیم سے بہرہ ور خاتون بینک منیجر کے مقابلے میں اس کے نیم خواندہ مرد چپراسی کی گواہی کو فوقیت دی جائے گی — تاہم کچھ ہی برس بعد مالی معاملات کی یہ شرط بھی غائب ہوگئی جب رشیدہ پٹیل کیس میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ قتل عمد کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی آدھی مانی جائے گی۔

عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیم ویمن ایکشن فورم نے قانون شہادت میں ترمیم کے خلاف ۱۲ ر فروری ۱۹۸۳ء کو جلوس نکالنے کا اعلان کیا۔ لاہور کی عورتوں نے پنجاب اسمبلی کے مقابل فری میسن بلڈنگ کے سامنے جمع ہونا تھا۔ یہاں سے انھیں چند سو گز کے فاصلے پر لاہور ہائی کورٹ جا کر چیف جسٹس کو ایک یادداشت پیش کرنا تھی۔ چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال تھے جن کی

روشن خیالی کی بڑی دھوم تھی۔ مگر فوجی آمریت کے مذہبی طوفان میں بڑے بڑے چراغ ٹمٹمار ہے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی۔ ہزاروں سیاسی کارکن جیل میں تھے۔ اخبارات پر کڑی سنسرشپ تھی۔ سندھ کے گاؤں فوج کے محاصرے میں تھے۔ فوجی آمر باقاعدگی سے سال بسال اہل قلم کانفرنس سجا کر محب وطن دانشوروں پر وطن کی چاندنی، ہوا اور پانی حرام کرنے کی دھمکی دیتا تھا۔

پاکستانی تاریخ کا یہ پہلو دلچسپ ہے کہ ہر فوجی آمریت کا مقابلہ کرنے کے لیے عورت میدان میں اترتی ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کو فاطمہ جناح نے للکارا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے لرزہ براندام تھے۔ کئی برس بعد فوجی اقتدار کے دن واپس آئے تو لاہور کی سڑکوں پر کرین سے لٹکتی گاڑی میں فوجی حکومت کا مقابلہ کرنے والی عورت کا نام کلثوم نواز تھا۔

۱۲ر فروری ۱۹۸۳ء کی شام لاہور کی عورتوں نے غیر منصفانہ قانون کی مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ چادر اور چاردیواری کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والوں کی حدِ برداشت دوسوگز دور نہ جا سکی۔ ریگل چوک پر جلوس روک کر عورتوں پر ڈنڈے برسائے گئے۔ آنسو گیس پھینکی گئی۔ انھیں سڑک پر گھسیٹا گیا۔ زخمی عورتوں کو ننگی گالیاں دیتے ہوئے گرفتار کر کے ٹرکوں میں ڈالا گیا۔ اعلیٰ اخلاقیات اور عورتوں کے احترام کے دعوے داروں نے اس پر زبان تک نہ ہلائی۔ ۱۲ر فروری کو پاکستان میں عورتوں کا دن اسی واقعے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

جسٹس منیر نے اپنی کتاب جناح سے ضیا تک میں ایک دلچسپ مشاہدہ بیان کیا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین پر بحث کے دوران لائل پور (اب فیصل آباد) سے جماعت اسلامی کے کارکن میاں عبدالباری نے نظریۂ پاکستان کی اصطلاح استعمال کی۔ ان سے اس کا مفہوم پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ نظریۂ پاکستان اسلام ہے۔ جسٹس منیر اس پر کہتے ہیں کہ مسلم اکثریتی معاشرے کی مجبوری یہ ہے کہ اسلام کا نام لینے پر کوئی سوال اٹھانے یا دلیل دینے کی ہمت نہیں کرتا۔ دانشور آرتھر کوسلر نے ایسی ہی صورت حال کے بارے میں کہا تھا کہ وہ معاشرے بدنصیب ہوتے ہیں جہاں شہریوں کی عمومی ذہنی صلاحیت کمزور اور جذبات منہ زور ہوتے ہیں۔

سماجیات کے ماہر کہتے ہیں کہ بنیاد پرستی اپنی روح میں عورت دشمن ہے۔ یہاں ثقافت، رسومات اور مذہب کی من مانی تشریح سے ایسا گدلا پانی تیار کیا جاتا ہے جس میں تہذیب کا عکس دھندلا

Scanned with CamScanner

جاتا ہے۔ پاکستان میں عورتوں کے حقوق اور حیثیت کی صورت حال ابھی تک نہیں بدلی۔ امتیازی قوانین آج بھی موجود ہیں۔ بدترین پسماندہ رسمیں جاری ہیں۔ غیر قانونی پنچایتوں میں اسمبلیوں کے ارکان اور وزرا تک شریک ہوتے ہیں۔ ہم مسلسل انکار کی کیفیت میں ہیں۔ دانشوروں کی بڑی تعداد ملک میں زنا بالجبر کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتی۔ گھریلو تشدد کے خوفناک اعداد و شمار کو جھٹلایا جاتا ہے۔ بچیوں کے سکول جلائے جانے کی گونج قانون ساز اداروں میں سنائی نہیں دیتی۔

حکومت کو محض یہ تشویش ہے کہ ان بدنما معاشرتی نمونوں کی خبر باہر کی دنیا تک کیوں پہنچتی ہے۔ اس کے ردعمل میں جنسی زیادتی کا شکار ہونے والی کسی خاتون کو زبردستی ملک سے نکالا جاتا ہے تو کسی کو ملک سے باہر سفر کرنے سے روکا جاتا ہے۔

صدر صاحب بین الاقوامی اجتماعات میں احتجاج کرنے والی عورتوں کو للکارتے ہیں۔ حکومت سرکاری اہلکاروں کی اس سادہ لوح دلیل کی چھتری تلے بیٹھی ہے کہ عورتوں سے ناانصافی کے واقعات تو ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ہوتے ہیں۔ یہ فرق فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ان ملکوں میں عورتوں کے خلاف قانون بنانے کی بجائے ایسے واقعات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۱۲ر فروری ۱۹۸۳ء کی سرد شام جب لاہور کی عورتیں آدھی گواہی کے خلاف سڑک پر نکلی تھیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ناانصافی کی یہ رات اس قدر طویل ہو جائے گی۔ فکری جبر معاشرے کے رگ و ریشے میں اتر جائے تو اجتماعی زوال کی بیماری روگ بن جاتی ہے۔

۱۲ر فروری ۲۰۰۶ء

❋

بنگلہ بھاشا آندولن: ڈھاکہ پہ کیا بیتی

قائداعظم محمد علی جناح نے قیام پاکستان کے بعد صرف ایک دفعہ مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ ۴ر فروری

Scanned with CamScanner

۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے "اردو اور صرف اردو" کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا۔ قائداعظم کے بے پناہ شخصی احترام کے باوجود بنگالی طلبا کے گلے سے احتجاج کی بے ساختہ چنگھاڑ برآمد ہوئی۔ جناح صاحب کی طویل سیاسی زندگی میں کم ہی ایسا ہوا تھا کہ انھیں کسی عوامی اجتماع میں کھلم کھلا مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

اردو پاکستان کے صرف چار فیصد باشندوں کی مادری زبان تھی جبکہ ۵۶ فیصد پاکستانی بنگالی بولتے تھے۔ ادبی روایت، فنی استعداد اور علمی ذخیرے کے اعتبار سے بنگالی کا شمار ہندوستان کی ترقی یافتہ ترین زبانوں میں ہوتا تھا۔ ادب کے میدان میں ہندوستان کے حصے میں آنے والا واحد نوبیل انعام بنگالی ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کو ملا تھا۔ ان گنت ندی نالوں کی اٹھلاتی موجوں میں بنی بنگالی زبان کا لحن قدرتی طور پر موسیقی کے لیے موزوں تھا۔ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے لیے بنگالی زبان محض جذباتی وابستگی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کے لیے معاشی امکانات اور سیاسی مواقع کا سوال بھی تھا۔

تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ زبان کے اس جھگڑے کی جڑیں دراصل متحدہ پاکستان کے انوکھے جغرافیے میں تھیں۔ مغربی پاکستان کے چاروں صوبے بنگالی زبان وثقافت سے بالکل نا آشنا تھے چنانچہ بنگالی کو قومی زبان قرار دینے میں مشکلات تھیں۔ دوسری طرف اردو کے ساتھ بنگالی کو قومی زبان بنانے سے باقی صوبوں میں مقامی زبانوں کے سلسلے میں بے چینی پیدا ہو سکتی تھی کیونکہ اردو پاکستان کے کسی خطے میں روزمرہ کی زبان نہیں تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ افسر شاہی میں اردو بولنے والوں کی بالادستی تھی جو اپنے صوبے بلکہ تحصیل ہی کے لب ولہجے کو سند جانتے تھے۔ فیصلہ سازوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ اردو کو مذہبی لبادہ پہنا کر سرکاری زبان بنا دیا جائے۔ خیال تھا کہ مذہب کی آڑ میں اس مصنوعی بندوبست سے کسی حد تک کام چلایا جا سکے گا۔

پروفیسر محمد سرور تحریک پاکستان کا ایک باب میں لکھتے ہیں کہ فضل الٰہی چوہدری (بعد ازاں صدر پاکستان) مولانا ابوالکلام آزاد سے ۱۹۵۶ء میں اپنی ملاقات کے حوالے سے بتاتے تھے کہ مولانا نے دیگر امور کے علاوہ انھیں مدبرانہ نصیحت کی تھی کہ زبان کے مسئلے پر مشرقی پاکستان کے جذبات کا خیال رکھا جائے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ پاکستان کی مرکزی قیادت کو بنگالیوں کے اپنی زبان سے تعلق کی شدت کا اندازہ نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

مشرقی پاکستان میں زبان کے تنازعے پر بے چینی اندر ہی اندر پھیلتی رہی۔ ۲۶ رجنوری ۱۹۵۲ء کو دستور ساز اسمبلی کی رہنما اصول کمیٹی نے اردو زبان کو واحد قومی زبان قرار دینے کی سفارش کی تو بنگالی احتجاج کا لاوا بہہ نکلا۔ دو روز بعد پلٹن میدان کے جلسۂ عام میں مرنجاں مرنج وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی طرف سے اردو زبان کی حمایت نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عوامی مسلم لیگ اور دیگر سیاسی وسماجی تنظیموں نے فوری طور پر کل جماعتی قومی زبان کمیٹی تشکیل دے دی جس کے سربراہ سرکردہ بنگالی رہنما ابو ہاشم تھے۔ ڈھاکہ کے طلبا نے ۴ رفروری کو قائد اعظم کے یونیورسٹی خطاب کے چار برس پورے ہونے پر ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۲۱ رفروری کو ڈھاکہ میں ایک جلوس نکالا جائے جو صوبائی اسمبلی کو بنگالی زبان کے سلسلے میں ایک یادداشت پیش کرے۔ ۲۱ رفروری کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس شروع ہونا تھا۔

مشرقی پاکستان کے چیف سیکرٹری عزیز احمد کی بے لچک ضابطہ پسندی اور شخصی رعونت ضرب المثل تھی۔ وزیر اعلیٰ نور الامین مرکزی حکومت کے حاشیہ بردار سمجھے جاتے تھے۔ صوبائی حکومت نے ۲۰ رفروری کی شام ڈھاکہ کے علاقے رمنا میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے ہر قسم کے عوامی اجتماعات پر پابندی لگا دی۔ کل جماعتی قومی زبان کمیٹی کے رہنماؤں کی اکثریت چاہتی تھی کہ قانون کی پاسداری کرتے ہوئے ۲۱ رفروری کا احتجاج منسوخ کر دیا جائے لیکن طالب علم رہنما متین الدین نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ ۲۱ رفروری کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہزاروں طالب علم دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے احتجاج میں شریک ہوئے۔ طلبا تین گھنٹے تک آنسو گیس اور پولیس کی لاٹھیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جلوس ڈھاکہ میڈیکل کالج کے قریب پہنچا تو پولیس نے گولی چلا دی۔ پانچ طالب علم — صلاح الدین، عبد الجبار، ابو برکت، رفیق الدین اور عبد السلام — موقع پر ہلاک ہو گئے۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔ طالب علموں پر گولی چلنے کی خبر سے ڈھاکہ شہر غم و غصے میں ڈوب گیا۔

کئی برس بعد فیض صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق نظم ''انتساب'' میں پاکستان کے ان بیٹوں کو یاد کرتے ہوئے لکھا تھا:

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحاب طبل وعلم

Scanned with CamScanner

کے دروں پر کتاب اور قلم
کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے
پہنچے مگر لوٹ کر گھر نہ آئے

۲۲ رفروری کو مرنے والے طالب علموں کا جنازہ ایک بڑے جلوس کی شکل اختیار کر گیا جس میں ڈھاکہ سیکرٹریٹ کے ۵۰۰۰ اہلکار بھی شریک تھے۔ توپ خانہ سے نواب پور اور صدر گھاٹ سے وکٹوریہ پارک تک ڈھاکہ شہر ''جے بانگلہ'' اور ''جے بھاشا'' کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ احتجاج کرنے والے اسمبلی تک جانا چاہتے تھے۔ جلوس کرزن ہال تک پہنچا تو پولیس نے ایک بار پھر گولی چلا دی۔ چار بنگالی کھیت رہے۔ عوامی دباؤ کے پیش نظر وزیر اعلیٰ نورالامین نے صوبائی اسمبلی میں قرارداد پیش کی جس میں مرکزی حکومت سے سفارش کی گئی تھی کہ اردو کی طرح بنگالی کو بھی قومی زبان قرار دیا جائے۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی۔

بنگالی مورخ حسن ظہیر لکھتے ہیں کہ صوبائی اسمبلی میں اب تک حزب مخالف زیادہ تر ہندو ارکان پر مشتمل تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان ارکان نے غیر مسلم قانون سازوں کے ساتھ مل کر رائے دی۔ جلد ہی عوامی مسلم لیگ کا نام بدل کر عوامی لیگ رکھ دیا گیا اور وہ واضح طور پر حکومت مخالف سیاست کرنے لگی۔

سڑکوں پر ر ستی طاقت کے اس مظاہرے کے بعد پہلی مرتبہ بنگالی مسلمانوں نے دوسرے پاکستانی شہریوں اصلہ محسوس کرنا شروع کیا۔ دو برس بعد صوبائی انتخابات میں جگتو فرنٹ نے ۳۰۹ میں سے ۳۰۱ نشستیں جیت کر صوبے میں مسلم لیگ کا صفایا کر دیا۔ ۱۹۵۶ء کے دستور میں بنگالی کو اردو کے ساتھ قومی زبان قر یا گیا تو بنگالی رائے عامہ کو اندازہ ہوا کہ جو معاملات پارلیمنٹ میں بحث مباحثے سے نہیں سلجھائے جا سکتے انھیں سڑکوں پر نعرے بازی سے منوایا جا سکتا ہے۔

دو روز تک مار دھاڑ اور گرفتاریوں سے بھاشا تحریک وقتی طور پر دب گئی مگر ۲۳ رفروری کی رات ڈھاکہ میڈیکل کالج کے طالب علموں نے راتوں رات اس مقام پر 'شہید مینار' کے نام سے ایک یادگار کھڑی کر دی جہاں طالب علم ابو برکت گولی کھا کر گرا تھا۔ یہ یادگار بنگالی قوم پرستی کی علامت بن گئی۔ ۱۹۷۰ء کا انتخاب جیت کر شیخ مجیب الرحمٰن نے آدھی رات کو جلوس کی صورت میں یہاں حاضر ہو کر بنگلہ دیش کے پرچم کو سلامی دی تھی۔ ۲۵ رمارچ ۱۹۷۱ء کو فوجی کارروائی کے دوران شہید مینار کو منہدم کر دیا گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

۱۹۵۲ء کا بھاشا آندولن بنگالی زبان و ثقافت کے لیے مخصوص تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ واقعہ دنیا بھر میں زبان، ثقافت اور شناخت کے لیے جدوجہد کا استعارہ بن گیا۔ ۱۹۹۹ء میں بنگلہ دیش اور ۲۸ دیگر ممالک نے یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں قرارداد پیش کی کہ ۲۱ رفروری کو مادری زبان کا عالمی دن قرار دیا جائے۔ یونیسکو نے رواداری، تنوع اور قبولیت جیسی اقدار کے تحفظ کے لیے یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کرلی۔ سنہ ۲۰۰۰ء سے ہر سال ۲۱ رفروری کو مادری زبان کے عالمی دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔

۲۱ رفروری ۲۰۰۶ء

❊

... تری زلف کے سر ہونے تک

چھوٹے سے قصبے میں گھر کے تمام بچوں کو سختی سے ہدایت تھی کہ غروب آفتاب سے پہلے گھر پہنچ جائیں۔ مغرب کی نماز کے بعد برآمدے میں بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا تھا۔ لالٹین کی روشنی کے علاوہ اس منظر کی ایک مانوس یا دوہ دھیمی سی دستک بھی ہے جو ہر روز شام کے دھندلکے میں سنائی دیتی تھی۔ کوئی بزرگ آہستہ سے کہتا، "مدرسے کے طالب علم ہیں۔ انھیں کھانا دیا جائے۔"

دروازہ کھلنے پر دو کم عمر بچے ہاتھ میں ایک بالٹی اٹھائے صحن میں ایک خاص مقام پر آکر کھڑے ہو جاتے۔ بالٹی میں محلے کے سب گھروں سے ملنے والے سالن کی جھلک نظر آتی تھی: ساگ کی سبزی میں دال، شوربہ اور دھنیے کی پتیاں۔ اس ملغوبے میں گوشت کا ٹکڑا شاذ ہی دکھائی دیتا۔ کبھی کبھار بڑے بھائی فقرہ کس دیتے تھے کہ یہ لڑکے بوٹیاں گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر کھا جاتے ہیں۔ احترام اور سماجی تضحیک کا یہ ملا جلا ردعمل مدرسے کی ثقافت سے پہلا تعارف تھا۔

بدقسمتی سے مدرسے سے دوسرا تعارف صرف دو دن جاری رہ سکا۔ گھر میں مار پیٹ کا چلن نہیں تھا۔ مدرسے میں بات بات پر مار کٹائی کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ کسی بچے کو چارپائی سے باندھ کر پیٹا جا رہا تھا۔ کسی کو مرغا بنا رکھا تھا۔ کسی کے پاؤں میں زنجیر بندھی تھی تو کسی کے گلے میں لکڑی کا ٹھا

لٹک رہا تھا۔ کسی مظلوم کے لیے خاص طرح کی چھڑی کا بھی بندوبست تھا۔ اُٹنگا پاجامہ پہننے والے قاری قدرت اللہ نے مار پیٹ میں ہاتھ بٹانے کے لیے دو تین ہٹے کٹے طالب علموں کا انتخاب کر رکھا تھا جو اس فن میں خاصے منجھ چکے تھے۔ مارے ہول کے بخار چڑھ آیا۔ اس پر بڑے ابا نے مولوی صاحب کو سخت سست بھی سنائیں اور گھر ہی پر قران کی تعلیم کا انتظام کر دیا۔

ابھی مدرسے کے ان نیم تاریک کونوں کھدروں کا زیادہ اندازہ نہیں تھا جہاں ہونے والے افعالِ شنیع کا ذکر کر کے پچھلے سال وزیر مملکت عامر لیاقت حسین اپنی وزارت سے قریب قریب ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مدرسے کے طالبعلموں میں خارش اور دوسرے جلدی امراض کی شرح اس لیے بلند ہے کہ مولوی صاحب حفظانِ صحت کے اصولوں سے بے خبر ہیں۔ سب بچے ایک ہی تولیہ استعمال کرنے پر مجبور تھے۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان میں دینی مدرسوں کی تعداد ۲۴۶ تھی۔ ۱۹۸۸ء میں یہ تعداد ۱۲۰۰ سے کچھ اوپر تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ افغان جہاد پر برگ و بار آیا۔ ادھر خلیج کی ریاستوں کو خدشہ تھا کہ پاکستانی تارکین وطن کی بڑی تعداد کے باعث جمہوری خیالات کے جراثیم کہیں عرب ملکوں میں نہ پہنچ جائیں۔ تیسرا پہلو یہ بر آمد ہوا کہ سلفی اسلام اور شیعہ اسلام کی نمائندہ طاقتوں نے پاکستان کی زمین پر زور آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ اس پر طرہ یہ کہ پاکستان کے نادیدہ پالیسی سازوں نے کشمیر کی بھٹی تپانے کے لیے مدرسوں کی صورت میں سستی بھرتی کا سرچشمہ دریافت کر لیا۔ مالی اور سرکاری سرپرست میسر آئے تو مذہبی مدرسوں کی تعداد چند ہی برسوں میں بیس ہزار تک جا پہنچی۔

روایتی مدرسے مسجدوں کا ضمیمہ ہوا کرتے تھے لیکن نئے مدرسے قومی شاہراہوں پر اور مہنگے کاروباری مراکز میں وسیع عمارتوں میں قائم کیے جاتے ہیں۔ مستقل آمدنی کے لیے ان کے ساتھ جدید پلازے تعمیر ہوئے۔ دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ ۸۰ فیصد مدرسے بازار کے درمیان نہیں بلکہ کونے پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ اس کا معاشی زاویہ تو یہ ہے کہ دونوں سڑکوں پر دکانیں تعمیر کر کے کرائے کی مد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں سیاسی مہارت یہ ہے کہ مدرسے کو سیاسی احتجاج کا مرکز بنانے کے لیے چوک زیادہ مناسب مقام ہے جہاں بآسانی چار سڑکوں کی ٹریفک میں خلل ڈالا جا سکتا ہے۔

جغرافیے کا ابتدائی سبق ہے کہ دریا پہاڑوں سے میدانوں کی طرف بہتے ہیں۔ مشاہدہ بتاتا ہے

Scanned with CamScanner

کہ مذہبی طہارت کا بہاؤ بھی اسی رخ پر تشکیل پاتا ہے۔ پشاور وادی کے اضلاع میں مدرسوں کے اساتذہ پاراچنار اور دوسرے قبائلی علاقوں سے چنے جاتے ہیں۔ پشاور کے علما ایبٹ آباد اور پنڈی میں نظر آتے ہیں۔ مرکزی پنجاب کے بیشتر مدرسوں میں ہری پور ہزارہ کے فارغ التحصیل مولوی حضرات براجمان ہیں۔ گوجرانوالہ میں مجلس عمل کے دونوں کامیاب امیدواروں کا تعلق ہزارہ سے تھا۔ مرکزی پنجاب کے مولوی جنوبی پنجاب کی مسجدوں کو رونق بخشتے ہیں۔ کراچی میں بہاولپور، ملتان اور ڈیرہ غازی خان کے علما کا ڈنکا بجتا ہے۔ بہاولنگر کے مولوی مسعود اظہر نے کراچی کے بنوری ٹاؤن مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔

اس جغرافیائی حد بندی کا سماجی نتیجہ یہ ہے کہ کم و بیش ہر خطے میں مدرسے کی ثقافت ارد گرد کے ماحول سے حریفانہ طور پر الگ تھلگ بھی ہے اور شدت پسندی میں دو قدم آگے بھی۔ لنڈی کوتل کے طالب علم کو لاہور کے رہن سہن میں جابجا عریانی و فحاشی نظر آتی ہے۔ شکر گڑھ اور جھنگ کے قصباتی طالب علم کو کراچی بندرگاہ ناگوار طور پر غیر مذہبی معلوم ہوتی ہے۔

مذہبی مدرسوں کی آب و ہوا پر ایک عمدہ تبصرہ تو مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر "آزاد کی کہانی" (تالیف رزاق ملیح آبادی، ۱۹۲۱ء) میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کے والد مولانا خیر الدین کا شہرہ کلکتہ سے لے کر عرب ملکوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مولانا آزاد مکتب کے شب و روز کے محرمِ راز تھے: ۱۹۲۱ء میں الہلال اور البلاغ کے مراحل سے گزر کر کل ہند رہنما کا درجہ پا چکے تھے۔ جاہ پسندی اور سازشی کٹھ ملائیت کی کہانیوں کے علاوہ مولانا کے بیان میں مدرسے کے طرزِ تعلیم کا شکوہ چھپائے نہیں چھپتا۔ بے پناہ ذہانت اور تبحرِ علمی پر جائز فخر کے باوجود مولانا کو ہمیشہ انگریزی زبان سے محرومی کا قلق رہا۔

آپ کسی ماہر تعلیم سے پوچھیے تو شاید وہ منقولی اور معقولی طریق تعلیم جیسی اصطلاحات استعمال کرے، مگر سادہ بات یہ ہے کہ مدرسے میں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سوال اٹھانے کی تربیت نہ ہونے سے طلبا کی طبیعت کو غور و فکر اور تحقیق سے تعلق نہیں رہتا۔ اپنے خیالات پر رعونت آمیز یقین کے باعث کرختگی اور شدت پسندی تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ اعتماد پیدا نہیں ہوتا جو کھلے دل سے مکالمہ کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔

اکثر مدرسوں میں جدید علوم تو ایک طرف، اردو یا فارسی کی بطور زبان تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں ہوتا اور تاریخ، جغرافیے اور ادب کی ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی۔ بیشتر حالات میں اساتذہ کو

خواندگی کی بنیادی مہارتیں بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ مدرسوں کا طالب علم جس جوش و خروش سے جدید دنیا کو قابل تحقیر تصور کرتا ہے، اس میں محض احساس محرومی یا کمتری ہی کو دخل نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محدود تربیت کے باعث آج کی پیچیدہ دنیا کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔

ہمارے بیشتر رہنماؤں کی طرح جنرل مشرف صاحب کو بھی بے تکی اصطلاحات میں اظہارِ مفہوم کا شوق ہے۔ ایک جملہ اکثر دہراتے ہیں کہ ''ان مدرسوں میں دس لاکھ طلبا کو تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی این جی او ہیں۔'' اس بیان میں این جی او سے وہ کیا مراد لیتے ہیں اب تک واضح نہیں ہوسکا، کیونکہ آج کی دنیا میں اول تو این جی او کا مفہوم خیراتی ادارے نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی ادارے کی افادیت معروض میں متعین ہوتی ہے جبکہ مدرسوں کی ساری تعلیم موضوعی افادیت رکھتی ہے۔ مدرسے کا فارغ التحصیل اپنے روزگار کے لیے مدرسہ چلانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر ایک ہزار مدرسوں سے فارغ ہونے والے طالب علم وفاق المدارس کے مطابق بیس ہزار مدرسے چلارہے ہیں تو آئندہ ۱۰برس میں کتنے مدرسوں کی ضرورت پیش آئے گی؟

اس وقت مختلف شہروں میں سیکڑوں مسجدیں مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے مولویوں کی مقدمے بازی کے باعث بند پڑی ہیں۔ خیبر ایجنسی میں دو غیر قانونی ایف ایم ریڈیو سٹیشنوں کے بیچ امن کی مرغی حرام ہورہی ہے۔

یہ دلیل بڑے طمطراق سے دہرائی جاتی ہے کہ ان مدرسوں میں دہشت گردی کی تربیت نہیں دی جاتی۔ بجا ارشاد، مگر ان مدرسوں کو دہشت گردی کی تربیت کا کردار سونپا ہی نہیں گیا۔ ان کا کام تو معاشرے میں قدیم اور جدید کے درمیان فاصلہ بڑھانا ہے؛ معاشرے میں علمی اور سیاسی مکالمے کو مفلوج کرکے ایسا ماحول پیدا کرنا ہے کہ جہاں سے جمہوریت، رواداری اور ترقی کی آواز اٹھے وہیں اسے مذہب کے نام پر ڈنڈے کی دلیل سے کچل دیا جائے۔

سرکاری بیان کے مطابق یہ مدرسے دس لاکھ طالب علموں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اگلے بیس برسوں میں ان مدرسوں سے فارغ ہونے والے طالب علموں کی تعداد ایک کروڑ ہوجائے گی۔ ہوسکتا ہے تب کوئی اور رہنما دنیا کو جہاد اور دہشت گردی میں فرق کرنے کا درس دے رہا ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی نفرت کے ہاتھوں تنگ آئی ہوئی دنیا میں اتنا تحمل موجود ہے؟

Scanned with CamScanner

۲۸ر فروری ۲۰۰۶ء

❋

یا الٰہی مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

ٹی ایس ایلیٹ نے لکھا کہ ''اپریل ظالم ترین مہینہ ہے''۔ فیض صاحب نے بھی کہا تھا، ''پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں''۔ اس ظالم مہینے میں بھی ایک تاریخ خاص طور سے ظالم ہے۔ اپریل کی چار تاریخ کو کھلنے والے پھولوں میں لہو کا رنگ اور ظلم کی بو کیوں ہوتی ہے؟

اپریل کی چار تاریخ اور ۱۹۶۸ء کا سال۔ امریکہ کے شہر میمفس میں پچھلی رات طوفان گھر کے آیا تھا۔ باہر سڑک پر تیز ہوا کے جھکڑ دیواروں سے سر پٹک رہے تھے۔ پانی کی بوندیں چھتوں پر جلترنگ بجا رہی تھیں۔ میسن چرچ کے بڑے ہال میں مارٹن لوتھر کنگ جذبوں کی آنچ میں سلگتے لفظوں کے انگارے اگل رہا تھا۔ انجیل کے سادہ مگر معجزے کی حد تک پُر اثر استعاروں میں گندھی ہوئی زبان، چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسے نشتر پروئے تھے کہ تین ہزار کا مجمع تڑپ تڑپ اٹھتا تھا۔ آبشار جیسی رواں خطابت میں آگے بڑھنے کی للکار بھی تھی، راہ کی مشکلات کی خبر بھی اور پہاڑی کے پار سکھ کے گاؤں تک پہنچنے کی نوید بھی۔

اس رات مارٹن لوتھر کنگ کے لب و لہجے میں استقلال اور گہرے اندوہ کا عجیب امتزاج تھا۔ شاید صرف انھیں معلوم تھا کہ یہ فی البدیہہ تقریر الوداعی پیغام بھی ہے۔

اگلی شام چھ بجے، چار اپریل، لورین موٹل کی بالکونی پر مارٹن لوتھر کنگ پہاڑی کے پار اُس وادی میں اتر چکا تھا، 'کوئی جا کے جہاں سے آتا نہیں'۔ گردن پر داہنی طرف رائفل کی گولی کا پھول کھلا تھا۔ انسانوں کے لیے آزادی، مساوات اور انصاف کا خواب دیکھنے والے نے آنکھیں موند لی تھیں۔

چار اپریل کی یہ تاریخ آج سے ٹھیک ستائیس برس پہلے اہل پاکستان پر بھی گزری۔ موسم بہار کی اس پر سکون صبح پاکستان ابھی نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ قصبوں میں اکا دکا دکانیں کھلنا شروع ہوئی

Scanned with CamScanner

تھیں۔ ریڈیو پاکستان سے خبریں شروع ہوئیں۔ بدھ، چار اپریل ۱۹۷۹ء۔

اصل خبر سب سے آخر میں دی گئی۔ ”سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو آج علی الصباح راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔“

اس خبر کے اندیشے میں لاکھوں آنکھیں کئی ہفتوں سے رت جگے کا شکار تھیں۔ ہزاروں سیاسی کارکن، طالب علم اور صحافی عقوبت خانوں میں بدترین تشدد سہہ رہے تھے۔ بہت سوں نے احتجاج کرتے ہوئے خود کو شعلوں کی نذر کر دیا تھا۔ ہر طرح کی سیاسی سرگرمیوں پہ پابندی تھی۔ ہوا میں کوڑوں کی سرسراہٹ تھی۔ اخبارات پہ کڑی سنسر شپ تھی۔ دن چڑھتے چڑھتے گلی کوچوں میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں جمع ہونے لگیں۔ دبی دبی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ اس روز پاکستان کے ان گنت گھروں میں چولھا نہیں جلا۔ دھوپ اس روز صحنوں میں تعزیت کرنے اتری تھی۔ ایک ان کہی دہشت تھی جو کواڑوں پہ برس رہی تھی، جیسے گھر میں موت واقع ہونے پر بچے سہم جاتے ہیں۔

ادبی جریدے فنون کا اگلا شمارہ شائع ہوا تو اس میں اختر حسین جعفری کی نظم ”نوحہ“ چھپی تھی۔ اردو ادب میں غالب نے میاں عارف اور اقبال نے داغ کے نوحے سے جو روایت شروع کی، اسے فیض نے کوئی درجن بھر نوحوں سے زندۂ جاوید بنا دیا۔ مگر اختر حسین جعفری نے نوحہ تھوڑی لکھا تھا، گویا تلوار کے ظلم کی تاریخ کا استعارہ کاغذ پہ رکھ دیا تھا۔ تلمیحات کا خروش ایسا پُر تاثیر تھا کہ ضیاء الحق نے اسی نظم کے مصرعے دہرا کے ۱۹۸۱ کی اہل قلم کانفرنس میں ادیبوں کی چھاڑ کی تھی۔

اب نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زندانِ ستم کھلتے نہیں
سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرفِ عبادت یاد تھے
پو پھٹے تک انگلیوں پہ گن لیے
اور دیکھا، رحل کے نیچے لہو ہے
شیشۂ محفوظ کی مٹی ہے سرخ
سطرِ مستحکم کے اندر بست و در باقی نہیں

ایلچی کیسے بلادِ مصر سے
سوئے کنعاں آئے ہیں
اک جلوسِ بے تماشا گلیوں بازاروں میں ہے
یاالٰہی، مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

اور آخری لائنیں:

اب سمیٹو مشک وعنبر
ڈھانپ دو لوح و قلم
اشک پونچھو اور ردائیں نوکِ پا تک کھینچ لو
کچی آنکھوں سے جنازے دیکھنا اچھا نہیں

اوریانا فلاچی سے بات کرتے ہوئے بھٹو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا، ''ہم نے سیاست اپنے دریاؤں سے سیکھی ہے۔'' کیسا درست تجزیہ تھا۔ دریاؤں کی کیا خصوصیت ہے؟ یہی کہ جیسے بھی ہو پتھریلے پہاڑوں سے اپنی راہ نکالنا، مگر موجوں کی الھڑ روانی برقرار رکھنا۔ سو اس کا پہلا حصہ بھٹو کی عملیت پسندی ہے اور دوسرا اس کی سیاست کا رومانی ڈھنگ۔

جلسۂ عام کے عوامی بھٹو اور بند کمرے کے سیاست دان بھٹو میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک سراسر معشوق تھا، رنگلا اور سرمست، دوسرا اقتدار کا بے صبر اور کائیاں عاشق۔ تو بھٹو کا المیہ کیا تھا؟ سب مقبولیت پسند سیاست دان جو کرتے ہیں بھٹو کا المیہ بھی وہی تھا، کہ اس نے اپنی سیاست کی بنیاد عوام کے خوابوں پر رکھی تھی۔ عوام کے خوابوں میں بڑا امکان پوشیدہ ہوتا ہے۔ بھٹو کے قاتل اسے پھانسی دینے سے زیادہ عوام کو شکست دینے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

سیاست میں بعض دلائل کھوکھلے ہونے کے باوجود ریت کی بوریوں کی طرح موثر طور پر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً پرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کا حق، دوسرے ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر احتجاج اور اپنے ملک میں قومی خود مختاری کا جواز وغیرہ۔ بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل کی دلیل بھی اسی طرح استعمال کی گئی۔ اس مقدمۂ قتل کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ ستائیس

برس گزرنے کے باوجود پاکستان کی کسی چھوٹی یا بڑی عدالت میں آج تک نواب محمد احمد خان قتل کیس کی نظیر پیش نہیں کی گئی۔ ۱۸۶۰ء میں قانونِ تعزیرات ہند کے نفاذ کے بعد سے سوائے بھٹو کے کسی کو اعانتِ جرم کے الزام میں موت کی سزا نہیں دی گئی۔

بھٹو سیاست دان تھا۔ سیاست دانوں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ بھٹو کی غلطیوں کی فہرست مختصر نہیں ہے لیکن ۱۹۷۷ء میں اقتدار پر شب خون مارنے والے جرنلوں کو ان غلطیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دنیا بھر کے اسلحے، تابع فرمان انتظامیہ اور حکم کے غلام سیاستدانوں کی پوری حمایت کے باوجود، ۴ر اپریل ۱۹۷۹ء کی رات جرنلوں کے ہاتھ پاؤں اس لیے کانپ رہے تھے کہ بھٹو پاکستان کا آخری سیاستدان تھا جو عوامی مقبولیت کے بل پر فوج کے سیاسی عزائم کا راستہ روک سکتا تھا۔

ڈاکٹر اقبال احمد سیاسی تاریخ کی پیچیدگیوں کو سادہ لفظوں میں بیان کرنے کی خاص صلاحیت رکھتے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں امریکہ سے لاہور تشریف لائے۔ کسی مجلس میں ایک نوجوان بھٹو پر تنقید میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دھیرے سے کہا، ''مگر میرے بھائی، بھٹو صاحب نے بڑی بہادری سے جان دی۔'' جدید عالمی تاریخ میں چلی کے صدر سلوادور آئندے کے استثنٰی کے ساتھ یہ بات کتنوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے؟

اسی کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ بھٹو صاحب کی مقبولیت پسند سیاست نے لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی عوامی حکومت کے صرف پانچ سال، چھ مہینے اور پندرہ دن دیے۔ عوام کی محبت نے تو ذوالفقار علی بھٹو کو صدیاں بخشی ہیں۔

چار اپریل کو جان دینے والے مارٹن لوتھر کنگ اور ذوالفقار علی بھٹو کی ذات میں بہت سے نکات مشترک تھے اور دونوں کی سیاست میں کئی زاویے مختلف بھی تھے۔ لیکن امریکہ اور پاکستان میں یہ فرق ہے کہ مارٹن لوتھر کنگ کی موت اس کے لوگوں کے لیے مرگِ یوسف ثابت ہوئی اور بھٹو کی موت پاکستان کے عوام کے لیے مرگِ امید ٹھہری۔

۴ر اپریل ۲۰۰۶ء

❁

شہرِ لاہور تیری رونقیں دائم آباد

جہانگیر کی ملکہ نور جہاں نے لاہور میں دفن ہونا پسند کیا۔ اس نے لاہور کے بارے میں جیتے جی لکھا تھا: ''لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم''۔ انبالے سے ناصر کاظمی لاہور آئے اور انھوں نے لاہور کی رونقوں کو دوام کی دعا دیتے ہوئے لکھا: ''تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو''۔

۱۹۷۴ء میں حیدر آباد ٹربیونل کے قیدی بھٹو صاحب کے زنداں میں سندھ کی زمین کو آسمان کر رہے تھے۔ حیدر آباد جیل کی ایک تاروں بھری رات میں حبیب جالب نے لکھا: ''لاہور کے سب یار بھی سو جائیں تو سوئیں''۔

دیکھیے آپ کو لاہور کے اتنے شعری حوالے دے دیے مگر موضوعِ سخن واضح نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ لاہور سے ایک اچھی خبر آئی ہے، اور یہ خبر لاہور کی گلزار گلیوں ہی سے آسکتی تھی۔ سیسل شیراز راج حلقۂ اربابِ ذوق کے سیکرٹری منتخب ہوگئے ہیں۔ وہ حلقے کی ۶۷ سالہ تاریخ میں پہلے غیر مسلم سیکرٹری ہیں۔ انھوں نے ۲۲۸ میں سے ۱۴۱ ووٹ لیے ہیں۔ شیراز راج کے انتخاب پر بات کرنے سے پہلے حلقۂ اربابِ ذوق کا تعارف ہو جائے۔

آپ کو ایک تصویر دکھاتے ہیں [1] یہ جو بیچ میں دوہرے بدن کے تراشیدہ مونچھوں والے صاحب کھڑے ہیں انھیں چراغ حسن حسرت کہتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کے انتقال کے بعد سے اردو نثر ماتم میں ہے۔ داہنے ہاتھ جو کوئی تیس برس کا تیکھے نقوش والا نوجوان نظر آرہا ہے اس کا نام ثناءاللہ ڈار تھا۔ اسے اردو ادب کی تاریخ میں میراجی کے نام سے یاد رکھا جائے گا۔ یہ ۱۹۴۱ء میں حلقۂ اربابِ ذوق کے نومنتخب عہدیداران کی تقریبِ حلف برداری کی تصویر ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق برصغیر پاک و ہند کا واحد ادبی ادارہ ہے جس کی ہفتہ وار تنقیدی نشستوں میں ۱۹۳۹ء سے آج تک کبھی خلل

1۔ پچھلے اندرونی سرورق پر دی گئی تصویروں میں اوپر والی تصویر دیکھیے۔

Scanned with CamScanner

نہیں آیا۔ ۱۹۴۷ء کے خونچکاں اگست میں جب ہندوستان کے رہنے والے دھرم اور مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، دہلی کے ساؤتھ بلاک میں حلقۂ ارباب ذوق کا اجلاس اس شان سے منعقد ہوا کہ غلام عباس نے افسانہ پڑھا اور دوسری کرسی پر صاحبِ صدر عبادت بریلوی بدمزہ نہیں ہوئے کہ اجلاس کا واحد سامع غلام عباس کا کتا تھا جو میز پہ بیٹھا تھا۔

حلقے کا ادبی معیار ایسا ضرب المثل تھا کہ یہاں بیٹھنے والے قیوم نظر اور انجم رومانی چوبیس پچیس سال کی عمر ہی میں استاد قرار پائے۔ حلقے کا ایک مستقل چہرہ زاہد ڈار ہے، مال روڈ کے فٹ پاتھ سے خرید کر پرانی کتابیں پڑھنے والا اور نامانوس لہجے میں اعلیٰ پائے کی شاعری کرنے والا۔ یہاں سعادت سعید نے سوشلزم کا ڈنکا بھی بجایا اور بارہ آنے والی ٹوپی پہن کر اسلامی انقلاب کا چرچا بھی کیا۔ مرحوم حنیف رامے، انتظار حسین اور ناصر کاظمی کی میز ہی سے اٹھ کر پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تھے۔ بنگال سے آنے والا خوش شکل سراج منیر حلقے سے ہو کر ہی ۴ رکلب روڈ پر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ تک پہنچا تھا۔

حلقۂ ارباب ذوق پاکستان کا تہذیبی چہرہ ہے۔ اسے ٹائروں کی دکان میں بدلنے کی بہت سی کوششیں ناکام ہو چکیں۔ یہاں درویش فنکار امانت علی خاں کی آواز گونجتی ہے: ''پیار نہیں ہے سُر سے جس کو، وہ مورکھ انسان نہیں۔''

اب کچھ بات شیراز راج کی ہو جائے۔ مئی کی ۲۸ تاریخ تھی اور ۱۹۹۸ء کا سال۔ بچوں کے حقوق کے لیے گلوبل مارچ اس روز سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت برن پہنچا تھا۔ لاہور فون کیا تو ارشد محمود نے ایٹمی دھماکوں کی اطلاع یوں دی جیسے کوئی وکیل قتل کے ملزم کو عمر قید کی خوش خبری سناتا ہے۔ موسم بہار کی خوشگوار دھوپ برن کے گلی کوچوں میں بکھر رہی تھی۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر وسیع چوراہے میں سیکڑوں چہرے ہنس رہے تھے، گا رہے تھے۔ ہوا میں غبارے اڑ رہے تھے۔ موسیقی کی دھن تیز تھی۔ مگر بیئر کا گلاس ہاتھ میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ آنسو نکل آئے۔ قریب کھڑے دوست نے گلے لگا کر تسلی دی۔ دکھ یہ تھا کہ ایٹمی تباہی کی کنجی ان کے ہاتھ آ گئی تھی جو خیالی گھوڑوں پر سوار ہو کر غنیم کی بستیوں پر چڑھ دوڑنے کے خواب دیکھتے تھے۔ جو شہر کی کسی عمارت میں لگنے والی معمولی آگ پر قابو پانے کا سامان نہیں رکھتے تھے وہ تابکاری کے اہل ہو گئے تھے اور گویا اسے شب برات کا پٹاخہ سمجھتے تھے۔ گجرات کے ایک چوہدری صاحب نے کہا تھا، ''اگر چلانے نہیں تو بنائے کیوں تھے۔'' تکلیف دہ منظر یہ تھا کہ پاکستان اور بھارت

Scanned with CamScanner

میں بہت سے چہرے خوشی سے یوں تمتمار ہے تھے گویا ترقی اور تہذیب کی معراج پالی ہو۔

پاکستان پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابتدائی اطلاع سے کہیں زیادہ نقصان ہوا تھا۔ گوجرانوالہ کے قریب علی پور چٹھہ سے تعلق رکھنے والے صدر مملکت نے آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق بھی سلب کر لیے تھے۔ یہ رستم کیانی کی وہی گالف کی چھڑیوں والی معروف کہانی تھی، مگر وہ قصہ پھر سہی۔

دفتر پہنچے تو ایک صاحب میز پر سر رکھے گویا مراقبے میں تھے۔ سر اٹھایا تو آنکھیں شدتِ گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ یہ شیراز راج تھا۔ میز پر لکھی نظم کا کاغذ اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ یہ نظم تھی، ''پوکھران سے چاغی''۔ آخری مصرعے تھے:

یہ کیسی آگ ہے جس میں
ازل کی دائمی یخ بستگی میں منجمد کہسار جلتے ہیں
ابد کے سرد خانے میں پڑی لوحِ شکستہ پر لکھے اسرار جلتے ہیں
صحیفوں میں رقم افکار جلتے ہیں
مگر پھر بھی
بجھا سورج نہیں جلتا
اندھیرا کم نہیں ہوتا
یہ کیسی روشنی ہے

شیراز راج مسیحی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتا ہے — اس میں تو خبر کا کوئی پہلو نہیں، کہ پاکستان کے سب شہریوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ خبر یہ ہے کہ جہاں پاکستان کے کونے کونے میں مذہبی منافرت کی آگ بھڑک رہی ہے، گرجے سلامت ہیں نہ مسجدیں محفوظ ہیں، لاہور کے ادیبوں نے رواداری اور مساوات کے حق میں رائے دی ہے۔ کوئی دس برس پہلے حلقہ ارباب ذوق کے انتخاب میں آخری دفعہ ووٹ دینے کا تجربہ خوشگوار نہیں رہا تھا۔ شیعہ سنی کی غیر ادبی بنیاد پر ووٹ مانگے جا رہے تھے۔ اس برس بھی اطلاعات کے مطابق انتخابی مہم میں شیراز راج کے عیبوں میں اس کا مسیحی ہونا اور پاک بھارت دوستی کا حامی ہونا وغیرہ گنوائے گئے، لیکن لاہور کے ادیبوں کو حرفِ تحسین کہ انھوں نے جمہوری اور روادار پاکستان کے حق میں رائے دی۔

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کے قدامت پسند آسٹرین سیاستدان میٹرنخ (Metternich) نے یورپ میں ملکوں ملکوں بھڑکتے انقلابات پر بھنا کر کہا تھا کہ فرانس میں کسی کو چھینک آجائے تو پورے یورپ کو زکام ہونے لگتا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق نے لاہور میں جو اعلان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت اور روشن خیالی کا زکام ابھی ختم نہیں ہوا۔

۱۴را پریل ۲۰۰۶ء

❈

پھانسی گھاٹ پہ گھاس

وسطی برطانیہ کا شہر لیڈز ان دنوں اپنے ایشیائی باشندوں کی نسبت سے خبروں میں ہے۔ حالیہ انتخابات میں یہاں سے پہلی بار ایک ایشیائی نژاد مسلم شہری میئر منتخب ہوئے ہیں۔ دوسری طرف اسی شہر کا پاکستانی نژاد برطانوی باشندہ مرزا طاہر حسین یکم جون کو عین اپنی ۳۶ویں سالگرہ کے دن سزائے موت کے انتظار کی کربناک کشمکش میں مبتلا ہے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق صدر جنرل پرویز مشرف نے مرزا طاہر حسین کی سزائے موت پر غیر معینہ مدت تک عملدرآمد روک دیا ہے، اگرچہ سرکاری ذرائع سے اس خبر کی تصدیق ابھی باقی ہے۔

مرزا طاہر حسین کے معاملے میں غیر معمولی دلچسپی کی وجہ ان کی دوہری شہریت نہیں بلکہ مقدمے کے حیرت انگیز حقائق ہیں۔ برطانیہ میں پیدا ہونے والے اٹھارہ سالہ طاہر ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو اپنے رشتے داروں سے ملنے پاکستان پہنچے۔ کراچی میں ایک رات قیام کے بعد ۱۷ر دسمبر کو راولپنڈی آئے جہاں سے انھوں نے اپنے گاؤں (ضلع چکوال) جانے کے لیے ٹیکسی کرائے پر لی۔ مرزا کے بیان کے مطابق راستے میں ٹیکسی ڈرائیور نے ان پر جنسی حملہ کرنے کی کوشش کی۔ دونوں میں ہاتھاپائی کے دوران ٹیکسی ڈرائیور اپنے ہی پستول کی گولی لگنے سے زخمی ہوگیا۔

Scanned with CamScanner

طاہر حسین اسی گاڑی میں بیٹھ کر قریبی پولیس سٹیشن پہنچے اور پستول سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس دوران ٹیکسی ڈرائیور زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ طاہر حسین پر قتل اور رہزنی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور ۱۹۸۹ء میں سیشن کورٹ نے انھیں موت کی سزا سنا دی۔ لاہور ہائی کورٹ نے مقدمے کی سماعت میں شدید خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سزائے موت ختم کر دی اور مقدمہ دوبارہ سماعت کے لیے سیشن کورٹ میں بھیج دیا جہاں سے طاہر حسین کو ۱۹۹۴ء میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

اس سزا کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ عدالت عالیہ نے ۲۰ رمئی ۱۹۹۶ء کو مرزا طاہر کو تمام الزامات سے بری کر دیا۔ لیکن ایک ہفتے بعد اس فیصلے کے خلاف وفاقی شرعی عدالت سے اس بنیاد پر رجوع کیا گیا کہ ابتدائی مقدمے میں عائد کردہ رہزنی کا الزام شرعی عدالت کے دائرۂ سماعت میں آتا ہے۔ شرعی عدالت نے طاہر کو رہزنی کے الزام سے تو بری کر دیا مگر قتل کے الزام میں سزائے موت سنا دی۔ شرعی عدالت کے تین منصفین میں سے ایک نے طاہر کو تمام الزامات سے بری کرنے کی رائے دی۔ اس منقسم فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں دو دفعہ اپیل کی گئی مگر دونوں اپیلیں مسترد کر دی گئیں۔ صدر پرویز مشرف نے بھی رحم کی اپیل مسترد کر دی ہے۔

پاکستان میں نظام عدل کی کشتی انگریزی قوانین کی منہ زور لہروں اور کچے پکے مذہبی قوانین کی جس دلدل میں ہچکولے کھا رہی ہے اس میں ایک خطرناک چٹان وفاقی شرعی عدالت ہے جسے جنرل ضیاالحق نے ۱۹۷۹ء میں آئین کے ۷ویں حصے میں باب ۳ رالف کی صورت میں ایزاد کیا تھا۔ متوازی قانونی نظام کی حیثیت سے قطع نظر، اس عدالت کی ساخت ہی میں امتیازی سلوک کے بیج پائے جاتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کا کوئی غیر مسلم شہری اس عدالت کا منصف نہیں بن سکتا لیکن یہ عدالت غیر مسلم شہریوں پر مقدمے چلا سکتی ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کی تشکیل کا مقصد نظامِ عدل میں مذہبی اختیار کو توسیع دینا تھا، چنانچہ ابتدا ہی سے اس عدالت کے فیصلے انتظامی مصلحتوں، ریاستی تقاضوں اور معمول کے عدالتی نظام سے متصادم رہے ہیں۔ کبھی اس کے چیف جسٹس کو مطلوبہ فیصلے نہ دینے کی پاداش میں برطرف کیا جاتا ہے تو کبھی ماورائے عدالت حیلوں سے اس پر کاٹھی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی واضح مثالیں رجم کی سزا، حدود کے قوانین اور سود کے مسئلے پر وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے ہیں۔

ایسی قانون سازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی جنون میں مبتلا گروہوں کو ریاست کو کچوکے لگانے کے لیے ایک اور پلیٹ فارم میسر آ جاتا ہے، جبکہ ریاست اپنے نظریاتی دعووں کا بھرم رکھنے کے لیے دوٹوک موقف اختیار کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔

گزشتہ ربع صدی میں دنیا بھر میں سزائے موت کے خلاف مہم شروع ہوئی۔ اب تک ۱۲۰ کے قریب ریاستیں سزائے موت منسوخ کر چکی ہیں۔ دنیا کے صرف ایک تہائی ممالک میں سزائے موت قانون کا حصہ ہے مگر اس پر عمل کرنے والے ممالک کی تعداد اس سے بھی کم ہے۔ سزائے موت معاشرے کی ذہنی سطح کا پیمانہ بھی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کی زندگی اور بہبود کے بارے میں کتنی حساس ہے۔ سزائے موت ایسے نظام کی نشاندہی کرتی ہے جہاں ریاست طویل مگر موثر طریق کار کی بجائے فوری اور اندھادھند کارروائی میں یقین رکھتی ہے۔ سزائے موت کے خاتمے کا مطلب یہ ہے کہ شہریوں کو من مانی سزائیں دینے کی بجائے جرم کے اسباب سمجھ کر ان پر قابو پانے کی تدبیر کی جائے۔

قانون سازی کی جدید تاریخ میں پاکستان ایک طرفہ مثال ہے۔ دنیا بھر میں سزائے موت ختم کی جا رہی ہے لیکن پاکستان میں پچھلے ۲۵ برس میں ایسے جرائم کی فہرست میں اضافہ ہوا ہے جن میں سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ جہاں معاشرتی ڈھانچہ زمیں بوس ہو رہا ہو، ریاست کی عملداری اور نظام عدل کی کارکردگی پر انگلیاں اٹھائی جا رہی ہوں، وہاں بات بات پر جلاد کی تلوار لہرانا سستی خطابت کا عامیانہ ہتھیار بن جاتا ہے۔

کیا پاکستان میں سزائے موت جیسی مفروضہ فطری سزاؤں سے جرائم پر قابو پانے میں کوئی مدد ملتی ہے؟ گزشتہ برس پاکستانی سینیٹ میں پچھلے عشرے میں اہم جرائم کے اعداد و شمار پیش کیے گئے۔ سرکاری بیان کے مطابق ۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۴ء کے دوران قتل، ڈکیتی، رہزنی اور اغوا کی وارداتوں میں قریب دوگنا اضافہ ہوا۔ ان سب جرائم میں موت کی سزا رکھی گئی ہے۔

موت کی سزاؤں پر عمل درآمد کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بدترین ممالک مثلاً چین، سعودی عرب، ایران اور ویت نام میں نہیں گنا جاتا۔ پاکستان میں ہر سال اوسطاً سزائے موت کے ۱۵ سے ۲۵ فیصلوں پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں ۲۴۱ افراد کو سزائے موت سنائی گئی جبکہ اس عرصے

Scanned with CamScanner

میں ۱۳۱ افراد کی سزا پر عمل درآمد کیا گیا۔

لیکن اس تصویر کا نہایت خوفناک پہلو پاکستانی عدالتوں سے سزائے موت پانے والے ملزموں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ سزائے موت پر متعدد تحقیقی منصوبوں میں شریک پشاور کے قانون داں کامران عارف کے مطابق اس وقت پاکستان میں ۶۰۰۰ کے قریب افراد موت کی کوٹھڑیوں میں بند ہیں۔ یہ تعداد دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہے۔ سزائے موت اور اس پر عمل درآمد میں عدم تناسب بجائے خود پاکستان کے نظامِ عدل پر بہت بڑا تبصرہ ہے۔

سزائے موت سے متعلق مقدمات سننے والی سیشن عدالتوں کی کارکردگی کا اندازہ ان مقدمات کی بڑی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے جن میں ہائی کورٹ سیشن کورٹ کا فیصلہ بدل دیتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پچھلے بیس برس میں نچلی عدالتوں میں ملزمان کے بری ہونے کی شرح بے حد کم رہ گئی ہے۔ لاہور میں انسانی حقوق کے کارکن ارشد محمود ایڈووکیٹ کا کہنا ہے کہ ''نچلی عدالتیں مقدمات نبٹانے کی ذمہ داری سے کتراتی ہیں۔ مزید یہ کہ تحکم پسند معاشرے میں عدلیہ کو بھی سخت گیر ہونے کی شہرت مرغوب ہوتی ہے۔ نچلی عدالتیں سزائیں سنانے کی مشین بن جائیں تو غریب ملزمان خسارے میں رہتے ہیں۔ ہائی کورٹ کی سطح پر مقدمے کے طریق کار پر تو بحث ہوسکتی ہے لیکن مقدمے کے حقائق کو زیرِ بحث نہیں لایا جاسکتا۔''

پولیس کے ناقص طریق تفتیش سے بھی انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ کم تنخواہ، ناکافی تربیت اور غیر معمولی اختیارات سے لیس پاکستانی پولیس محض تشدد اور اذیت رسانی کے ہنر میں مہارت رکھتی ہے۔ زیادہ تر وارداتوں میں واقعاتی شہادتیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ تفتیش کا سارا زور اعتراف جرم پر ہوتا ہے، خواہ اعتراف جرم رضا کارانہ ہو یا زبردستی۔

اس ضمن میں مقصود کالیا کیس کی مثال قابل ذکر ہے۔ ۱۹۸۹ء میں گرفتار ہونے والے مقصود کالیا نے پولیس تشدد سے مجبور ہو کر قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔ سیشن کورٹ نے اسے سزائے موت سنائی لیکن اس دوران دو زیرِ حراست افراد نے اس قتل کا اعتراف کر لیا جس کے الزام میں مقصود کالیا کو سزائے موت سنائی جا چکی تھی۔ لاہور پولیس کے سربراہ میجر مبشر نے ہائی کورٹ میں گواہی دی کہ مقصود کالیا بے قصور تھا۔ تاہم ہائی کورٹ نے مقصود کالیا کی سزائے موت برقرار رکھی۔ مقصود کالیا کو مارچ ۱۹۹۸ء میں

Scanned with CamScanner

ایک ایسے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی جو اُس نے نہیں کیا تھا۔ جسٹس رستم کیانی نے افکارِ پریشاں میں شاید ایسی ہی صورت حال کو عدالت اور کچہری کا فرق قرار دیا تھا۔

پاکستان میں سزائے موت پر بحث دنیا بھر سے کچھ مختلف ہے کہ یہاں قتل کو ریاست کے خلاف جرم کی بجائے شخصی جرم قرار دیا گیا ہے۔ قصاص اور دیت کے قانون ۱۹۹۰ء کے تحت قتل کو قابل تصفیہ جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ دولت مند اور بارسوخ افراد پیسے کے بل پر قتل کے الزام سے بچ نکلتے ہیں۔ ان حالات میں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ سزائے موت پانے والوں میں سے اکثر اتنے غریب ہوتے ہیں کہ اپنے دفاع میں وکیل کی خدمات حاصل کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے مرزا طاہر حسین کے مقدمے کو غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے مختلف عدالتوں میں اختلاف رائے کی نشاندہی کے علاوہ توجہ دلائی ہے کہ اسلامی اصول قانون کے مطابق حد کی سزا کے لیے معتبر عینی گواہ یا اعترافِ جرم کی شرائط پوری نہیں کی گئیں۔

ارکان پارلیمنٹ جان ہیٹل، لارڈ نذیر احمد اور گریگ مل ہالینڈ کی تحریک پر برطانوی حکومت نے گزشتہ ہفتے صدر جنرل پرویز مشرف سے مرزا طاہر حسین کی سزائے موت کو قید میں تبدیل کرنے کی باضابطہ اپیل کی تھی۔ یورپی پارلیمنٹ کے صدر جوزف بورل فونٹیل نے ۱۸ مئی کو صدر مشرف کے نام اپنے مکتوب میں لکھا کہ اس سزا پر عملدرآمد سے پاکستان کی شہرت پر حرف آئے گا کیونکہ یہ مقدمہ غیر معمولی بے رحمی اور گہری ناانصافی کی علامت بن گیا ہے۔ پاکستانی دفترِ خارجہ کی ترجمان کے مطابق برطانوی حکومت کی اپیل پر پاکستان کے قوانین کے مطابق غور کیا جائے گا۔ اس میں قانونی نکتہ یہ ہے کہ قصاص اور دیت قانون کے تحت صدر پاکستان کو مقتول کے ورثا کی اجازت کے بغیر مجرم کی سزا میں کمی کا اختیار ہی نہیں رہا۔

مرزا طاہر حسین کے معاملے میں ایک بات واضح ہے کہ ان کی ممکنہ رہائی بین الاقوامی دباؤ کا نتیجہ ہوگی۔ گویا انصاف کے موجودہ نظام میں پاکستان کے عام شہریوں کو یہ سہولت میسر نہیں آسکتی جو غیر ملکی شہریت یا ۱۸ برس تک عدالتی لڑائی لڑنے کے وسائل نہیں رکھتے۔ ذرائع ابلاغ بھی ہزاروں زیر سماعت مقدمات پر توجہ دینے کا یارا نہیں رکھتے۔

Scanned with CamScanner

قصاص اور دیت کے قانون کی رو سے صدر پاکستان قتل کے سزا یافتہ کو معافی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ غالب امکان یہ ہے کہ اس مقدمے میں بھی ضلع گجرات کا شہرہ آفاق 'مٹی پاؤ' فارمولا بروئے کار لایا جائے گا۔ یہ ماورائے عدالت طریق کار تب استعمال کیا جاتا ہے جب ریاست جدید معاشرتی تقاضوں اور مذہبی قوانین کے تصادم میں باضابطہ حل تلاش کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

۱۹۸۶ء میں توہین رسالت کا قانون نافذ ہونے کے بعد سے شاید ہی کسی ٹرائل کورٹ نے دفعہ ۲۹۵ سی کے کسی ملزم کو بری کیا ہو۔ دوسری طرف اس قسم کے مقدمات میں ہائی کورٹوں نے کسی اپیل کو مسترد نہیں کیا۔ تاہم اس دوران میں مذہبی درجۂ حرارت اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ پاکستان کا کوئی ادارہ بری ہونے والے ملزمان کو جان کا تحفظ فراہم نہیں کر سکتا۔ چنانچہ رحمت مسیح سے لے کر ڈاکٹر یونس شیخ تک ایسے ملزمان کو کسی یورپی سفارت خانے کے تعاون سے چپکے سے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی طرح صائمہ روپڑی کیس (۱۹۹۷ء) سے لے کر ڈاکٹر شازیہ خالد تک ریاست حدود کے مقدمات کی گرہ کھولنے میں ناکام رہے اور ذرائع ابلاغ میں شور و غوغا بڑھ جائے تو ایسی خواتین کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔

غالب امکان یہی ہے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد مرزا طاہر حسین واپس اپنے وطن لوٹ جائیں گے کیونکہ غیر سرکاری ذرائع سے مقتول کے ورثا کو دیت کی رقم قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ خرابی بسیار کے بعد یہ واضح ہو جائے گا کہ مذہبی قوانین جدید ریاست اور معاشرت کے جملہ تقاضوں پر پورے نہیں اترتے۔

پاکستان میں برطانوی ہائی کمیشن ۲۰۰۳ء سے ایک غیر سرکاری ادارے ڈیموکریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ کے تعاون سے سزائے موت کے خلاف مہم چلا رہا ہے۔ اس ادارے کی سربراہ تنویر جہاں قصاص اور دیت کے تحت صدر مملکت کے معافی کے اختیارات میں تخفیف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ مذہب کے نام پر قانون سازی کا نتیجہ یہ ہے کہ عدالتوں میں انصاف کا چشمہ نہیں، قانون کا پرنالہ بہہ رہا ہے۔

۲۴ رمئی ۲۰۰۶ء

Scanned with CamScanner

موسیقی اور رقص قانون کی زد میں

گنٹر گراس کے ناول ٹن ڈرم کا افتتاحی منظر بہت دلچسپ ہے۔ سڑک سے نازی سپاہی عسکری دھنیں بجاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ایک کھڑکی میں کھڑا بچہ اپنا کھلونا ڈرم بجانے لگتا ہے۔ نفرت اور حقارت کا کریہہ شور بچے کی معصوم موسیقی میں ڈوب جاتا ہے۔ انسانیت جنگ پر فتح پاتی ہے۔ افسوس کہ عام زندگی میں موسیقی ہمیشہ ایسی خوش قسمت ثابت نہیں ہوتی۔

پشاور سے خبر آئی ہے — اور ان دنوں پشاور سے اچھی خبر کم ہی آتی ہے — کہ متحدہ مجلس عمل نے نومبر ۲۰۰۵ء میں موسیقی، رقص اور خواتین کی تصویروں کے بارے میں جو دو قانونی مسودے اسمبلی میں پیش کیے تھے، ان کی باضابطہ منظوری سے پہلے ہی انھیں عملی طور پر نافذ کر دیا گیا ہے۔ پشاور اور صوبے کے دوسرے شہروں میں خدائی فوجداری کے آثار واضح نظر آ رہے ہیں اور سڑکوں پر پولیس کے زیر اہتمام وڈیو کیسٹوں اور سی ڈیز کے الاؤ جلائے جا رہے ہیں۔

سڑکوں پر دو رویہ لگے اشتہارات میں نسوانی چہروں پر رنگ ملا جا رہا ہے۔ تجارتی اداروں سے خاتون ملازمین کو نوکری سے فارغ کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور بین الاضلاعی بسوں کو زبردستی نماز کے لیے روکا جا رہا ہے۔ ایک طرف قبائلی علاقوں میں مبینہ شرعی نظام کے لیے طالبان کی مہم زور و شور سے جاری ہے تو دوسری طرف صوبے کے بندوبستی اضلاع میں قدرے مختلف رنگ میں یہی مہم سرکاری سرپرستی میں چلائی جا رہی ہے۔

نشتر آباد (پشاور) سے انسانی حقوق کے کارکن نور الحسن آفندی کا کہنا ہے کہ پولیس اور انتظامیہ کی طرف سے وڈیو دکانوں کو فی کس دو سو سی ڈیز اور کیسٹس جمع کرانے کا پیغام دے دیا جاتا ہے — اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہ سی ڈیز یا کیسٹس فحش ہیں یا نہیں، کارآمد ہیں یا ردی۔ وقت مقررہ پر پولیس حکام کی قیادت میں ہجوم جمع ہوتا ہے، دعا مانگی جاتی ہے اور فحاشی کے مبینہ اسباب کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ دینی مدارس کے طالب علم تجارتی کمپنیوں کے اشتہارات تباہ کر رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

۲۰۰۲ء کے موسم خزاں میں برسر اقتدار آنے کے بعد متحدہ مجلس عمل نے ۲؍ جون ۲۰۰۳ء کو سرحد اسمبلی سے شریعت بل منظور کرایا۔ بعد ازاں حسبہ بل کا مسودہ اسمبلی میں پیش کیا گیا جس کا بنیادی نکتہ سعودی عرب اور طالبان کی طرز پر اخلاقی پولیس کا قیام تھا۔ حسبہ بل کے مضمرات کے پیش نظر وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ میں آئینی درخواست دائر کر دی۔ عدالت عظمیٰ نے حسبہ بل میں مطلوبہ ترامیم ہونے تک گورنر سرحد کو اس پر دستخط کرنے سے روک دیا۔ حسبہ بل میں ناکامی کے بعد صوبائی وزیر قانون ظفر اعظم نے اسمبلی میں دو مسودہ قانون پیش کیے۔ ایک کو 'امتناع رقص و موسیقی بل ۲۰۰۵ء' اور دوسرے کو 'امتناع تصاویر زنان بل ۲۰۰۵ء' کا نام دیا گیا۔ دونوں قوانین میں مبینہ جرائم کو ناقابل ضمانت قرار دیتے ہوئے ۵ سال قید اور ۱۰ ہزار روپے تک جرمانہ تجویز کیا گیا ہے۔

متحدہ مجلس عمل اپنے اقتدار کے چار برسوں میں امن عامہ اور معیار زندگی میں بہتری کے اعتبار سے کوئی ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکی جسے غیر مذہبی نظام حکومت سے مختلف سمجھا جا سکے۔ دنیا بھر میں جمہوریت سے متصادم نظریات کے علم برداروں کو اسی نوعیت کے نمائشی اقدامات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے برصغیر سے موسیقی کا جنازہ نکالنا چاہا تھا۔ نازی جرمنی نے یہودی مصنفین کی کتابوں کے الاؤ جلائے تھے۔ ۱۹۷۹ء کے بعد ایران سے سیکڑوں فنکاروں کو جان بچا کر فرار ہونا پڑا۔ افغان طالبان نے فنون عالیہ کے ان گنت نمونے تباہ کیے۔

۱۹۷۱ء کے خون آشام ایام میں آغا محمد یحییٰ خاں پشاور میں اپنا گھر تعمیر کر رہے تھے جس کے سوئمنگ پول کے قصے کوچہ و بازار تک پہنچ رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں شکست کے بعد غیظ و غضب سے بھرا ہوا ایک احتجاجی جلوس یحییٰ خان کے مکان کی طرف چل پڑا۔ پنجاب کے سابق آئی جی پولیس راؤ عبدالرشید لکھتے ہیں کہ اس موقعے پر ایک مذہبی جماعت کے مقامی رہنماؤں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ایک پرجوش مولوی نے ‌ ‌ سے مخاطب ہو کر کہا: ''بھائیو! قصور یحییٰ خان کا نہیں، شراب کا ہے۔'' سو بھرا ہوا ہجوم یحییٰ خان کو بھول کر شراب کی دکانوں پر ٹوٹ پڑا۔ راؤ رشید کے مطابق اس رات پشاور کے کتے تک نشے میں دُھت تھے۔

عوام کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کے لیے نمائشی اقدامات کی طویل فہرست سے قطع نظر، اس بحث کے تین پہلو ہیں۔ اول: مذہبی سیاست کا تصور بنیادی طور پر عورت دشمن ہے۔ عورتوں کے

Scanned with CamScanner

تحفظ اور احترام کے نام پر مسلط کردہ ضابطے دراصل نصف انسانی آبادی کا دائرۂ کار، صلاحیت اور امکان متعین کرنے کا اختیار سلب کرنے کے مترادف ہیں۔ عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ عورتوں کی نقل و حرکت، تعلیم اور روزگار پر پابندیاں عائد کر کے ان کی تحقیقی، تخلیقی اور پیداواری صلاحیتوں سے انکار کیا جاتا ہے اور انھیں اجتماعی فیصلہ سازی میں موثر آواز سے محروم رکھا جاتا ہے۔

جدید معاشرہ جسمانی فرق کو انسانی عقل اور صلاحیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا؛ دوسری طرف روایتی فکر عورت اور مرد میں لکیر کھینچتے ہوئے انسانی جسم کے احترام سے انکار کرتی ہے۔ اگر انسان اپنے جسم کا احترام کھو کر جسمانی خصوصیات پر فخر یا شرمندگی جیسے احساسات کا شکار ہو جائیں تو وہ معاشرے کی سیاسی اور سماجی فیصلہ سازی میں موثر آواز اٹھانے کے اہل نہیں رہتے۔

عورتوں پر مردانہ بالادستی کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ گھر کی چار دیواری میں مرد ایک مطلق العنان سربراہ کے طور پر بیوی بچوں سے بے چون و چرا اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ گھریلو زندگی میں تسلیم و رضا کی اس تربیت سے حکومت کے لیے معاشرے کو مطلق العنان اطاعت کے ڈھب پر لانا آسان ہو جاتا ہے۔

علی عباس جلالپوری کہتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں جہاں مذہبی پیشواؤں نے سیاسی اختیار حاصل کیا، وہاں عصمت فروشی اور بردہ فروشی کو فروغ ہوا۔ اس میں ایک نازک سی نفسیاتی علت کارفرما ہے۔ ذہنی رفاقت سے بیگانگی کا رجحان جنسی نارسائی کے احساس پر ختم ہوتا ہے؛ چنانچہ تحکم پسند ذہن اس ناکامی کی تلافی تشدد اور تحکمانہ اختیار میں تلاش کرتا ہے۔

جدید فکری روایت میں عورت اور مرد کا رشتہ ایک دوسرے پر اختیار کا نہیں، دو مکمل اور مساوی اکائیوں کی سانجھ کا نام ہے۔ ایسی رفاقت رتیے، حقوق اور اختیار کی مساوات کے بغیر ممکن نہیں۔ بنیاد پرست ذہن کا المیہ یہ ہے کہ وہ کلی اختیار اور مطلق حاکمیت کے خبط کا اسیر ہے۔ چنانچہ ثقافت ہو یا معیشت، مذہبی سیاست کی تان عورتوں پر جا کے ٹوٹتی ہے۔

دوم: پاکستان کی معروف سیاسی جماعتوں نے سستی مقبولیت کے شوق میں پاکستانی معاشرت سے کھلواڑ کیا ہے۔ مذہبی نعروں سے تو ذوالفقار علی بھٹو بھی دامن نہیں بچا سکے تھے۔ مسلم لیگ نواز کی پہلی حکومت نے ۱۹۹۱ء میں شریعت بل منظور کیا۔ اگست ۱۹۹۸ء میں پندرھویں آئینی ترمیم کو بھی شریعت بل

Scanned with CamScanner

ہی کا نام دیا گیا تھا۔ مالاکنڈ میں قاضی عدالتوں کا متوازی نظام قائم ہوا تو موجودہ وزیرداخلہ آفتاب شیر پاؤ پیپلز پارٹی کی حکومت کے وزیر اعلیٰ تھے۔

سوم: پاکستان میں ثقافت کا سوال خاصا الجھا ہوا ہے۔ پاکستان کی ثقافت کی جڑیں دھرتی میں رکھی جائیں یا اکثریتی عقائد میں؟ ہزاروں برس کی مشترکہ تاریخ کے نشان ٹیکسلا، ہڑپا اور موہنجوداڑو کی صورت جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ غالب اور اقبال کی ادبی روایت سے حافظ، خیام، میرابائی اور تلسی داس کے باہم گتھے ہوئے دھاگوں کو کس طرح الگ کیا جائے؟ استاد فیاض خاں اور بڑے غلام علی خاں کو پاکستان کا حصہ گنا جائے یا بھارت کے سپرد کر دیا جائے؟ پاکستانی موسیقی کو ہندوستانی موسیقی سے ممیّز کرنے کی مصنوعی کوششوں کا انجام وہی ہو سکتا ہے جو احمد بشیر نے ذوالفقار بخاری کو تجویز کیا تھا کہ بھیروں کی بندش 'موری بیاں نہ مروڑو کرشن مراری' کو 'موری بیاں نہ مروڑو میاں عبدالباری' کر دیا جائے۔

صنعتی پیداوار اور تجارتی ڈھانچے کی عدم موجودگی میں پاکستان میں اُبھرنے والے درمیانہ طبقے کی بڑی تعداد خوش حالی کے لیے خلیجی ممالک کی مرہونِ منت ہے۔ یہ متوسط طبقہ فنونِ لطیفہ سے تہذیبی لگاؤ رکھنے والی اشرافیہ سے بہت مختلف ہے۔ اس میں دولت کو خلیجی طرز کے بے آب و گیاہ معاشرتی نمونے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

دوسری طرف پاکستانی عوام کی بڑی تعداد نے اِس ربع صدی میں سخت گیر مذہبیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کو وی سی آر اور کیبل کے ذریعے رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتفاق سے تفریح کے اِن ذرائع کا معتدبہ حصہ بھارت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان سے تصادم پاکستان کے مذہبی اور عسکری حلقوں کا مشترکہ نکتہ ہے۔ پاکستان کی سیاسی طاقتیں بھارت سے تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کریں تو اسے پاکستانی فوج کو کمزور کرنے کی بالواسطہ کوشش سمجھا جاتا ہے۔

موجودہ پاکستانی حکومت کی روشن خیالی کا المیہ اِسی الجھی ہوئی تصویر سے برآمد ہوتا ہے۔ ثقافتی رجحانات کو نشو و نما کا پورا موقع دینے سے فوج کی بالادستی اور مذہبی تحکم پسندی کا پورا ڈھانچہ زمین بوس ہو جاتا ہے، دوسری طرف عالمی صورتِ حال اور قومی معیشت اجازت نہیں دیتے کہ دنیا کو جہاد اور دہشت گردی میں فرق کرنے کا درس جاری رکھا جائے۔ اسے مخمصے کا شکار ہونے والے جنرل کی کلاسیک مثال

Scanned with CamScanner

سمجھنا چاہیے جو بین بین راستہ اختیار کرتا ہے۔ ثقافت اور ثقافت دشمنی میں انتخاب نہ کر پانے کا نتیجہ بھی یہی ہوگا کہ چارسدہ میں رباب کے تار سُر نہیں ہو پائیں گے، پشاور کے ڈبگری بازار میں جسم فروشی پھیل جائے گی، گوجرانوالہ کے تھیٹر ویران رہیں گے اور ثقافت فحاشی کے استعارے میں بدل جائے گی۔

۲۱ر جون ۲۰۰۶ء

❋

ابرِ بہار چل دیا...

۱۹۵۳ء کا موسم گرما تھا۔ راولپنڈی سازش کیس کے اسیر فیض احمد فیض کی کتاب دستِ صبا چھپ کر آئی۔ حبس کے اس موسم میں لاہور کے زندہ دلوں نے آگے بڑھ کر دستِ صبا تھام لیا۔ لاہور میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ ان گنت ادیبوں اور سیاسی کارکنوں سے بجی اس محفل کا حاصل احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر رہا:

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

احمد ندیم قاسمی کی طویل تخلیقی زندگی اسی بے ساختہ پن کے بیش و کم سے عبارت تھی۔

نوے برس پہلے ہندوستان میں پنجاب کو ایک دور افتادہ، نیم مہذب خطہ سمجھا جاتا تھا جہاں شمال وسطی ہند سے محمد حسین آزاد اور تاجور نجیب آبادی یوں وارد ہوتے تھے جیسے الطاف گوہر کے لفظوں میں لندن پہ مرغابیاں اور مولوی اترتے ہیں، جہاں سر فضل حسین مسلمانوں کی تعلیم کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ وادی سون سکیسر کے موضع انگہ کا کیا ذکر، خوشاب کا قصبہ بھی کہیں سرگودھا کے مفصلات میں گنا جاتا تھا۔

اونچے نیچے پہاڑی ٹیلوں کی زمین میں فوجی بھرتی کا خام مال پیدا ہوتا تھا یا بارانی قطعوں میں ہل جوتنے والے گبھرو کسان۔ سیاسی اقتدار کا منبع گھوڑی پال دیہہ خداؤں کے پاس تھا اور علم کا

Scanned with CamScanner

سرچشمہ درگاہوں کے سجادہ نشین تھے۔ موضع انگہ کے ایک ایسے ہی مذہبی خانوادے میں ۲۰ رنومبر ۱۹۱۶ء کو پیرزادہ احمد شاہ قاسمی پیدا ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کی لام بندی ہوا میں سسک رہی تھی۔ چار برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پہاڑی راستے پتھریلے ہوتے ہیں، سایہ نہ ہو تو اور کٹھن ہو جاتے ہیں۔

پنجاب کے دوسرے سرے پر ریاست بہاولپور کے صادق ایجرٹن کالج میں مشائخ کے صاحبزادوں کے لیے ایک نشست موجود تھی۔ پیرزادہ احمد شاہ قاسمی نے ۱۹۳۵ء میں یہاں سے گریجویشن کی۔ یہ کساد بازاری کے برس تھے۔ گورنمنٹ کالج سے ایم اے کرنے والا ن م راشد ۴۲ روپے پر کلرکی کر رہا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی لاہور کے ڈاکخانے میں مہریں لگا رہا تھا۔ پیرزادہ قاسمی کو محکمۂ آبکاری میں ۲۵ روپے کی کلرکی میسر آئی۔ شعر کی دہلیز پہ دستک دیتے نازک مزاج احمد ندیم کو جعلی شراب کی خانہ ساز بھٹیوں پر چھاپے مارنا پسند نہیں آیا۔

ادھر انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے نقارے پر چوٹ لگ چکی تھی۔ علی گڑھ سے افتاں و خیزاں رخصت ہونے والے منٹو کا طوطی بھی دلی میں رک رک کے بولنے لگا تھا۔ دونوں میں کچھ خط و کتابت ہوئی اور احمد ندیم قاسمی منٹو کے پاس دلی پہنچ گئے۔ علم اور فنی مہارت میں دونوں کھانڈے کی چوٹ، مگر ایک حکیم فرزانہ تو دوسرا درکوچہ ہا رسوا شدیم۔ ایک اقبال کا عاشق اور دوسرا غالب پر لہلوٹ۔ ایک کا لباس مجازِ بے شکن اور دوسرے کے بھیتر رواں رواں پریشان تھا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۹ء تک کی یہ خط و کتابت مکتبۂ نقوش سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ آج بھی اسے پڑھیے تو رنگِ گل اور بوئے گل دونوں کے ہوا ہونے کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنے طویل فنی اور تخلیقی سفر میں شاید ہی کسی کا دل دُکھایا ہو لیکن عبدالمجید سالک اور منٹو کے لیے تو وہ خصوصیت سے سراپا نیاز رہے۔ ایک نے شاعری اور صحافت میں ان کی انگلی تھامی اور دوسرے نے افسانے کی راہیں دکھائیں۔ مطبوعہ حرف میں احتیاط اور رسم و راہ میں حفظِ مراتب احمد ندیم قاسمی نے مولانا صلاح الدین احمد سے سیکھا اور اس کی داد انھیں راشد جیسے طناز اور ساقی فاروقی جیسے بگڑے دل سے بھی ملی۔

قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے اور اس دھج سے کہ ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند

Scanned with CamScanner

مصنفین پاکستان کے سیکرٹری جنرل چنے گئے۔ اقبال پر ایک دو تیز مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں کے پبلک سیفٹی ایکٹ سے مونڈے گئے۔ ایوب خانی جبروت میں بھی جیل کی ہوا کھائی۔

قاسمی صاحب نے استعمار دشمنی کا درس مولانا غلام مرشد سے لیا تھا جو یوں تو بادشاہی مسجد کے خطیب تھے لیکن زرعی اصلاحات کی تائید میں ان کی آواز مولانا غلام رسول مہر سے بھی پہلے بلند ہوئی تھی۔ قومی آزادی کی تحریکیں چالیس برس ہوئے انجام کو پہنچیں۔ قاسمی صاحب نے یورپ دشمنی کا سبق بھلا کے نہیں دیا۔ کہیں کہیں تو یوں لگا کہ انھوں نے اس تلخی میں مقامی چیرہ دستیوں سے بھی چشم پوشی کر لی۔ قومی ریاست سے وفاداری بشرطِ استواری قاسمی صاحب کی شرطِ ایمان ٹھہری۔ گو یوں دیکھیے تو یہ کوئی بالذات خامی تو نہیں، خوبی ہی ہے۔ جوانی کی شیفتگی پر غالب آنا اور نئی زمینی حقیقتوں کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔

افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے پریم چند سے فیض اٹھایا۔ قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کے کھیتوں میں پھولتی سرسوں ہی نظر نہیں آتی، مکئی کی روٹی پر دھرے مکھن کی خوشبو بھی آتی ہے۔ تقسیم ہند پر قاسمی صاحب کے افسانوں پر انتظار حسین نے ایسا بلیغ تبصرہ کیا جو انھی کا حصہ ہے: ''قاسمی کے افسانوں میں فضا یہ ہے کہ محلے میں کوئی واردات ہوگئی ہے اور قاسمی صاحب گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں۔'' ندیم صاحب نے شہری زندگی پر بھی قلم اٹھایا لیکن اُن تحریروں میں حکایتِ دروں کی بجائے اکتساب کی سی کیفیت ہے، جیسے کوئی بارلیش دیندار فلمی دنیا پر تبصرہ لکھے۔

قاسمی صاحب نے غزل لکھی۔ غزل وارفتگی کے جس درجے کا تقاضا کرتی ہے وہ قاسمی صاحب کے شخصی خاکے کا حصہ نہیں تھا۔ مگر یہ ہے کہ ثقاہت کی یبوست کے علی الرغم احمد ندیم قاسمی نے غزل میں جو پیکر تراشے وہ اردو ادب کی تاریخ میں انھی کے ہو رہے۔ ایک بھلے مانس کا عشق ہے؛ دل میں اٹھتی لہر افق کے پار بھی پہنچتی ہے اور کسی کے لہجے کی تھکن بھی یاد رہتی ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں احمد ندیم قاسمی نے فنون کا آغاز کیا۔ انھی دنوں ادبی دنیا کے ارتحال کے بعد وزیر آغا نے اوراق شروع کیا۔ اب فنون اور اوراق دونوں نصف صدی کا قصہ ہیں۔ وزیر آغا چھوٹے ہیں نہ قاسمی صاحب گھٹ کے تھے۔ دونوں کے قلم اور زبان سے

Scanned with CamScanner

ایک دوسرے کے لیے کوئی ناشائستہ لفظ سرزد نہیں ہوا۔ مگر رسالے کی صفوں میں پیادے بھی تو آن گھستے ہیں۔ چائے کی پیالی میں اس طوفان سے احمد ندیم قاسمی کے قد میں اضافہ نہیں ہوا۔

قاسمی صاحب نے پچاس کی دہائی میں کہیں ذہنی طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ ان کی انسان دوستی مسلم رہی اور معروف معنوں میں وہ کبھی رجعت پسند بھی نہیں رہے۔ یوں دیکھیے کہ اگر قاسمی صاحب کو ترقی پسند احباب کی یک رُخی خوش نہیں آئی تو انھیں غلام عباس جیسے صاحبِ ہنر پر زبانِ دشنام دراز کرنے والے بے تہہ نمونے کیونکر راس آتے۔ احمد ندیم قاسمی قسطنطیہ اور اندلس کی فرضی داستانیں نہیں لکھتے تھے۔ عشروں کی ریاضت کا حاصل ایک مقام تعزز تھا، سو وہ اس پر رونق افروز ہو گئے۔ جہانِ ادب میں یہ گوشہ کبھی بھی بہت روشن نہیں رہا۔ یہاں اگر کچھ چاندنی چھٹکی تو وہ احمد ندیم قاسمی ہی کے دم سے تھی۔ مختار صدیقی، اختر حسین جعفری اور شکیب جلالی جیسے خورشید ستاروں سے قطع نظر یہ ادب کے اہلِ حرفہ کا ہجوم تھا۔ اب یہاں روشنی نہیں ہوگی۔

کوئی تیس برس ہوئے، پاکستان میں عرضِ اظہار کے لیے میسر ادب کی بساط ہی لپٹ گئی۔ احمد ندیم قاسمی کو عمرِ رواں کی آخری ربع صدی میں صحبتِ سخن شناس میسر نہیں رہی۔ بگٹٹ دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑتی گرد میں پنج دریا کے کالم بھی چھپ گئے، ان کا افسانہ دھندلا گیا اور غزل کجلا گئی۔

احمد ندیم قاسمی اب وہاں ہیں جہاں مولانا حامد علی خاں، صلاح الدین احمد اور عبدالمجید سالک کی شفقت بے پایاں ہے، منٹو اور فیض جام بدست ہیں، چراغ حسن حسرت کی آنکھ میں چمک ہے، ایم ڈی تاثیر کے فقرے میں کاٹ ہے۔ احمد ندیم قاسمی اب کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں نہیں ہیں؛ آج ایک اور دنیا میں اُن کی رونمائی ہے۔ تھوڑی گرد چھٹ لے، ان کا افسانہ بھی چمکے گا، ان کی غزل کی رسائی بھی ہوگی۔ ان کا بے ساختہ پن اردو ادب کے قاری پہ قرض ہے۔ خلق خدا جلد یا بدیر یہ قرض لوٹا دے گی۔

۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء

⁂

این جی اوز نے کیا بگاڑا ہے؟

صوبۂ سرحد کے علاقوں ایبٹ آباد اور مانسہرہ کے بعد اب پاکستان کے زیرِ انتظام کشمیر میں بھی غیر ملکی امدادی تنظیموں کے خلاف مذہبی جماعتوں اور جہادی گروہوں کی مہم شروع ہونے کی اطلاعات آ رہی ہیں۔ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ ادارے تمام مقامی خواتین کو ملازمتوں سے فارغ کر دیں ورنہ انھیں علاقہ بدر کر دیا جائے گا۔ ان امدادی تنظیموں پر 'بے حیائی' پھیلانے نیز اخلاقی اقدار اور مقامی سماجی روایات کو پامال کرنے کے الزامات بھی عائد کیے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کو قریب ایک برس گزر چکا ہے۔ توقعات کے عین مطابق ابتدائی ہفتوں کے جذباتی ردعمل کے بعد سے حکومتی کارکردگی معمول کی سطح اختیار کر چکی ہے۔ صدر پرویز مشرف گزشتہ چھ مہینوں میں متعدد مرتبہ قوم سے مخاطب ہوئے مگر انھوں نے ایک دفعہ بھی زلزلہ متاثرین کی بحالی کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ زلزلے کے بعد پیش کیے جانے والے پہلے بجٹ میں بھی زلزلہ زدگان کے لیے کسی اہم اقدام کا اعلان نہیں کیا گیا۔

دوسرے لفظوں میں ۸۰ ہزار افراد کی ہلاکت، لاکھوں زخمیوں اور بے گھر ہونے والوں کی ناقابلِ تصور تباہی کو کسی معمولی واقعے کی طرح فراموش کر دیا گیا ہے۔ البتہ دنیا بھر سے زلزلہ زدگان کی مدد کے لیے پہنچنے والے سیکڑوں کارکن ابھی تک ان علاقوں میں موجود ہیں۔ مختلف ممالک اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے ان رضا کاروں نے انسانی ہمدردی کی بنیادی پر زلزلے کے ہاتھوں برباد ہونے والوں کی مثالی خدمت کی ہے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں زندگی تیزی سے پرانی ڈگر پہ لوٹ رہی ہے۔ گزشتہ دنوں بٹاگرام سے انسانی حقوق کے معروف کارکن صابر شمیم نے دو تراشے بھجوائے۔ ان میں سے ایک اخباری اشتہار تھا اور ایک اخباری خبر۔ کسی مہذب ملک کے ذرائع ابلاغ میں ایسی بے سروپا تحریریں اشتعال انگیزی اور ہتکِ عزت کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ اشتہار 'تحریکِ اصلاحِ معاشرہ' کی طرف سے جاری کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ دلچسپ ہے کہ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۹ء تک جب سیاسی حکومتوں کو

گرانا یا کمزور کرنا مقصود ہوتا تھا تو اخبارات میں اشتہاری مہم 'تحریکِ اصلاحِ معاشرہ' ہی کے نام سے چلائی جاتی تھی۔ مسلم لیگ (نواز) اور پیپلز پارٹی ایک سے زیادہ مرتبہ اس 'تحریک' کی اصلاح سے مستفید ہو چکی ہیں۔

دنیا بھر میں حکومتیں پاکستان جانے والے شہریوں کے لیے ہدایات جاری کرتی ہیں جن میں لباس اور معاشرتی معمولات پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ مغربی شہری خود اپنے تحفظ کے نقطۂ نظر سے ان ہدایات کی پابندی کرتے ہیں۔ خواتین شلوار قمیص پہنتی ہیں بلکہ کچھ کو تو دوپٹہ اوڑھے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ امدادی کارکنوں نے شلوار قمیص کی بجائے پتلون اور شرٹ کو ترجیح دی ہو کیونکہ بھاگ دوڑ کے کاموں کے لیے اس لباس میں عملی سہولت رہتی ہے۔

تاہم مذہبی رہنماؤں کو اصل اعتراض لباس کی تفصیلات پر نہیں ہے۔ محمد حسن عسکری نے ساقی میں لکھا تھا کہ فحاشی تو ''وہ آئی، وہ گئی'' میں سے بھی نکالی جاسکتی ہے۔ جن لوگوں کی نظر میں عورت کا وجود ہی فحاشی کے مترادف ہو، وہ بے بنیاد الزامات کا انبار لگانے سے نہیں گھبراتے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ پاکستانی معاشرے میں غیرت وغیرہ جیسے طعنوں سے اشتعال پھیلانا نہایت آسان ہے۔ شاید کچھ افراد کو پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی میں وہ بحث یاد ہو جو ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی 'تصنیف' پردہ میں سکول جانے والی بچیوں کی کردار کشی کے ضمن میں ہوئی تھی۔ لیاقت علی خاں نے ان الزامات کا مسکت جواب دیا تھا مگر وہ کتاب آج بھی قابلِ اعتراض حصوں سمیت شائع ہوتی ہے۔

اصل مقصد عوام کے جذبات سے کھیلنا، مقامی سطح پر اپنی حیثیت مضبوط کرنا، ریاستی اداروں کو بے وقعت کرنا اور معاشرے کو یرغمالی بنانا ہے۔ مالاکنڈ اور دیر کی طرح مانسہرہ بھی جہادی گروہوں کے لیے بھرتی کا اہم مرکز سمجھا جاتا ہے۔ پیوستہ مفادات کے حامل حلقوں کو یہ خدشہ ہو سکتا ہے کہ ان پسماندہ علاقوں کے عوام میں برسوں کی محنت سے مغرب دشمنی کے جو جذبات پیدا کیے گئے ہیں یورپ سے تعلق رکھنے والے امدادی کارکنوں کی بے لوث خدمت کے نتیجے میں ان جذبات کا گراف کہیں نیچے نہ آجائے۔

مقامی روایات کی دلیل جس قدر نازک ہے اسی قدر پیچیدہ بھی ہے۔ کیا معاشرے کے تمام طبقات میں اخلاقی اقدار پر مکمل اتفاق رائے پیدا ہونا ممکن ہے؟ ابھی تک تو طالبان نما ضابطے نافذ

Scanned with CamScanner

کرنے کی مہم ملک کے دور دراز حصوں تک محدود ہے۔ جلد یا بدیر یہ لہر اسلام آباد، لاہور اور کراچی جیسے شہروں تک بھی پہنچے گی جہاں رہن سہن، لباس اور معاشرتی اقدار میں بے پناہ تنوع پایا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں معاشرتی خلفشار کی جو صورتیں پیدا ہوں گی، ابھی ان کا ادراک بھی مشکل ہے۔

علاقہ بدر کرنے کی غیر انسانی اور پسماندہ روایت اب تک قبائلی علاقوں میں رائج تھی لیکن اب یہ رجحان واضح طور پر بندوبستی اضلاع تک پھیل رہا ہے۔ مذکورہ مہم میں این جی اوز میں کام کرنے والے پاکستانی مردوں اور خواتین کو ضلع بدر کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں کسی ملکی قانون کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

گزشتہ بیس برس میں پاکستان کے مذہبی عناصر اور نادیدہ قوتوں میں این جی اوز کی مخالفت پر اتفاق رہا ہے، بلکہ سیاسی حکومتیں بھی غریب کی جورو سمجھ کر سول سوسائٹی کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت میں این جی اوز پر گولہ باری کی ذمہ داری ڈاکٹر شیر افگن کے سپرد تھی۔ مسلم لیگ حکومت میں یہ منصب گجرات کے مرحوم پیر بنیامین رضوی کو حاصل تھا۔

اخباری اطلاعات کے مطابق این جی اوز کے کارکنوں کو گاڑیوں سمیت نذر آتش کرنے کی دھمکی تک دی گئی ہے۔ ان دھمکیوں کے پیش نظر ضلعی انتظامیہ اور صوبائی حکومت کا ردعمل دلچسپ ہے۔ ایبٹ آباد میں ضلعی انتظامیہ نے اشتعال پھیلانے والے عناصر کو قابو میں کرنے کی بجائے امدادی اداروں پر پابندیاں لگانے کی کوشش کی ہے۔ صوبائی حکومت نے ایک کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس میں مذہبی رہنماؤں، فوجی افسروں اور امدادی اداروں کے کارکنوں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کمیٹی امدادی کارکنوں کے لیے لباس کے قواعد وضوابط طے کرے گی۔ اُمید کرنی چاہیے کہ کمیٹی کی سفارشات میں عورتوں کے لیے طالبان والا شٹل کاک برقع تجویز نہیں کیا جائے گا، ورنہ جگ ہنسائی کی نئی صورتیں پیدا ہوں گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی حکومت روشن خیالی کے دعووں کے باوجود درحقیقت سیاسی اور معاشرتی ڈھانچوں سے کھلواڑ کرنے والے عناصر کے ہاتھ میں یرغمالی ہے۔

پاکستان میں زمینی صورت حال بدلے یا نہ بدلے، بہر صورت حکومت کو دنیا میں پاکستان کا نرم تاثر پیدا کرنے کی خاصی فکر ہے۔ غالب امکان ہے کہ اعتدال پسند تاثر پیدا کرنے کی ان سرکاری کوششوں کو تب بڑی تقویت ملے گی جب کٹھن حالات میں انسانی ہمدردی کے نام پر پاکستانی شہریوں

کی مدد کرنے والے کارکن اپنے ملکوں میں واپس پہنچ کر سرکاری اور معاشرتی سطح پر احسان مندی اور شکر گذاری کی داستانیں بیان کریں گے۔

۲۵ راگست ۲۰۰۶ء

❋

بگٹی ہلاکت—آفاتِ ناگہانی کا اشارہ

نواب اکبر بگٹی کی موت شاید پاکستان کی مرکزی حکومت اور بلوچ قوم پرستوں میں برسوں سے جاری سرد گرم کشیدگی میں شدید ترین بحران کا پیش خیمہ ہے۔ اس واقعے کے ذمہ دار افراد نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر تنازعے کو ایسا موڑ دے دیا ہے جہاں سے بلوچستان کے حالات کا معمول پر لوٹ آنا ناممکن نہیں تو ازحد دشوار ضرور ہو گیا ہے۔

نواب اکبر بگٹی روایتی قبائلی سردار تھے۔ ان کے کردار کے بہت سے پہلو متنازع تھے لیکن سردار اکبر بگٹی گزشتہ بیس برس میں بلوچستان کی شناخت کا استعارہ بن گئے تھے۔ یہ درجہ کسی عہدے کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ کسی منطقی دلیل کا نتیجہ بھی نہیں ہوتا۔ اسے زمینی حقائق سے بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق تاریخی تناظر اور معاشرتی مکالمے کے ارتقا سے ہوتا ہے۔ سیاست محض اعداد و شمار کا کھیل نہیں۔ سیاسی عمل میں حقائق اور واقعات کی اہمیت اپنی جگہ مگر اجتماعی نفسیات میں مقبولِ عام تاثر کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان میں کم ہی لوگوں کو یاد ہو گا کہ مشرقی پاکستان ۱۶ ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو نہیں بلکہ ۵ ر دسمبر ۱۹۶۳ء ہی کو الگ ہو گیا تھا جب پاکستان کے سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی بیروت کے ہوٹل میں پُر اسرار حالت میں مردہ پائے گئے تھے۔

حکومت کا یہ دعویٰ حالات و واقعات کی روشنی میں نہایت بودا ہے کہ کوہلو کی پہاڑیوں میں ہونے والی جھڑپ فوجی ہیلی کاپٹروں پر فائرنگ سے شروع ہوئی۔ تین روز قبل کوئٹہ میں اکبر بگٹی کے

Scanned with CamScanner

روایتی حریف کلپر سرداروں کے اجتماع میں اکبر بگٹی کو غدار قرار دیا گیا۔ کثیر الاشاعت اخبارات میں اس اجتماع پر اداریے لکھے گئے۔ سرداری نظام کے خاتمے کا نقارہ بجایا گیا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ جرگہ بذاتِ خود سرداری نظام کی علامت ہے۔ سرکاری سطح پر جرگے کی سرپرستی ریاستی عملداری سے دستبرداری کے مترادف ہے۔ حکومتی حلقوں نے اس جرگے پر داد و تحسین کے ڈونگرے تو برسائے مگر یہ نہیں بتایا کہ پاکستان کے آئین و قوانین میں کون سا حصہ سرداری نظام سے متعلق ہے۔

بلوچستان اسمبلی کی موجودگی میں اس نام نہاد جرگے کے اعلانات کی کیا حیثیت ہے؟ اگر ایسے بے سر پیر کے اعلانات سے سرداری نظام ختم ہو سکتا تو ایسا ہی ایک اعلان ۱۹۷۶ء میں سینڈک کے مقام پر جلسۂ عام میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے بھی کیا تھا۔ سرداری نظام اور شرعی نظام ایسے طلسمی کبوتر ہیں جنھیں مداری کی پٹاری سے کہیں بھی برآمد کیا جا سکتا ہے۔

اس معاملے کی نزاکت پاکستان کی قومی سیاسی جماعتوں اور مرکزی قیادت سے دانشمندی اور حساس رویے کی متقاضی ہے۔ وفاقی وزیرِ مملکت برائے اطلاعات نے اکبر بگٹی کی موت کی تصدیق کرتے ہوئے انھیں دہشت گرد قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ واقعے کے فوری بعد ایسا کہنا حکومت کی مجبوری تھی مگر جہاں قانون ساز اداروں میں دنیا بھر کے قانون شکن افراد کے لیے دعائے مغفرت کی تحریکیں پیش کی جاتی ہیں وہاں ملک کے حساس ترین صوبے سے تعلق رکھنے والے اور اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہنے والے سیاسی رہنما کے لیے دہشت گرد کے لقب سے قومی یکجہتی کو فروغ نہیں ملا۔

مستعد فضائیہ اور سیٹلائٹ تصاویر کی صلاحیت رکھنے والی پاکستانی فوج کے بارے میں کون تسلیم کرے گا کہ اسے بلوچستان کے چپے چپے پر فوجی چوکیوں کے باوجود تین روز قبل ہی اکبر بگٹی کے ٹھکانے کا علم ہوا تھا۔ خبروں کے مطابق یہ جھڑپیں ۲۴ راگست سے شروع ہو کر ۲۶ راگست تک جاری رہیں۔ یہ باور کرنا نہایت مشکل ہے کہ اس دوران میں فوج کو اس پناہ گاہ میں نواب اکبر بگٹی کی موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔

متحدہ مجلسِ عمل جو صومالیہ سے لے وینزویلا تک ہر اہم اور غیر اہم معاملے پر قوم کی سماعت کا امتحان لیتی رہی ہے، اس اہم واقعے کی خبر کے بارہ گھنٹے بعد بھی منقار زیرِ پر تھی۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو اس واقعے پر ذاتی طور پر ردِعمل ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ ان کے ردِعمل میں تاخیر عواقب سے خالی

Scanned with CamScanner

نہیں۔ چوہدری شجاعت حسین کا بیان حسبِ توقع ڈیرہ دار مصلحت پسندی کا نمونہ رہا۔

آج بلوچستان میں بلوچوں کے دل اسی طرح جل اٹھے ہیں جس طرح ۴؍اپریل ۱۹۷۹ء کو ہر سندھی کی آنکھ میں چنگاری سلگ اٹھی تھی۔ تب پنجاب اور دوسرے صوبے اس سانحے میں سندھیوں کے ساتھ شریک تھے۔ ۲۰۰۶ء کا المیہ یہ ہے کہ پنجاب اور دوسرے صوبوں میں بسنے والے پاکستانیوں کو بلوچ دکھ کا پورا اِدراک نہیں ہے۔ سیاسی معاملات کا شعور پیدا کرنے کے مکلّف قومی ذرائع ابلاغ جہادی کہہ مکرنیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

موجودہ سیاسی صورت حال میں غالب امکان یہی ہے کہ بلوچوں میں بیگانگی کا احساس مزید بڑھے گا اور شاید اس واقعے سے جنوبی بلوچستان میں جاری کشیدگی کا درجۂ حرارت کم ہونے کی بجائے خطرے کا نشان پار کر جائے۔

مشرقی پاکستان کے قوم پرست رہنما شیخ مجیب الرحمٰن مارچ ۱۹۷۱ء سے لے کر جنوری ۱۹۷۲ء تک مغربی پاکستان میں قید رہے لیکن انھیں گزند نہیں پہنچایا گیا۔ پرویز مشرف کمانڈو وردی پہننا پسند کرتے ہیں۔ فوجی سالار کے لیے اعصابی جبلت پر مبنی فوری ردِعمل خوبی سمجھا جاتا ہے۔ سیاست ٹھنڈے دل و دماغ کا اثاثہ مانگتی ہے۔ ایک سے زیادہ اہم مواقع پر جنرل صاحب کا ردعمل ایسا رہا ہے جو درجن بھر کور کمانڈروں کے اجلاس کے لیے تو شاید موزوں ہو مگر ۱۶ کروڑ عوام پر مشتمل ایسے وفاق کے لیے سود مند نہیں جس کی اکائیاں رقبے، آبادی، وسائل، جغرافیائی حقائق اور معاشرتی خدوخال کے اعتبار سے نہایت نازک توازن کی حامل ہیں۔

اگلے مورچوں پر لڑنے والے کمانڈر میں پہل کاری کی جو صلاحیت خوبی سمجھی جاتی ہے سیاست میں اس کے دوررس اور غیر متوقع نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ صدیق سالک نے ۲۵؍مارچ ۱۹۷۱ء کی فوجی کارروائی کے ایک روز بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا کہ پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ان عمارتوں کو فتح تو کر لیا گیا مگر ان کے ملبے سے اٹھنے والا بنگالی قوم پرستی کا نظریہ مسخر نہ کیا جا سکا۔ شاید یہ کام بندوقوں اور گولیوں سے کیا بھی نہیں جا سکتا۔

سردار اکبر بگٹی قومی رہنما تھے۔ وہ بلوچستان کے ان عمائدین میں شامل تھے جنھوں نے بنفسِ نفیس قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت کو تسلیم کرتے ہوئے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا تھا۔ وہ

Scanned with CamScanner

بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اور گورنر رہے تھے۔ ۸۰ سالہ اکبر بگٹی بلوچ قوم پرستی کا استعارہ بن چکے تھے۔ ممتاز دولتانہ اور غوث بخش بزنجو کے بعد کتاب دوستی کے حوالے سے پاکستانی سیاستدانوں میں نایاب جنس کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا ذاتی کردار بے داغ نہیں تھا۔ ان کا سیاسی ریکارڈ بھی قابل رشک نہیں تھا۔ ان کے بہت سے شخصی رویے جدید انسانی قدروں سے لگا نہیں کھاتے تھے، لیکن سیاست فرشتوں کا کھیل نہیں، ممکن کی جستجو اور پل باندھنے کی سعی کا نام ہے۔ نواب اکبر بگٹی کی پناہ گاہ پر گولہ باری سے جو سیکڑوں من وزنی پتھر لڑھکے ہیں ان کے بوجھ تلے بہت سے موجود اور ممکنہ پل شوریدہ پانیوں کی نذر ہو گئے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی دبنگ شخصیت تھے۔ کھلے میدان میں کھڑے ہو کر لڑنا پسند کرتے تھے۔ ان میں طنطنہ بھی تھا اور برجستہ فقرے بازی کی صلاحیت بھی فراواں تھی۔ ۱۹۸۹ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواز شریف کی دعوت پہ لاہور کے باغ جناح میں تقریر کرنے آئے تو سٹیج پہ بیٹھے پنجابی عمائدین کی طرف مڑ کر کہا، "میں کچھ کہنے نہیں، صرف پوچھنے آیا ہوں کہ کیا آپ اب بھی مجھے غدار سمجھتے ہیں۔" اگر اب وہ سوال کر سکتے تو شاید اسلام آباد کی طرف نیم رخ ہو کر کہتے، "وہ جنگ تم بھی نہ جیتے جو ہم نے ہاری ہے۔"

۲۷ر اگست ۲۰۰۶ء

❊

معاہدۂ وزیرستان: کس کی جیت؟

پانچ ستمبر کو شمالی وزیرستان میں پاکستانی حکومت اور شدت پسند اسلامی بنیاد پرستوں کے درمیان جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ ابھی ذرائع ابلاغ اور طاقتور حلقوں میں طالبان کے خفتہ حامی ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہو پائے تھے کہ چھ ستمبر کو میجر جنرل شوکت سلطان کے ایک معصوم سے جملے نے گویا امن معاہدے کی ہوا نکال دی۔ امریکن براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے نمائندے سے گفتگو میں موصوف نے فرمایا کہ اس معاہدے کا اسامہ بن لادن کی تلاش پر اطلاق نہیں ہوگا۔

مذکورہ امن معاہدے کا مکمل متن ذرائع ابلاغ کو جاری نہیں کیا گیا تاہم اس معاہدے کی

مختلف ذرائع سے منظر عام پر آنے والی تفصیلات میں بے حد ابہام پایا جاتا ہے۔ وزیرستان معاہدے کا کمزور ترین پہلو یہ ہے کہ قبائلی علاقوں میں موجود مسلح انتہا پسندوں کی کارروائیوں کو افغانستان کے حالات سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں لیکن اس معاہدے میں نہ تو افغان حکومت کا کوئی کردار ہے اور نہ وزیرستان کی سرحدوں سے پتھر بھر فاصلے پر موجود ناٹو افواج کو کوئی مقام دیا گیا ہے۔ اس معاہدے میں امریکہ کی سربراہی میں قائم دہشت گردی کے خلاف سرگرم عالمی اتحاد کا بھی کوئی ذکر نہیں جس کی صفِ اول میں شمولیت کا حکومتِ پاکستان کو اشتیاق رہا کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ امر واضح ہے کہ دہشت گردی کے خلاف سرگرم عالمی اتحاد پر اس معاہدے کی شرائط کا اطلاق نہیں ہوتا۔

گزشتہ ماہ پاکستان، افغانستان اور ناٹو کے سہ فریقی مذاکرات میں بنیادی بحث افغانستان میں سرگرم مسلح عناصر کے گرم تعاقب پر محیط تھی۔ ان حالات میں مذکورہ جنگ بندی میں تنازعے کے اہم فریقوں کو نظر انداز کرنے سے معاہدے کی عملی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

اطلاعات کے مطابق پاکستانی فوج نے مبینہ پاکستانی طالبان کے خلاف فوجی کارروائیاں بند کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو بین الاقوامی برادری کو پاکستان کے خلاف عملی طور پر دہشت گردی کے خلاف مہم سے دستبرداری کا الزام لگانے کا موقع ملے گا اور دوسری طرف قبائلی علاقوں میں بیرونی مداخلت کا امکان بڑھ جائے گا۔

امن معاہدے کی مبینہ تفصیلات میں ایک دلچسپ شق یہ ہے کہ شمالی وزیرستان سے جملہ غیر ملکی عناصر کو باہر نکالا جائے گا اور جو باہر نہ جانا چاہیں انھیں پر امن شہریوں کی طرح قانون کے تابع رہنا ہو گا۔ اس شرط کے دو حصے ہیں اور دونوں باہم متصادم ہیں۔ چاروں طرف سے خشکی میں گھرے ہوئے وزیرستان کے ایک طرف افغانستان ہے اور دوسری طرف پاکستان۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ وزیرستان سے باہر نکلنے والے غیر ملکی عناصر افغانستان اور پاکستان میں سے کس طرف کا رخ کریں گے۔

قبائلی علاقوں میں موجود بنیاد پرستوں کے حامی تو روزِ اول سے وزیرستان میں غیر ملکیوں کی موجودگی کی تردید کرتے آئے ہیں۔ ان کا موقف یہ رہا ہے کہ روس کے خلاف لڑائی کے دوران چند افراد یہاں آئے تھے جنھوں نے مقامی خواتین سے شادیاں کر لی ہیں اور مقامی باشندوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مذکورہ امن معاہدے کے معلوم متن میں معاہدے کی شرائط کے نفاذ کا طریق کار

Scanned with CamScanner

بیان نہیں کیا گیا، چنانچہ فوج کی عدم موجودگی اور فوجی کارروائی سے تحفظ کی صورت میں طالبان کے یہ مقامی سرپرست کسی غیر ملکی کی موجودگی کس طرح تسلیم کریں گے؟

طالبان کے ساتھ امن کی گزشتہ کوششوں میں ایک متنازعہ نکتہ غیر ملکیوں کی رجسٹریشن کا تھا۔ پانچ ستمبر کے معاہدے میں رجسٹریشن کا ذکر غائب ہے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق امن معاہدے پر مقامی طالبان کی مجلس شوری کے تین ارکان نے دستخط کیے ہیں۔ طالبان کے سیاسی رہنما حاجی عمر اور عسکری سالار گل بدر معاہدے کا حصہ نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ طالبان کے مذہبی رہنماؤں ملا صادق نور، ملا دیندار اور مولوی عبدالحق نے بھی معاہدے پر دستخط نہیں کیے۔ معلوم تفصیلات کے مطابق معاہدے کے متن میں 'القاعدہ'، 'طالبان' اور 'پاکستانی طالبان' جیسی اصطلاحات شامل ہیں۔ تجزیہ نگاروں نے سوال اٹھایا ہے کہ معاہدے کے دستخط کنندگان میں القاعدہ کی نمائندگی کون کرتا ہے؟ سوال تو یہ بھی ہے کہ کیا اس معاہدے کے ذریعے پاکستان میں القاعدہ کی موجودگی کو باقاعدہ تسلیم کیا جارہا ہے؟

مارچ ۲۰۰۴ء سے افغان سرحد پر موجود ۸۰ ہزار پاکستانی فوجی مسلح عناصر کو سرحد پار کرنے سے نہیں روک سکے۔ اس ضمن میں بارہا دشوار گذار جغرافیائی حقائق کا ذکر کیا گیا ہے۔ گزشتہ مہینوں میں افغان حکومت اور ناٹو کے عسکری ذرائع پاکستانی سرحد کی طرف سے دراندازی کے الزامات عائد کرتے رہے ہیں۔ کیا امن معاہدے کی مبہم شرائط کے پیش نظر ان الزامات کی شدت میں اضافہ نہیں ہوگا؟

معاہدے کی ایک دلچسپ شرط نام نہاد ٹارگٹ کلنگ پر پابندی ہے۔ اس ضمن میں سرکاری ملازمین، قبائلی عمائدین اور صحافیوں کا صراحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ وزیرستان کے مبینہ طالبان حالیہ مہینوں میں اساتذہ اور طالب علموں پر حملے کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے جرائم پیشہ یا امریکی جاسوس جیسی تہمتیں رکھ کے پاکستانی شہریوں کی سر بریدہ لاشیں بجلی کے کھمبوں سے لٹکائی ہیں۔ شمالی وزیرستان میں تین لاکھ ساٹھ ہزار شہری بستے ہیں۔ جنھیں قومی اسمبلی میں نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ (۲۸ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل شمالی علاقہ جات کو مقننہ میں نمائندگی حاصل نہیں۔) صحافتی حلقوں میں سوال اٹھایا جارہا ہے کہ کیا اس معاہدے کے ذریعے نام نہاد طالبان کو علاقے کے پرامن شہریوں پر من مانی کی اجازت دی جارہی ہے۔ خبروں کے مطابق امن معاہدے پر دستخط کی تقریب میں صحافیوں کو تصویریں لینے کی اجازت نہیں دی گئی۔

Scanned with CamScanner

اگر پاکستان میں کیمرا خلافِ قانون نہیں تو یہ پابندی طالبان کے اثر و نفوذ کی علامت شمار ہوگی۔

۱۹۹۶ء میں اسامہ بن لادن سوڈان سے افغانستان ایک محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں آئے تھے۔ اگر ۲۰۰۶ء میں انھیں وزیرستان کی صورت میں محفوظ پناہ گاہ میسر ہو تو گویا ان کے خواب پورے ہو گئے۔ افغان طالبان کو صرف تین ممالک تسلیم کرتے تھے۔ پاکستان تو بین الاقوامی برادری کا باضابطہ رکن ہے۔ یہ صورت حال کافی حیران کن ہوگی کہ پاکستانی حکومت اپنے ایک آئینی حصے پر ریاستی عملداری قائم کرنے کی مجاز تو نہیں ہوگی لیکن بین الاقوامی مداخلت کی صورت میں شدت پسندوں کے اندرونِ ملک حامیوں کی مذمت کا پہلا نشانہ پاکستانی حکومت ہوگی۔

جون ۲۰۰۲ء سے انتہا پسند مذہبی سیاست کے حامی تسلسل سے قبائلی علاقوں میں موجود شدت پسندوں سے گفت و شنید کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ طالبان سے مذاکرات کے ان حامیوں نے بلوچستان کے شوریدہ عناصر سے مذاکرات کے لیے کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ بلوچستان میں کشیدگی کو وزیرستان میں مراعات بٹورنے کا جواز بنایا گیا ہے۔ نواب اکبر بگٹی کا قتل ہو یا خواتین کے تحفظ کا مسودۂ قانون، مذہبی سیاست کے علمبرداران کھونٹیوں پر اپنا حقیقی ایجنڈا ٹانگنا نہیں بھولے۔

مذکورہ امن معاہدے کے ذریعے طالبان کے حامی حلقے ان کے لیے کچھ مہلت حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ غالب امکان یہ ہے کہ پیچیدہ بحرانوں سے نبرد آزما حکومت کم سے کم ایک محاذ بند ہونے پر مطمئن ہوگی، مگر اس میں دو تخن گسترانہ نکات آن پڑے ہیں۔ اول یہ کہ دہشت گردوں کے لیے اپنی فکری اور عملی مجبوریوں کے باعث ایک خاص مدت سے زیادہ خاموش رہنا ممکن نہیں ہوگا، اور دوسرے یہ کہ اس معاہدے کے کیف و کم میں بین الاقوامی حقائق کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ جو محاذ بند کرنا تھے وہ آگ اگل رہے ہیں، اور جہاں دوستی کا گیت گایا جا رہا ہے وہاں بارود کے ڈھیر لگے ہیں۔ ایک منجھے ہوئے صحافتی ادارے نے میجر جنرل شوکت سلطان سے سوال و جواب کر کے دراصل یہ واضح کیا ہے کہ وزیرستان میں انتہا پسندوں کی موجودگی کوئی صدارتی ریفرنڈم نہیں جسے دلیل اور حقیقت کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے تسلیم کر لیا جائے۔

۷ر ستمبر ۲۰۰۶ء

Scanned with CamScanner

❁

غلام اسحاق خان: نصف صدی کا قصہ

غلام اسحاق خان نہیں رہے۔ ان کی بے لچک ضابطہ پسندی سے کچھ بعید نہیں کہ قضاوقدر کے فرشتوں سے تکرار ہو رہی ہو کہ انھوں نے انتقال کیا ہے یا انھیں اضافی ترقیوں کے ساتھ نئی تقرری کا پروانہ دیا جا رہا ہے؟ وہ فرائض زندگی سے بطریق احسن سبکدوش ہوئے ہیں یا انھیں موجودہ مراعات سمیت فارغ خطی دی جا رہی ہے؟ قواعد وضوابط کی کتابوں سے گرد جھاڑی جا رہی ہو۔ اے کے بروہی کی قیادت میں قانونی ماہرین سے مشاورت کا سلسلہ جاری ہو۔ ذرائع ابلاغ کو اشارے کنائے میں مشیتِ ایزدی کا عندیہ دیا جا رہا ہو۔ ممکن ہے زیڈ اے سلہری صاحب نے ایک مبسوط مقالہ بھی رقم کر لیا ہو کہ غلام اسحاق خان ایٹمی پروگرام کے محافظ تھے جنھوں نے امریکی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا؛ ان سے اعمال کے حساب کا تقاضا کرنا پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنا اور دوقومی نظریے کی توہین کرنا ہے؛ نیز یہ کہ اس ضمن میں عسکری قیادت بالخصوص حساس اداروں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

ایک امکان تو یہ بھی ہے کہ بہشت کے جملہ باشندوں میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہوں کہ نو وارد بلحاظِ عہدہ جنت کے مقامِ اولیٰ کی طرف خراماں خراماں بڑھ رہے ہیں یا جہنم کی ہیئتِ مقتدرہ نے ساکنانِ جنت کی صفوں میں اپنا نمائندہ بٹھانے کا اہتمام کیا ہے؟

غلام اسحاق خان ان مٹھی بھر افسروں میں شامل تھے جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے حصے میں آئے۔ ممتاز مسلم لیگی رہنما اسلم خٹک روایت کرتے تھے کہ ۳۲ برس کا نوجوان افسر اسحاق خان سڑک کے کنارے کسی پٹھان کو دیکھتا تو اسے ایک روپیہ دے کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے کی فرمائش کرتا تھا۔ نمودِ عشق کی معصومیت میں مآلِ کار کی خبر کسے رہتی ہے۔

الطاف گوہر لکھتے رہے جنوں کی حکایت میں رقم طراز ہیں کہ کراچی ایرپورٹ پر سابق وزیراعظم سہروردی نے انھیں دیکھا تو بلا کر بے ساختہ پوچھا: 'الطاف، پاکستان کی فوج اتنے

تھوڑے عرصے میں اتنی بدعنوان کیسے ہوگئی؟'' فروری ۱۹۵۹ء میں سہروردی کا یہ سوال دراصل پاکستانی حکمرانوں کی دوسری نسل کے بارے میں تھا۔ پہلے دُودمان کے چراغ چوہدری محمد علی اور غلام محمد تھے۔ سول افسر شاہی سے وردی پوش تانا شاہی تک کے سفر میں ایک پڑاؤ اسکندر مرزا کا پڑتا تھا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جو کردار اسکندر مرزا کو ملا تھا، ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اسی نوعیت کے کچھ نالے غلام اسحاق خان کے سپرد ہوئے تھے۔ رپورٹ پٹواری مفصل (لف ہذا) سے معلوم پڑتا ہے کہ یہ نالے بطریق احسن وہم ہوئے۔

غلام اسحاق خان کی پیشہ ورانہ اہلیت اور فکری استعداد پر معروضی رائے دینا مشکل ہے۔ یوں تو پاکستان میں انگریزی بولنے اور دفتری قواعد وضوابط سے آگہی ہی کو قابلیت کا معیار ٹھہرایا جاتا ہے مگر اسلامیہ کالج پشاور کے برسر اور قومی خزانے کے مہتمم کی فکری اُپج میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ واپڈا کے انتظام کی ذمہ داری گمبھیر سہی لیکن مملکت کے سربراہی کے لیے درکار بصیرت کے تقاضے کچھ اور ہوں گے۔

انھوں نے نئے ملک میں اپنے پیشہ ورانہ سفر کا آغاز خودساختہ مردِ آہن قیوم خان کے پولیٹیکل سیکرٹری کی حیثیت سے کیا تھا۔ فیروز خان نون کی سربراہی میں جس کمیٹی نے زرعی اصلاحات کی سفارش کی تھی اس میں غلام اسحاق خان محکمہ آبپاشی کے نمائندے کی حیثیت سے شامل تھے۔ کمیٹی کی رپورٹ میں غلام اسحاق خان کے کچھ کاٹ دار جملوں کو بہت مقبولیت ملی۔ بھٹو صاحب کا سوشلزم آیا تو جس دورکنی کمیٹی کی رپورٹ میں بینکوں کو قومیانے کی سفارش کی گئی اس میں اے جی این قاضی کے علاوہ غلام اسحاق خان بھی شامل تھے۔

موسم بدلا تو ضیاء الحق پاکستان کو اسلام سے متعارف کرانے تشریف لائے۔ اس مہم میں غلام اسحاق خان کو معیشت کے سر پر عقیدے کی ردا اُڑھانے کی ذمہ داری ملی۔ انھوں نے نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر اسلامی بینکاری متعارف کرائی۔ اردو میں بجٹ پیش کرنے کی روایت شروع ہوئی جس سے اردو اخبارات کے معاشی تجزیوں میں اقبال کے اشعار کی پذیرائی بڑھی۔ بینک کھاتہ داروں کی بچتوں سے زکوٰۃ کاٹنے کا سلسلہ شروع ہوا جس سے ملک بھر میں خضر صورت بزرگوں کی غربت میں معتدبہ کمی واقع ہوئی، البتہ خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی شرح ربع صدی میں ۲۰ فیصد سے بڑھ کر ۳۵ فیصد تک جا پہنچی۔

Scanned with CamScanner

جولائی ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا تو غلام اسحاق خان سیکرٹری دفاع تھے۔ پیپلز پارٹی کے حلقوں میں، صحیح یا غلط، یہ خیال ہمیشہ موجود رہا کہ بطور سیکرٹری دفاع غلام اسحاق خان ضیاء الحق کے ارادوں سے باخبر تھے مگر انھوں نے بھٹو صاحب کو اندھیرے میں رکھا۔ اس رائے کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملی کہ ضیا عہد میں جنرل چشتی سے لے کر کے ایم عارف تک اور آغا شاہی سے لے کر محمد خان جونیجو تک چل چلاؤ کا عالم رہا مگر غلام اسحاق خان گیارہ برس تک ضیاء الحق کی مونچھ کا بال رہے۔

جن ملکوں میں عوامی تائید کے بغیر حکمرانی کا طور جڑ پکڑ لے، وہاں ایک نہ ایک کردار ایسا پیدا ہو جاتا ہے جسے سدا بہار سمجھا جاتا ہے۔ اقتدار جس روپ میں بھی رونمائی دے، یہ کسی خوشنما تِل کی صورت رخ انور کی رونق بڑھاتے رہتے ہیں۔ روس میں یہ اعزاز گرومیکو کو حاصل تھا۔ پاکستان میں یہ منصب غلام اسحاق خان کو ملا۔ اس طرح کے کردار کی تین خوبیاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی میں مستعد ہوتا ہے۔ اقتدار کے مرکز پر ہوتے ہوئے بھی خود کو نمایاں کرنے سے گریز کرتا ہے۔ روزمرہ معاملات میں قاعدے قانون کی لفظی پابندی کرتا ہے مگر بنیادی سوالات پر دوٹوک رائے ظاہر کرنے سے گریز کرتا ہے۔

اسلام آباد کے کامیاب دانشور غلام اسحاق خان کی کہہ مکرنیوں کو ان کی اصول پسندی قرار دیتے تھے۔ ایسے ہی کسی موقعے پر لاہور کے دانشور صحافی اسلم ملک نے فقرہ چست کیا تھا کہ "غلام اسحاق خان قانون اور دستور کے ہر لفظ بالخصوص شق ۵۸/۲-بی کا جان توڑ کر دفاع کرتا ہے لیکن پورے دستور کو فوجی بوٹ سے ٹھوکر مار کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا جائے تو اسے اونگھ آجاتی ہے۔"

پاکستان میں ان خانہ ساز دانشوروں کی کمی نہیں رہی جو غلام اسحاق خان کی مفروضہ مالی دیانتداری کو ان کی قائدانہ صلاحیت کی دلیل بنا کر پیش کرتے تھے۔ بدعنوانی کو مالی خرد برد یا رشوت ستانی تک محدود کرنا انسانی معاشرے کی پیچیدہ نوعیت اور جدید اداروں کے کردار سے لاعلمی کی نشانی ہے۔ مالی بدعنوانی بے شک معاشی اور سماجی ترقی کے لیے زہر کا درجہ رکھتی ہے تاہم مہذب معاشرے میں سب سے خطرناک انفرادی بدعنوانی کسی حکمران کے اقتدار کا ناجائز ہونا ہے۔ اجتماعی سطح پر بدعنوانی کی بدترین صورت اداروں کا اپنے آئینی دائرۂ کار سے تجاوز کرنا ہے۔

Scanned with CamScanner

انفرادی دیانتداری کا پھول ایسے معاشروں میں بہار دیتا ہے جہاں عوام کے امکان پر اعتماد کیا جاتا ہو، جہاں قانون کی بالادستی قائم ہو، جہاں علم، دستور اور ضابطے کی مدد سے معیارِ زندگی میں مسلسل بہتری اجتماعی نصب العین ہو، جہاں رائے کے شخصی اور اجتماعی اظہار پر پابندیاں نہ ہوں، جہاں واقعاتی کوتاہیوں کا سدباب انفرادی پارسائی کی بجائے اختیارات اور احتساب کے اداراتی توازن سے کیا جاتا ہو۔ دیانتداری کی کرن سازش اور منافقت کی تاریکی میں نہیں پھوٹتی۔

بدقسمتی سے غلام اسحاق خان کا تاریخی کردار دیانتداری کے جدید معیار پر پورا نہیں اترتا۔ وہ قریب نصف صدی تک ان قوتوں کا مرکزی حصہ رہے جنھوں نے غیر آئینی اور غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے پاکستان کے موجودہ سیاسی اور معاشرتی ڈھانچوں کی صورت گری کی ہے۔ آج پاکستان کے عوام کی سیاسی آواز غیر موثر ہے۔ ان کے معاشی اور سماجی اشاریے جنوبی ایشیا کے تناظر میں بھی قابل تشویش ہیں۔ ریاستی اداروں کی کارکردگی غیر اطمینان بخش ہے۔ پاکستان کے ان خدوخال کی ذمہ داری بہت سے دوسرے کرداروں کے علاوہ غلام اسحاق خان پر بھی عائد ہوتی ہے۔

خان صاحب شعر کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ صحافیوں سے تبادلۂ خیال میں ان کی بلاغت عام طور پر کسی پشتو ضرب المثل یا فارسی شعر کی صورت بہار دیتی تھی۔ سپریم کورٹ نے نواز شریف حکومت کی برطرفی کو ناجائز قرار دیا تو خان صاحب نے اقبال کا سہارا لے کر تنبیہ کی کہ پیرِ مغاں کا کام تمام نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ انگور کی ٹہنیوں میں شراب کے بہت سے پیالے ابھی باقی تھے۔ مگر سیاست کا مہادیو اپنی چال چل چکا تھا۔ چند ماہ بعد صدارتی انتخاب کا ڈول ڈالا گیا۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء کی گلابی دھوپ میں مارگلہ کی پہاڑیوں پر سیر کو نکلنے والوں نے ایک ۸۰ سالہ بزرگ کو عالمِ تنہائی میں اِدھر اُدھر پھرتے دیکھا تو جان لیا کہ پیرِ مغاں کا کھیل انجام کو پہنچ چکا۔ ۲۷ر اکتوبر ۲۰۰۶ء کی صبح خبر آئی کہ انگور کی شاخوں میں شراب کا آخری قطرہ بھی تہہ جام اتر آیا ہے۔

۲۸ر اکتوبر ۲۰۰۶ء

❋

نجی عقوبت خانے — سپریم کورٹ تک

سرحد پولیس نے ۷رنومبر ۲۰۰۶ء کو سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق ایبٹ آباد کے مدرسہ نما نجی عقوبت خانے کے بارے میں اپنی رپورٹ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو پیش کر دی ہے۔ واضح رہے کہ ایبٹ آباد پولیس نے اکتوبر ۲۰۰۶ء میں ایک نجی جیل سے سات برطانوی شہریوں سمیت ایک سو بارہ قیدی برآمد کیے تھے۔ اس نجی جیل کو گزشتہ پندرہ برس سے مولانا الیاس قادری نامی ایک شخص چلا رہا تھا۔ آخری اطلاعات تک عدالتِ عظمیٰ نے اس رپورٹ پر مزید کوئی حکم جاری نہیں کیا۔

ایبٹ آباد پولیس کے اعلیٰ اہلکار نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا ہے کہ سپریم کورٹ کو پیش کی جانے والی رپورٹ نے مقدمے کی ایف آئی آر میں درج حقائق کی تصدیق کرتے ہوئے مولانا الیاس قادری اور اس کے چھ ساتھیوں کو ایک سو بارہ افراد کو غیر قانونی طور پر قید میں رکھنے اور ان سے غیر انسانی سلوک کرنے نیز شدید جسمانی تشدد کرنے کا مرتکب ٹھہرایا ہے۔ تاہم پولیس کی رپورٹ کا اہم ترین حصہ ایڈیشنل سیشن جج ہری پور، یوسف خان خٹک، کے کردار کے بارے میں ہے۔

عقوبت خانے سے رہا ہونے والے ٹیکسلا کے رہائشی مجیب کے والد ولی محمد کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ایڈیشنل سیشن جج یوسف خان خٹک نے فروری ۲۰۰۶ء میں مولانا الیاس قادری سے تین لاکھ روپے رشوت لے کر مدرسے میں پولیس مداخلت کے خلاف حکم امتناعی جاری کیا تھا۔ عقوبت خانے سے رہا ہونے والے متعدد افراد کا کہنا ہے کہ مذکورہ جج مولوی الیاس قادری سے ہر مہینے پچاس ہزار روپیہ بھتہ بھی وصول کرتے تھے۔

سرحد پولیس نے اپنی رپورٹ میں ان الزامات کی تردید یا تصدیق کیے بغیر واقعات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ چھ اکتوبر کو مدرسے سے بازیاب ہونے والے ایک سو بارہ افراد کو جوڈیشل مجسٹریٹ ہری پور حنا خان کی عدالت میں پیش کیا گیا تو ایڈیشنل سیشن جج یوسف خان خٹک نے نہ صرف یہ کہ جوڈیشل مجسٹریٹ کو دفعہ ۱۶۴ کے تحت بازیافتہ افراد کے بیانات ریکارڈ کرنے سے روک دیا بلکہ پولیس کو حکم دیا کہ الیاس قادری کو رہا کر کے بازیافتہ افراد کو دوبارہ 'ادارہ انسدادِ منشیات' میں پہنچا دیا جائے۔

Scanned with CamScanner

اس پر جوڈیشل مجسٹریٹ حنا خان نے تحریری طور پر بازیافتہ افراد کے بیانات درج کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ پولیس ان افراد کو ہری پور کے دوسرے ایڈیشنل سیشن جج حافظ نسیم اکبر کی عدالت میں لے گئی جنھوں نے بازیاب ہونے والے افراد کے بیانات قلم بند کر کے ان کی رہائی کا حکم دیا۔ انھوں نے مولانا الیاس قادری اور ان کے ساتھیوں کی درخواست ضمانت بھی مسترد کر دی۔ جن قیدیوں نے ملزمان پر جنسی زیادتی کا الزام عائد کیا تھا، ایڈیشنل سیشن جج حافظ نسیم اکبر نے انھیں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال ہری پور میں طبی معائنے کے لیے لے جانے کی ہدایت بھی کی۔

مبینہ طور پر تحصیل ہری پور کے تھانہ کھلابٹ کے علاقے میں مولانا الیاس قادری نامی ایک شخص گزشتہ پندرہ برس سے یہ مدرسہ نما نجی جیل چلا رہا تھا۔ مولانا الیاس قادری اپنے چھ ساتھیوں سمیت پولیس کی تحویل میں ہے۔ اٹھائیس اکتوبر کو سیشن جج ہری پور نے ملزمان کی درخواست ضمانت مسترد کر دی تھی۔

ہری پور میں انسانی حقوق کے فعال کارکن سید ابرار حسین شاہ کے مطابق تین اور چار اکتوبر کی درمیانی شب ہری پور پولیس کے ڈی ایس پی عبدالمجید آفریدی چند سپاہیوں کے ساتھ جیپ پر گشت کر رہے تھے۔ پولیس پارٹی نے تربیلا جھیل کے کنارے سڑک پر دو مشتبہ افراد کو روک کر پوچھ گچھ کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ دونوں افراد، ماجد محمود اور شاہد وسیم، کے پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

انھوں نے بتایا کہ وہ مولانا الیاس قادری کے 'ادارہ انسداد منشیات' سے فرار ہوئے تھے۔ عبدالحمید آفریدی انھیں جیپ میں بٹھا کر تھانے لے آئے۔ شدید تشدد کا شکار رہنے والے ہونے دونوں افراد الیاس قادری کے خوف سے کچھ بتانے سے گریزاں تھے۔ انھیں تحفظ کی یقین دہانی کرانے کے بعد ان کے نام سے مولانا الیاس قادری اور دیگر ملزمان کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی۔ پولیس کے اعلیٰ ضلعی حکام کو آگاہ کیا گیا اور تحصیل ناظم کی موجودگی میں علی الصباح مولانا الیاس قادری کے مدرسے پر چھاپہ مارا گیا۔ اس موقعے پر ساڑھے سات منٹ کی وڈیو فلم بھی تیار کی گئی۔

اس غیر معمولی احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ کچھ عرصہ قبل مولانا الیاس قادری نے پولیس کی ممکنہ مداخلت سے بچنے کے لیے ایڈیشنل سیشن جج ہری پور سے حکم امتناعی حاصل کر رکھا تھا۔ عقوبت خانے سے برآمد ہونے والے مغوی افراد نے عدالت میں الزام عائد کیا ہے کہ متعلقہ ایڈیشنل سیشن جج نے اس ضمن میں مولانا الیاس قادری سے بھاری رشوت وصول کی تھی۔ ان افراد نے سپریم کورٹ کے نام ایک خط میں الزام

Scanned with CamScanner

عائد کیا ہے کہ ملزم مولانا الیاس قادری علاقے میں حساس اداروں کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ کیے ہوئے تھا۔

چھاپے کے دوران اس عقوبت خانے سے ایک سو بارہ افراد برآمد ہوئے جن کی عمریں دس برس سے پچاس سال تک تھیں۔ ان میں سات پاکستانی نژاد برطانوی شہری بھی شامل تھے جن میں سے چار افراد، عقاب نواز، راجہ اظہر، راجہ ارشد اور شہزاد، کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ان میں سے دو نوجوانوں کے مطابق ان کے چچا نے جائیداد ہتھیانے کے لیے انھیں پاکستان لا کر الیاس قادری کے مدرسے میں قید کروایا تھا۔ ضلعی ناظم یوسف ایوب نے برطانیہ میں ان کے والدین سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق پاکستان میں برطانوی ہائی کمیشن کے حکام نے بھی ضلعی انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا ہے۔

اس نجی عقوبت گاہ میں سات بیرکیں تھیں۔ دو دو قیدیوں کے پیروں میں ایک ہی زنجیر ڈالی جاتی تھی تاکہ کوئی قیدی بھاگ کر فرار نہ ہو سکے۔ انھیں دن میں ایک دفعہ نہایت ناقص کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ رات کے وقت قیدیوں کو زمین میں گڑھے ہوئے کنڈوں سے جکڑ دیا جاتا تھا اور انھیں بیت الخلا جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ رات کے وقت پیشاب کی حاجت ہونے پر انھیں پلاسٹک کی بوتلیں فراہم کی جاتیں۔ قیدیوں کی نگرانی پر چھ افراد مامور تھے۔ یہاں سے رہا ہونے والے کم از کم بارہ قیدیوں نے مجسٹریٹ کے سامنے زیر دفعہ ۱۶۴ بیان دیتے ہوئے مولانا الیاس قادری اور اس کے ساتھیوں بالخصوص غلام کبریا پر قیدیوں کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ جنسی زیادتی کا الزام عائد کیا ہے۔ ایبٹ آباد کے طبی حکام نے معائنے کے بعد قیدیوں سے جنسی زیادتی کی تصدیق کی ہے۔

اس عقوبت خانے میں روحانی علاج کے نام پر قیدیوں پر باقاعدگی سے شدید تشدد کیا جاتا تھا۔ یہاں سے برآمد ہونے والے قیدیوں کے جسموں پر مسلسل ایذا رسانی کی علامات پائی گئی ہیں جن میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں، مجروح اعضا اور کھال پر گہرے زخموں کے نشان شامل ہیں۔

مولانا الیاس قادری نے تربیلا جھیل سے چند سو فٹ کے فاصلے پر مرکزی سڑک کے کنارے 'مدرسہ کنز الایمان' کے نام سے یہ ادارہ ۱۹۹۱ء میں قائم کیا تھا۔ تاہم دو برس بعد اسے 'ادارہ انسداد منشیات' کی صورت دے دی گئی۔ پاکستان کے علاوہ برطانیہ کے اردو اخبارات میں بھی اس نوعیت کے اشتہارات شائع کروائے گئے کہ یہاں منشیات کے عادی افراد کا روحانی علاج کیا جاتا ہے۔ تاہم اس مدرسے سے برآمد ہونے والے قیدیوں کی بڑی تعداد کا منشیات سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ کم عمر بچوں

Scanned with CamScanner

کے سادہ لوح والدین نے انھیں نافرمان قرار دے کر روحانی طریقۂ علاج سے سدھارنے کے لیے یہاں داخل کروایا تھا۔ یرغمالیوں کی اکثریت کو ان کے رشتے داروں یا دشمنوں نے ذاتی مفادات کی بنا پر قید کروایا تھا کیونکہ مدرسے کی شہرت کے مطابق یہاں قانون نافذ کرنے والے ادارے پر نہیں مار سکتے تھے۔ مدرسے کے ریکارڈ کے مطابق قیدیوں کے لواحقین سے داخلہ فیس کے نام پر ۲۵ سے ۴۰ ہزار روپے تک وصول کیے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں قیدیوں کے علاج کے نام پر ہر مہینے ۳ سے ۴ ہزار روپے وصول کیے جاتے تھے۔

ادارے کی وزیٹر بک میں جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما اور سابق وزیر حنیف طیب کے علاوہ آزاد کشمیر کے سابق وزیر سردار یعقوب کے دستخط بھی پائے گئے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ نجی جیل سابق وزیر خارجہ گوہر ایوب اور موجودہ وزیر انیسہ زیب طاہر خیلی کے گھروں سے معمولی فاصلے پر قائم تھی۔ اس سے پاکستان میں موجود اس خطرناک رجحان کا اشارہ ملتا ہے کہ مذہب کے نام پر کی جانے والی کسی سرگرمی کو بغیر کسی تحقیق کے قبول کر لیا جاتا ہے۔

پاکستان میں بلوچستان اور سرحد کے قبائلی علاقہ جات نیز سندھ میں کچے کے علاقوں میں نجی عقوبت گاہوں کا وجود تو معلوم حقیقت ہے لیکن ایبٹ آباد جیسے گنجان آباد شہر میں مذہبی مدرسے کے نام پر ایسی واردات کا یہ پہلا واقعہ ہے۔

۱۰ نومبر ۲۰۰۶ء

❊

حسبہ قانون — فانے کا پتلا سرا

کلکتہ سے آنے والی جی ٹی روڈ پشاور میں جہاں ختم ہوتی ہے وہیں بائیں ہاتھ کوئی دو سو گز کے فاصلے پر سرحد اسمبلی کی عمارت واقع ہے۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۶ء کو یہاں بیٹھے قانون سازوں نے بالآخر حسبہ بل منظور کر لیا۔ اسمبلی میں اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے اور عوام کو برکاتِ عظیم کا مژدہ سنایا گیا۔

Scanned with CamScanner

حسبہ قانون کی کہانی نئی نہیں۔ پاکستانی شہریوں کے کان شرعی نظام کے نام پر بارہا ایسے قوانین سے آشنا ہوئے ہیں جن کے نقارے میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں اور زیرِ متن ''ہم کو ملے ہر بار، نمک سے بنے ہوئے پتوار''۔ ان سب تجربوں کی پس نوشت بھی کچھ یکساں ہی ہے: ''یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا''۔

پشاور سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی سے حسبہ بل پر بات ہوئی تو انھوں نے بے نیازی سے کہا کہ ''اس کی کچھ خاص اہمیت نہیں۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے سے اس قانون کا ڈنک تو پہلے ہی نکال دیا تھا۔ جو چھلکا بچ رہا تھا، ایم ایم اے نے اسے اسمبلی سے منظور کرالیا ہے۔ اسے اگلے انتخابات میں لوگوں سے ووٹ بھی تو لینا ہیں۔'' اس گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ قابل قدر صحافی کو حسبہ قانون کا ڈنک نکالے جانے پر مایوسی ہے یا انھیں ایم ایم اے کی مشق لاحاصل پر افسوس ہے۔ مگر مجھے خواجہ ناظم الدین یاد آ گئے۔

۱۹۵۳ء کے احمدی مخالف فسادات کے بعد ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا۔ جسٹس رستم کیانی نے شہادت کے ایک مرحلے پر وزیرِاعظم خواجہ ناظم الدین سے سوال کیا: ''خواجہ صاحب، آخر آپ کو علماء کی مجلس عمل کے مطالبات ماننے میں کیا عار تھی؟''

خواجہ ناظم الدین مرنجاں مرنج شخصیت تھے۔ ان کی طبیعت کا مذہبی میلان بھی کچھ ایسا ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ انھوں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر کہا، ''مگر یہ مطالبات تو فانے کا پتلا سرا تھے۔'' مفہوم یہ کہ ان سے طاقت پا کر مزید مطالبات سامنے آنا تھے۔ متحدہ مجلس عمل نے اس کٹے پھٹے حسبہ بل کو فانے کا پتلا سرا جان کر ہی یہ قانون منظور کیا ہے۔

اس طرح کے قوانین کا منطقی انجام سمجھنے کے لیے آپ کو ایک تصویر دکھاتے ہیں۔[۲] یہ تصویر تہران میں لی گئی تھی۔ کچھ برس پہلے ایک مقتدر آیت اللہ کے انتقال پر فیصلہ کیا گیا کہ ان کے مرقد پر ایک خوشنما گنبد تعمیر کیا جائے۔ سو تعمیر کے جدید آلات کی مدد سے فٹ بال گراؤنڈ کے رقبے پر محیط گنبد کی تعمیر شروع ہوئی۔ عمارت اپنی تکمیل کو پہنچ رہی تھی کہ کسی کو خیال آیا کہ گنبد کے عین بیچ کھڑی کرین نکالنے کا تو کوئی اہتمام ہی نہیں کیا گیا۔ اب جملہ ماہرین تعمیر سر جوڑ کر بیٹھے۔ یہ قضیہ کوئی ڈیڑھ دو برس چلتا رہا۔ گنبد اپنی وسعت میں گنبدِ فلک کو شرماتا تھا، مگر اس کے بیچوں بیچ سیکڑوں من وزنی کرین گڑی

۲ پچھلے اندرونی سرورق پر دی گئی تصویروں میں نیچے والی تصویر دیکھیے۔

Scanned with CamScanner

تھی جسے گنبد سے نکالنے کا کوئی حربہ باور نہیں ہوتا تھا۔ اُدھر آئے دن ایران کے طنز نگار اس گنبد کی ہیئت کذائی پر نت نیا حاشیہ جماتے تھے۔ آخر گنبد کو گرا کر کرین باہر نکالی گئی اور تعمیر از سرِ نو شروع ہوئی۔

تقدیس کے لحاظ میں فانے کے جو پتلے بسرے قبول کیے جاتے ہیں وہ بالآخر ایرانی گنبد کی کرین بن جاتے ہیں۔

۲۰۰۲ء میں متحدہ مجلس عمل کے صوبۂ سرحد میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد شرعی قوانین کا غلغلہ بلند ہوا۔ بڑی ہماہمی کے بعد شریعت بل منظور کیا گیا۔ اخبارات کا بُرا ہو جنھوں نے انکشاف کیا کہ متحدہ مجلس عمل کا شریعت بل تو حرف بہ حرف بلکہ شوشہ بہ شوشہ ۱۹۹۱ء میں نواز شریف حکومت کے منظور کردہ شریعت بل کا چربہ تھا جو پورے پاکستان کی طرح صوبۂ سرحد میں بھی پہلے سے نافذ العمل تھا۔ اس پر متحدہ مجلس عمل کو خاصی شرمندگی اٹھانا پڑی۔ اس کے بعد سعودی عرب کی مطوّع فورس، ایران کے پاسداران اور افغان طالبان کی طرز پر مذہبی احتساب کا ڈول ڈالا گیا۔

۲۰۰۳ء کے نصف آخر میں حسبہ کا مسودہ قانون پیش کیا گیا۔ اس قانون کا لبِ لباب مذہبی پیشواؤں کو صوبے کی انتظامی، عدالتی، معاشرتی اور سیاسی زندگی پر مکمل اختیار دینا تھا۔ مسودۂ قانون مرتب کرنے والوں کی فراخدلی کا یہ عالم تھا کہ اس کے تحت مقرر ہونے والے محتسبوں کے کسی حکم یا فیصلے کو صوبے یا ملک کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قانون سازی کے تمام اصولوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان مجوزہ محتسبوں کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ مجوزہ قانون کے شرعی مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے اختیارات کا دائرۂ کار نیز اپنے احکامات پر عمل درآمد کا طریق کار بھی خود ہی طے کریں۔

پاکستان میں آئین اور قوانین کو قرآن و سنت کے تابع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن و سنت کی اصطلاح اپنی تشریح کے اعتبار سے بجائے خود کچھ کم متنازع نہیں۔ حسبہ قانون کے مسودے میں اس مصرع طرح پر 'اسلامی اقدار کے تحفظ' کی گرہ لگائی گئی۔ حسبہ بل اپنی اصل شکل میں قانون، شہریت حتیٰ کہ مذہب کی ایسی سادہ لوح تفہیم پر مبنی تھا کہ اس سے مولانا عبدالقادر ڈیروی کی تحریر کردہ وہ تقریر یاد آتی تھی جو اکتوبر ۱۹۹۶ء میں ناکام بنائے جانے والے اسلامی انقلاب کے 'امیر المومنین' نے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر 'عزیز ہم وطنوں' کے سامنے پیش کرنا تھی۔ اس تقریر میں نمازوں کے اوقات، اخبارات میں عورتوں کی تصاویر نیز وڈیو دکانوں کی بندش کا تو ذکر تھا مگر معیشت یا خارجہ پالیسی پر ایک لفظ نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

ایم ایم اے حکومت نے حسبہ کے مسودۂ قانون کو مشتہر کرنے کی بجائے خفیہ رکھنا مناسب سمجھا۔ اِدھر اُدھر سے منظرِ عام پر آنے والے اس کے مندرجات پر عوام نے سخت ردِ عمل ظاہر کیا۔ چنانچہ یہ مسودۂ قانون مشاورت کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل بھیجا گیا۔ صوبائی حکومت کا دعویٰ تھا کہ حسبہ قانون دراصل اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات ہی پر مبنی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اگست ۲۰۰۴ء میں گورنر سرحد کے نام مکتوب کے ذریعے حسبہ قانون کو غیر اسلامی قرار دے دیا۔ تاہم کچھ جھاڑ پونچھ کے بعد سرحد اسمبلی نے جولائی ۲۰۰۵ء میں حسبہ قانون منظور کر لیا، لیکن گورنر سرحد نے اس کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا۔ ادھر وفاقی حکومت نے حسبہ قانون کی آئینی حیثیت کے بارے میں سپریم کورٹ سے رجوع کر لیا۔ عدالتِ عظمیٰ نے ۴ راگست ۲۰۰۵ء کو حسبہ قانون کی قریب ۸۰ فیصد دفعات کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ تب سے یہ مسودۂ قانون مفلوج حالت میں سرحد اسمبلی کے طاق پر دھرا تھا۔

سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق چند در چند اسباب کی بنا پر مرکزی حکومت حقوقِ نسواں کے تحفظ کا قانون منظور کرانے پر تلی ہوئی ہے جبکہ مجلس عمل حدود قوانین میں کسی تبدیلی کی سخت مخالف ہے۔ چنانچہ قومی اسمبلی میں تحفظِ نسواں بل کی منظوری کے عوض متحدہ مجلس عمل کو حسبہ بل کی ریوڑی دی گئی ہے۔

حسبہ قانون کے ابتدائی مسودے میں پروپیگنڈے کے پیش نظر کچھ بے ضرر دفعات، از قسم گداگری کی ممانعت یا مسجدوں کی دیکھ بھال، بھی شامل کی گئی تھیں۔ مغرب نواز کانوں کے حسنِ سماعت کے لیے بچوں کی مشقت کا ذکر بھی کیا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سپریم کورٹ کی کاٹ چھانٹ کے بعد یہی بے ضرر دفعات بچ رہی تھیں جنھیں اب حسبہ بل کے نام پر منظور کیا گیا ہے۔

حسبہ قانون اپنی موجودہ شکل میں بڑی حد تک بے دست و پا ہے اور شاید مرکزی حکومت اب اس کی مخالفت کا ارادہ بھی نہ رکھتی ہو مگر اس کٹے پھٹے قانون ہی کے ذریعے متحدہ مجلس عمل نے دور رس نتائج کی حامل پیش قدمی کی ہے۔ مجلس عمل نے یہ اصول باقاعدہ طور پر منوا لیا ہے کہ مذہبی پیشواؤں کو قانون، انتظام عامہ اور شہریوں کی نجی زندگی میں من مانی مداخلت کا اختیار ہے۔

قانون سازی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فوجداری قوانین میں تمام اصطلاحات کا ٹھیک ٹھیک مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ حسبہ قانون میں نہ تو کسی قابل گرفت فعل کی تعریف بیان کی گئی ہے اور نہ اس کی سزا کا پیمانہ مقرر کیا گیا ہے۔ گویا یہ قانون مذہب کے نام پر شہریوں کی نجی زندگی، روزمرہ اطوار حتیٰ

کہ عبادات کی آزادی تک میں من مانی مداخلت کی اجازت کے مترادف ہے۔ مذہبی اقلیتوں کی عبادت گاہوں کے رسمی ذکر سے قطع نظر، حسبہ قانون کا بنیادی مفروضہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم شہری سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے۔

۱۹۵۴ء میں برطانیہ کے متعدد شہریوں کی نجی زندگی کے بارے میں پے در پے انکشافات سامنے آنے پر صدیوں پرانے قوانین کے اطلاق کا سوال اٹھا۔ برطانوی حکومت نے ماہرِ قانون وولفنڈن (Wolfendon) کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ کمیشن کی رپورٹ کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ "قانون کا اصل مقصد امن و امان قائم رکھنا نیز عام شہری کو دوسرے افراد کے ہاتھوں نقصان، استحصال یا بدعنوانی سے تحفظ فراہم کرنا ہے۔ ہماری رائے میں قانون کا کام شہریوں کی نجی زندگی میں مداخلت کرنا یا معاشرتی طرزِ عمل کا کوئی خاص نمونہ نافذ کرنا نہیں ہے۔" وولفنڈن رپورٹ گزشتہ ۵۰ برس میں انفرادی شہری آزادیوں کے بارے میں تشکیل پانے والے تمام جدید قوانین کی اساس کہلاتی ہے۔ سرحد اسمبلی کا منظور کردہ حسبہ بل وولفنڈن رپورٹ میں بیان کردہ اصولِ قانون کے سراسر منافی ہے۔

اگرچہ متحدہ مجلس عمل موجودہ شکل میں حسبہ قانون کے حقیقی مقاصد پر شاید پوری طرح عمل نہ کر سکے تاہم پاکستان کے مذہبی رہنماؤں نے ۲۰۰۳ء کے مسودۂ قانون کی صورت میں اپنے قانونی اور معاشرتی نصب العین کی ایک جھلک پیش کر دی ہے۔ مزید یہ کہ مذہبی احتساب کا ادارہ قائم کر کے پاکستان کے نظامِ قانون میں فانے کا پتلا سِرا تو بہرحال ٹھونک دیا گیا ہے۔

۱۸ر نومبر ۲۰۰۶ء

❁

تانگہ آ گیا کچہریوں خالی

کوئی تین ہفتے سے پاکستان کے سیاسی حلقوں میں بحث جاری تھی کہ متحدہ مجلس عمل اپنے بلند آہنگ دعوؤں کے مطابق چھ دسمبر کو اسمبلیوں سے مستعفی ہو گی یا نہیں۔ بالآخر جمعرات کو مجلس کے دو روزہ طویل

Scanned with CamScanner

اجلاس کے بعد واضح ہوگیا کہ بجن شکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے۔ استعفوں کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

جمیعت علمائے اسلام کے فضل الرحمٰن تو خیر پہلے ہی سے حجتوں کی ایک فہرست پیش کر چکے تھے۔ مثال کے طور پر عورتوں اور اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستیں خالی نہ چھوڑنے کا عندیہ دیا جا چکا تھا۔ سینیٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں موجود رہنے کا دروازہ بھی کھلا رکھا گیا۔ جواز یہ کہ ایسا کرنے سے ملک میں بحران پیدا ہو جائے گا— گویا قومی اسمبلی سے استعفے دینے سے حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

مولانا فضل الرحمٰن کا ڈھنگ کچھ یوں تھا کہ اب بھی کوئی منا لے تو بگڑی نہیں ہے بات۔ دلچسپ ترین دلیل یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بینظیر بھٹو نے بھی استعفے نہ دینے کی سفارش کی ہے۔ پیپلز پارٹی نے پارلیمنٹ میں تحفظ حقوق نسواں بل کی کھلی حمایت کی تھی جس کے خلاف احتجاج کا یہ سب کھڑاگ کھڑا کیا گیا ہے۔

حسب توقع اردو اخبارات میں کوئی درجن بھر کالم ایسے شائع ہو چکے جن میں اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ حدود میں ترمیمی بل متعارف کرانے سے گلی کوچوں میں زنا کا لفظ اچھالا جا رہا ہے اور بے راہ روی پیدا ہو رہی ہے۔ گویا فروری ۱۹۷۹ء میں حدود قوانین نافذ کرنے سے لوگ زنا کا لفظ بھول گئے تھے۔

اس دلیل پر اعتراض کی گنجائش کم ہی ہے کہ خود اس مسودۂ قانون کے ضمن میں حکومت کے عزائم زیادہ شفاف نہیں۔ صدر مشرف کو امتیازی قوانین کی ایسی ہی فکر تھی تو یہ کام ان کے اقتدار کے ابتدائی برسوں میں کہیں زیادہ آسانی سے کیا جا سکتا تھا جب وہ مطلق اختیارات کے مالک تھے اور عوام ان کے کسی اقدام کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں رکھتے تھے۔ یہ تو ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد مغربی دنیا کو احساس ہوا ہے کہ امتیازی قوانین بالآخر کسی معاشرے کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔

بہر صورت حدود کا ترمیمی بل بذات خود ایک مثبت قدم ہے۔ اس سے ملک کی ہزاروں عورتوں کو بدترین ناانصافی کی کچھ صورتوں سے نجات ملے گی۔ پولیس کا یہ اختیار جاتا رہا کہ زنا بالجبر کی شکایت لے کر تھانے میں آنے والی مظلوم خاتون کو اعتراف زنا کے جرم میں دھر لیا جائے۔ زنا بالجبر کی شکایت کرنے والی خاتون کو چار کی بجائے دو گواہ پیش کرنا ہوں گے۔ اسی طرح جج کو صوابدیدی اختیار ہوگا کہ زنا بالرضا کی صورت میں حدود کی بجائے تعزیر کا قانون منطبق کرے۔ البتہ گواہی کے ضمن میں

Scanned with CamScanner

عورتوں اور غیر مسلم گواہوں کے بارے میں امتیاز قائم رکھا گیا ہے۔

حدود قوانین یا ان کی ترمیمی صورت مگے اسلام سے ہم آہنگ یا منافی ہونے کے بارے میں بھی خاصی گرد اڑائی گئی ہے۔ حالانکہ ۱۹۷۹ء میں نافذ کیے جانے والے حدود قوانین کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کے طویل مدت تک رکن رہنے والے ماہر قانون سید افضل حیدر کی گواہی خاصا وزن رکھتی ہے۔ سید افضل حیدر اپنی کتاب اسلامی نظریاتی کونسل: ارتقا اور کارکردگی میں بیان کرتے ہیں کہ پاکستان میں نافذ ہونے والے حدود قوانین کا مسودہ موتمر عالمِ اسلامی کے سربراہ معروف الدوالبی نے سعودی حکومت کی خصوصی ہدایت پر عربی زبان میں تیار کیا تھا۔ خود اسلامی نظریاتی کونسل کے جسٹس چیمہ (تب سربراہ) نے اپنی سالانہ رپورٹ ۷۹-۱۹۷۸ء میں تسلیم کیا ہے کہ ڈاکٹر معروف الدوالبی نے اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس کی صدارت کی تھی اور حدود قوانین کے مسودے پر کونسل کے ارکان کے اعتراضات کو 'حکام بالا' کا حوالہ دے کر رد کر دیا تھا۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر معروف جیسے غیر ملکی شہری کو ایک آئینی ادارے کے اجلاس کی صدارت کی اجازت کیسے ملی۔ سیاسی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ ایرانی انقلاب سے خوفزدہ سعودی حکومت پاکستانی معاشرے میں اپنی طرز کا اسلامی نمونہ نافذ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

ایم ایم اے میں قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمٰن کے اختلافات کا تجزیہ زیادہ مشکل نہیں۔ سوویت قبضے کے خلاف جہاد کے دنوں میں قاضی کا طوطی بولتا تھا۔ حکمت یار جیسے جہادیوں سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ پھر وقت نے کروٹ لی اور طالبان حکومت میں دیوبندی مدرسوں کے فارغ التحصیل طالبعلوں کی اکثریت کے بل پر مولانا فضل الرحمٰن کی بن آئی۔

پشاور کے تجزیہ نگار محمد رضا کے مطابق ۲۰۰۲ء میں ایم ایم اے کو ملنے والا ووٹ مذہبی ہونے سے زیادہ پشتون ووٹ تھا۔ انتخابی نتائج سے معلوم ہوا کہ ایم ایم اے کی انتخابی کامیابی تو دراصل جے یو آئی کی کامیابی تھی۔ انتخابی سطح پر غیر موثر آواز رکھنے والی جماعت اسلامی کو جمہوری سیاست میں اپنے امکانات مسدود نظر آنے لگے۔ یہیں سے قاضی حسین احمد زیادہ شعلہ بیان ہوتے گئے۔ قاضی حسین احمد سڑکوں پر نکل کر نعرے کی سیاست کرنے کے خواہش مند ہیں جبکہ مولانا فضل الرحمٰن سمجھتے ہیں کہ

Scanned with CamScanner

عوام کی موہوم مذہبی جذباتیت پر بھروسہ کرتے ہوئے دوصوبوں میں حکومت، قومی اسمبلی اور سینیٹ میں معتدبہ موجودگی نیز پارلیمانی حزب اختلاف کی قیادت سے ہاتھ کیوں دھوئے جائیں۔ قاضی صاحب شہری متوسط طبقے نیز طالبعلموں کے بل پر سڑکوں پر ملین مارچ نکالنا چاہتے ہیں جبکہ مولانا فضل الرحمٰن اپنے آزمودہ انتخابی مراکز کے بل پر جوڑ توڑ کی سیاست کرنا چاہتے ہیں۔ حافظ حسین احمد کا جمعیت علمائے اسلام سے خارج کیا جانا معمولی واقعہ نہیں۔

تحفظ حقوق نسواں بل کے ضمن میں سرکاری حلقوں کی صورت حال بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ سرکاری مسلم لیگ نے خاصے پس و پیش کے بعد مسودہ قانون کی حمایت تو کردی مگر رائے شماری کے موقع پر اس کے چھیالیس ارکان قومی اسمبلی سے غیر حاضر پائے گئے۔ مسلم لیگ (ق) کے سربراہ شجاعت حسین کی ان حلقوں سے شیفتگی کوئی راز نہیں جنھیں وہ 'علمائے کرام' قرار دیتے ہیں۔ پیپلز پارٹی اور متحدہ قومی تحریک نے تحفظ حقوق نسواں بل کی بھرپور حمایت کی مگر صدر پرویز مشرف جب عوامی اجتماعات میں عوام کو انتہا پسند حلقوں کی مخالفت پر اکساتے ہیں تو یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ پیپلز پارٹی کو بھی روشن خیالی کی سند عطا کرنے پر تیار ہیں یا نہیں۔

اس الجھی ہوئی صورت حال میں تین نکات بہر صورت واضح ہیں۔ قاضی حسین احمد اب مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ نواز شریف کی صدر پرویز مشرف کے ساتھ مصالحت کا کوئی امکان نہیں۔ اور تیسرا یہ کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ تعاون کی کوئی صورت گجرات کے چوہدری برادران کے لیے سیاسی خودکشی کے مترادف ہوگی۔

مذہبی سیاست کے دیرینہ محرم تنویر افضال کا تجزیہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں مولانا فضل الرحمٰن چوہدری شجاعت کے ساتھ کھڑے نظر آئیں گے اور قاضی صاحب کا ہاتھ نواز شریف کے ہاتھوں میں ہوگا۔ حالات میں کوئی غیر معمولی اور اچانک تبدیلی واقع نہیں ہوتی تو پیپلز پارٹی ایک سو سے اوپر نشستیں تو شاید جیت لے مگر اس کی پارلیمانی طاقت سے صدر پرویز مشرف کو کوئی خاص خدشہ نہیں ہوگا۔ مزید یہ کہ مذہبی قوتوں کے انتشار سے مغرب کی تالیف قلب کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ چت بھی میری ہے پٹ بھی میری ہے/ میں کہاں ہار ماننے والا۔

۸؍ دسمبر ۲۰۰۶ء

Scanned with CamScanner

❊

روشنی سے ڈرتے ہو؟

۱۹۷۱ء کا سال تھا۔ نو اور دس دسمبر کی درمیانی شب تھی۔ ڈھاکہ چھاؤنی کے ایک بلند و بالا دفتر کی خوشگوار حرارت میں تین پُر وقار چہرے چند کاغذ سامنے رکھے گہرے غور و فکر میں مصروف تھے۔

ان میں ایک لیفٹیننٹ جنرل عبداللہ نیازی تھے جن کے کندھوں پر پورے مشرقی محاذ کی ذمہ داری تھی۔ دوسرے صاحب میجر جنرل راؤ فرمان علی تھے جو بظاہر گورنر مالک کے سیاسی مشیر تھے مگر عملی طور پر صوبے کے انتظامی سربراہ سمجھے جاتے تھے۔ تیسرے افسر میجر جنرل جمشید تھے جو ڈھاکہ سیکٹر کے دفاع کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ کمرے میں دبے پاؤں چائے کے برتن لانے والے عملے کا خیال تھا کہ صاحب لوگ جنگ کی گمبھیر صورتِ حال پر مغز پاشی کر رہے ہیں، مگر ان اصحاب کے پیشِ نظر تو کہیں زیادہ اہم امور تھے۔ اس اجلاس میں بنگالی دانشوروں کی اس فہرست پر غور ہو رہا تھا جنھیں جنگ کا منطقی نتیجہ سامنے آنے سے پہلے ختم کرنا ضروری تھا۔ اردو کے جوانا مرگ شاعر محمد انور خالد کی ایک نظم کہتی ہے: ''ہجرتی! گھر چھوڑنے کے بھی کوئی آداب ہوتے ہیں''۔

دسمبر کا مہینہ سرد ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے برس میں یہ مہینہ معمول سے کچھ زیادہ ہی سرد تھا۔ پاکستان کے مشرقی حصے میں نو مہینے سے خانہ جنگی جاری تھی۔ لاکھوں شہری مارے جا چکے تھے۔ ایک کروڑ مہاجر سرحد پار کر کے بھارت جا بیٹھے تھے۔ عورتوں، بچوں، کسانوں اور تاجروں میں سے جس کے پاس لٹانے کو جو تھا، لٹ چکا تھا۔ گاؤں جل چکے تھے۔ شہر اور قصبے ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔

۳ر دسمبر سے پاکستان اور بھارت میں شروع ہونے والی کھلی جنگ اختتامی مرحلے میں تھی۔ مشرقی حصے کے عوام میں متحدہ پاکستان سے بدظنی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ مغربی پاکستان دادو لوہار (اشفاق احمد) کے خطبات اور ملکہ ترنم کے جوشیلے ترانوں میں مگن تھا۔ اندرونی اور بیرونی محاذوں پر ناکافی ہتھیاروں، نیم دلانہ قیادت، ناقص منصوبہ بندی اور غضب آلود عوام سے چوکھی لڑائی

لڑتے پاکستانی فوجی قدم بہ قدم پیچھے ہٹتے بالآخر ڈھاکہ تک محدود ہو چکے تھے۔ جنرل گندھراؤ سنگھ ناگرہ بوڑھی گنگا کے میر پور پل پر آن بیٹھا تھا۔

یہ سوال دلچسپ ہے کہ ایسے میں جب جنرلوں کو ڈھاکہ کے دفاع کی فکر ہونا چاہیے تھی وہ اساتذہ، سائنسدانوں، صحافیوں، تاریخ دانوں، شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے قتل کی فکر میں تھے۔ تاہم اس کا جواب کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ ایوب خان نے بھی تو رائٹرز گلڈ بنائی تھی جس کے طفیل شاعروں، ادیبوں کو سلہٹ کا سبزہ اور چٹا گانگ کی پہاڑیاں دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ضیاء الحق بھی تو دانشوروں کو سیم اور تھور قرار دے کر ان پر پانی، ہوا اور چاندنی حرام کرنے کی وعید سنایا کرتے تھے۔ بھٹو صاحب سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے تو انھوں نے روزنامہ ڈان کے مدیر کو چہار چشمے کا خطاب دیا تھا۔

فوج جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو اس کا مقصد عوام کے امکان کو بیدار کر کے ترقی کی راہیں کھولنا نہیں ہوتا۔ ہر فوجی حکمران کا خواب ایک ایسی چراگاہ ہے جہاں عوام کے نام پر بہت سی بھیڑ بکریاں اس کے دماغ عالی پر اترنے والی ہر پھلجھڑی کو حکم خداوندی سمجھیں۔ دانشور وہ آوازہ انکار ہے جو آمر کا خواب کرکرا کر دیتا ہے۔

آمر بڑی عرق ریزی سے اور اپنے چنیدہ حواریوں کی شبانہ روز محنت سے ایک آئین گھڑتا ہے؛ ادھر کوئی بے ننگ و نام حبیب جالب پکار اٹھتا ہے: ''ایسے دستور کو، صبح بے نور کو/ میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا''۔ حکمران صدارتی نظام کے حق میں قائداعظم کی ڈائریاں دریافت کرتا ہے تو ڈاکٹر مبارک علی نامی کوئی مورخ قلم گھسیٹ کر قوم کو بتانے لگتا ہے کہ قائداعظم نے تو کبھی ڈائری لکھی ہی نہیں تھی۔ حکمران اخبار والوں کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر وسیع تر قومی مفاد میں 'نظریہ پاکستان' ایجاد کرتا ہے تو ڈاکٹر مہدی حسن نامی کوئی استاد اپنی پاٹ دار آواز میں قائداعظم کی کوئی گمنام تقریر دہرانے لگتا ہے جو انھوں نے کہیں ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو کسی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کی تھی۔

دانشور کو اس کے علم کا کیڑا، تحقیق کی عادت اور بصیرت کا تقاضا کاٹتا رہتا ہے۔ اس کی دلیل بازی کی علت سے فوجی حکمران کی جان ضیق میں آجاتی ہے۔ ہر عہد میں الطاف گوہر، میجر ابن الحسن، نوابزادہ شیر علی خاں، راجہ ظفر الحق، جام صادق علی اور ڈاکٹر شیر افگن جیسے محب وطن جابر سلطان کو یہ کلمہ

حق سناتے رہتے ہیں کہ اگر مٹھی بھر دانشوروں کا ٹینٹوا دبا دیا جائے، صحافیوں کو گرمی میں میانوالی اور سردی میں مظفر آباد کی سیر کرائی جائے، شاعروں کی شراب بند کر دی جائے، یونیورسٹیوں کو حوالداروں کے حوالے کر دیا جائے تو عوام بہتر طور پر برکاتِ حکومتِ خود آرا سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ منعم خان اور ملک امیر محمد خان جیسے شہریاروں کا نسخہ یہ ہوتا ہے کہ حالات درست کرنے کی بجائے حالات کی خرابی کی نشاندہی کرنے والوں کا منہ بند کر دیا جائے۔ ان خیر اندیشوں کی تقریرِ پُر تاثیر میں ایسی لذت ہوتی ہے کہ رفتہ رفتہ خود حکمران کو بھی یقین ہونے لگتا ہے کہ دانشور ملک دشمن، بداندیش نیز خونی پیچش میں مبتلا کسی گروہ کا نام ہے۔ جس کی بیخ کنی ہی میں قوم کی فلاح ہے۔

متحدہ پاکستان میں اردو، اسلام اور بھارت دشمنی کی تین پہیوں والی سائیکل چلانے والے ہمیشہ یہی کہتے اور سمجھتے رہے کہ مشرقی پاکستان کی بیگانگی کا اصل سبب معاشی ناہمواری اور سیاسی استحصال نہیں بلکہ وہاں کا دانشور طبقہ بالخصوص ہندو اساتذہ ہیں جو عوام میں الٹی سیدھی باتیں پھیلاتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ بنگالی عوام کے سیاسی شعور کی بیداری میں وہاں کے روشن خیال اور جمہوریت پسند دانشوروں نے بنیادی کردار ادا کیا تھا اور یہ امر راؤ فرمان علی جیسے فوجی افسروں سے مخفی نہیں تھا جو قریب ایک عشرے سے مشرقی پاکستان کے جملہ امور چلا رہے تھے۔

ربع صدی کی سیاسی کشمکش کے بعد جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی نوشتۂ دیوار نظر آنے لگی تو مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی افسران نے خالص جاگیردارانہ انداز میں 'دشمنی' کو آخری دم تک نبھانے کا فیصلہ کیا۔ منتخب یونیورسٹی اساتذہ کے قتل کا سلسلہ تو ۱۹۶۹ء ہی سے شروع ہو چکا تھا جب راجشاہی یونیورسٹی میں کیمسٹری کے استاد شمس الضحیٰ کو دن دہاڑے قتل کیا گیا تھا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی قیامت خیز رات کے مقتولوں میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ بھی شامل تھے۔

عوامی لیگ کی منتخب قیادت کے بھارت جانے کے بعد منعقد ہونے والے ضمنی انتخابات میں جماعت اسلامی فوجی قیادت کے بہت قریب آ گئی۔ یوں بھی جماعت اسلامی کے لیے عوامی لیگ کی غیر مذہبی سیاست نظریاتی اعتبار سے ناقابلِ برداشت تھی۔ مکتی باہنی کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی انتظامیہ نے جماعت اسلامی کو اپنا مسلح بازو تشکیل دینے کی ترغیب دی۔ ابتدائی طور پر تو اسے 'البدر' ہی کا نام دیا گیا (۲۰ برس بعد کشمیر جہاد میں بھی جماعت اسلامی نے اپنی پروردہ جہادی تنظیم کے لیے 'البدر'

Scanned with CamScanner

ہی کا نام چنا) تاہم صدیق سالک میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا میں لکھتے ہیں کہ بعدازاں اسی تنظیم کو' الشمس' بھی کہا جانے لگا تا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی وسیع مخالفت کا تاثر پیدا کیا جا سکے۔ جماعت اسلامی کے رضا کار کتی بانہی جیسی مسلح تنظیم کا تو کیا مقابلہ کرتے جس کے ارکان بھارت سے باقاعدہ فوجی تربیت پا چکے تھے، البتہ البدر اور الشمس کے ارکان کو غیر مسلح مگر روشن خیال دانشوروں پر دل کے ارمان نکالنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔

البدر کے رہنماؤں میں مولوی غلام اعظم، مولوی عبدالمنان اور طالبعلم اشرف الزماں کے نام نمایاں ہیں۔ البدر کو فوجی تربیت کے لیے باقاعدہ سرکاری تعلیمی ادارے مہیا کیے گئے۔ سیکولر دانشوروں کو جسمانی طور پر ختم کرنے کے اس سلسلے کا ہولناک ترین واقعہ پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے سے صرف دو روز قبل ۱۴ ردسمبر ۱۹۷۱ء کو پیش آیا۔ واقعات کے مطابق البدر کے ارکان نے ایک باقاعدہ فہرست کے مطابق آدھی رات کو ڈھاکہ کے دو درجن سے زیادہ چیدہ چیدہ دانشوروں کو اغوا کیا۔ ان میں سے بیشتر اساتذہ یا تو اپنے شعبوں کے سربراہ تھے یا علمی اور ادبی حلقوں میں نہایت نمایاں مقام رکھتے تھے۔ انھیں مختلف مقامات پر رکھ کر شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر ریئر بازار اور میرپور نامی دو مقامات پر انھیں بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۱۷ردسمبر کو ان کی مسخ شدہ لاشیں کچے بند کے قریب پایاب پانی سے برآمد ہوئیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور سر میں گولی کا نشان تھا۔ ممتاز ماہرِ امراض چشم ڈاکٹر فضل ربی کی آنکھیں نکالی جا چکی تھیں۔ شہید اللہ قیصر ادیب تھے، ان کے ہاتھ قلم کیے جا چکے تھے۔

اس موقعے پر جب جنگ کا حتمی نتیجہ سامنے آچکا تھا، متحدہ پاکستان کی حمایت یا مخالفت بے معنی ہو چکی تھیں۔ اس مرحلے پر کسی سیاسی مخالف کو قتل کرنے سے کوئی سیاسی یا جنگی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ حمود الرحمن کمیشن کے سامنے لیفٹیننٹ جنرل عبداللہ نیازی، میجر جنرل راؤ فرمان علی اور میجر جنرل جمشید، تینوں نے اس نوعیت کی فہرست سازی کا اقرار ضرور کیا مگر فوج کے اس کارروائی میں ملوث ہونے سے انکار کیا۔ شواہد سے بڑی حد تک اس موقف کی تصدیق ہوتی تھی مگر جنگ کے بعد بھارتی فوج کو جنرل فرمان کی میز سے ایک ڈائری ملی جس میں خود جنرل فرمان کے ہاتھ سے ایک فہرست مندرج تھی۔ ان ناموں میں سے چودہ افراد ۱۴ردسمبر کی رات مارے گئے۔ الطاف گوہر راوی تھے کہ

Scanned with CamScanner

انھوں نے ایک مشترکہ دوست کے توسط سے راؤ فرمان کو اپنے عزیز دوست ثناء الحق کی جان بخشی کی سفارش کی تھی۔ راؤ فرمان کی فہرست میں ثناء الحق واحد خوش نصیب تھے جو ۱۴ر دسمبر کے بعد بھی زندہ رہے۔

امریکی ہفت روزہ ٹائم نے ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں پہلی بار اس واقعے سے پردہ اٹھایا، لیکن زبل کمیشن سے لے کر حکومتی تحقیق تک اس واقعے پر کوئی قانونی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ مولوی غلام اعظم ۱۹۷۸ء میں پاکستان سے بنگلہ دیش واپس چلے گئے تھے اور ۱۹۹۱ء سے وہاں جماعت اسلامی کے امیر ہیں۔ مولوی عبدالمنان دانش کے اس قتل میں ذاتی طور پر شریک تھے، وہ ایک سے زیادہ مرتبہ وزیر کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ اشرف الزماں کی ڈائری میں ۱۴ر دسمبر کے آٹھ مقتول دانشوروں کے نام پتے درج تھے۔ اشرف اب امریکہ میں ایک اسلامی مرکز چلاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ البدر کے بیشتر سابق ارکان آجکل برطانیہ میں مسجدوں کے پیش امام ہیں۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد متعدد مواقع پر اپنی مخصوص گھن گرج کے ساتھ انصاف کے بلند بانگ دعوے کرنے والے شیخ مجیب الرحمٰن نے ۱۹۷۳ء میں تمام بنگالی نژاد جنگی مجرموں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ بنگلہ بندھو کی اس قلابازی کے متعدد پہلو ہیں۔ بنگلہ دیش کی جنگِ آزادی میں مرنے والے قریب قریب تمام دانشور روشن خیال ہونے کے علاوہ بائیں بازو کے رجحانات بھی رکھتے تھے۔ عوامی لیگ کے آئندہ طرزِ حکومت میں بلند آہنگ اور عوام دوست دانشوروں کے لیے کہاں جگہ تھی۔ دوسرے بھارت کو یہ کب پسند تھا کہ بنگلہ دیش کے حریت پسندوں سے نکسل باڑی تحریک تقویت پائے۔ اور تیسرے یہ کہ امریکی حکام کو پیکنگ نواز دانشور کیسے ہضم ہوتے۔ سو یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا۔

۱۷ر دسمبر ۲۰۰۶ء

❋

Scanned with CamScanner

بہادر آدمی کی موت

ہماچل اور جموں کی درمیانی سرحد پہ شوالک کے پہاڑی سلسلے سے ایک دریا نکلتا تھا جو پنجاب میں گورداسپور اور ہوشیار پور کے اضلاع کے بیچوں بیچ خطِ تقسیم کی طرح اترتا، ستلج تک پہنچتا تھا۔ یہ دریاے بیاس تھا، پنجاب کا پانچواں دریا۔ اسی دریا کے مشرقی کنارے پر ہوشیار پور کے موضع خانپور میں منیر نیازی پیدا ہوا جسے بیسویں صدی میں اقبال، راشد، فیض اور میراجی کے بعد اردو شاعری کا پانچواں دریا سمجھا گیا۔ منیر نیازی ۲۷ دسمبر ۲۰۰۶ء کی شام لاہور کی مٹی میں اتر گئے۔ سب دریا کہیں نہ کہیں اتر جاتے ہیں۔

دریا اپنے پیچھے 'اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور' ہی نہیں، بہت سی زرخیز مٹی بھی چھوڑ جاتے ہیں جس میں پھولوں سے لدی ڈالیوں پہ کوئلیں کوکتی ہیں، اس مٹی میں گھنے درختوں کے جنگل بھی پروان چڑھتے ہیں جن کی جانب سے اُمڈتی گھٹائیں دیکھ کر لڑکیاں خوش ہوتی ہیں۔ منیر نیازی نے اپنے پیچھے اردو کے تیرہ اور پنجابی کے چار مشعل مجموعے چھوڑے ہیں جن کی روشنی میں اردو اور پنجابی شاعری بہت دیر تک اور بہت دور تک چلتی رہے گی۔

اشفاق احمد اور منیر نیازی کی دوستی بھی رنگِ گل اور بوے گل کا قصہ ٹھہری۔ دونوں کی زندگی اور موت کا گراف کم و بیش ساتھ ساتھ چلا؛ ایک آدھ سال کا فرق بیچ میں تھا۔ معاشرتی پس منظر بھی کچھ ایسا مختلف نہیں تھا۔ دونوں کی ذات میں ذہانت سے پھوٹتی شرارت اور شرارت کی اوٹ سے جھانکتی بے پناہ خود اعتمادی جیسی صفات مشترک تھیں۔ کس کو خبر کہ ذات کے تالاب میں کون سا کنکر کہاں ارتعاش پیدا کرتا ہے کہ آخری تصویر کے خدوخال اتنے مختلف اترتے ہیں۔ ایک نے روایت کے استھان پر دھونی رمائی، دوسرا شاہ حسین اور حافظ کے رنگ میں ڈوبا رخصت ہوا، 'زباں پہ حمد لیے، ہاتھ میں شراب لیے'۔

۱۹۵۰ء میں منیر نے لاہور کے دیال سنگھ کالج سے گریجویشن کی۔ تب اس درسگاہ کا پرنسپل وہ دیالو تھا جسے سید عابد علی عابد کہتے تھے۔ اسی برس لاہور کے ادبی حلقوں میں منیر کی رونمائی ہوئی۔ بہت قریب کی یہ آواز ساہیوال کے قصبے سے سات رنگ نامی ہفت روزے کی صورت درا ہوئی تھی۔ یہ

شاعری کا ہے کو تھی، یہ تو ایک خواب کے دھندلانے اور بکھر جانے کی حکایت تھی۔ نوجوان شاعر نے تہذیب کے خواب کو متروکہ جائیدادوں کی ہڑ بونگ میں پریشان ہوتے دیکھا تو اسے اپنی ذات کی پناہ میں لے لیا۔ شہر میں ریاکاری کی وبا پھیل جائے تو شاعر کے پاس دان کرنے کو اپنی ذات کے سوا کیا بچتا ہے۔ منیر نے اس اجتماعی دکھ کو درویش کے کمبل کی طرح کاندھے پر رکھا اور لاہور کی گلیوں میں نکل آیا۔

ثقہ ادبی حلقوں میں چڑیلوں اور جنوں میں گھرے اس شہر کا بیان بڑی حیرت سے سنا گیا جس کے ہر مکان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں، ہر دروازے کی اوٹ میں کوئی خون آشام عورت تھی، ہر گلی کے نکڑ پہ کوئی مکروہ شخص کھڑا تھا۔ قدروں کے انحطاط کا ماتم تو چہار سو تھا، منزلوں کا نشاں کھونے کی کسک بھی محسوس کی جا رہی تھی، مگر شہر پر گزرنے والی اس آفت کی ہو بہو تصویر کب کسی نے کھینچی تھی۔ یہ ساونت تو شہر کے چوراہے میں تلوار علم کیے کھڑا تھا۔ بودلیر اور میلارمے کو بعد میں آنے والوں نے بہت پڑھا مگر وہ دوآبہ بست کے کائی لگے مندروں میں آرتی اتارتی گندھار ناریوں کی شبیہ کہاں سے لاتے جن سے دوری نے منیر کا دل کرب سے بھر دیا تھا۔ شاعر نے اپنی پاکوبی میں شہر آشوب پہ واسوخت کے رنگ چھوڑ دیے تھے۔

لاہور کے ادبی طیف میں ایک کنارے پر فیض تھا اور دوسرے سرے پر ناصر۔ اپنے عصر کا پورا شعور مگر لہجہ مڑ مڑ کے رفتگی سے آنکھ ملاتا ہوا۔ ایسے میں منیر کی آواز بہت چونکا دینے والی تھی۔ منفرد علامتیں، انوکھی تصویریں، بیان میں وارفتگی اور لحن میں نغمگی۔ فیض نے تقسیم کو داغ داغ اُجالے کا نام دیا۔ ناصر نے اسے ہجرت جانا۔ سلمان رشدی نے اسے نیم شب کا استعارہ دیا۔ منیر نیازی نے دو زمانوں اور دو زمینوں کو قطع کرتی اس لکیر کو شام کی اداسی بخشی۔

ہوا کا رخ تیزی سے بدل رہا تھا۔ اب ادب کے پھول اٹھنے میں زیادہ دیر نہیں تھی مگر منیر نے شعر کو اپنی کل وقتی مصروفیت ٹھہرا لیا تھا۔ کچھ دن کے لیے فلم نگر بھی گئے۔ مقبول گیت لکھے مگر جلد ہی بے وفا کے شہر سے نکل آئے۔ سنہ ساٹھ میں اشاعتی ادارہ ''المثال'' قائم کیا۔ اس ادارے کی طرف سے راشد کے مجموعے خطِ نسخ میں شائع ہوئے۔ ان کتابوں کے طباعتی حسن سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیر کو حسن کے ہر روپ سے شیفتگی تھی۔ اسے پھولوں، پرندوں اور بادلوں سے محبت تھی اور اسے محبتوں کے بیان کا ہنر آتا تھا۔

Scanned with CamScanner

جب وہ درسگاہوں میں پرندوں کے پر پرواز پہ گرہ باندھنے والوں کو ادب کی اقلیم میں دندناتے دیکھتا تھا تو انھیں مکروہ قرار دیتا تھا۔ انتظار حسین کے ناول بستی میں کرامت اور افضال کے کرداروں کو اپنے دوٹوک جملوں سے نیست و نابود کرنے والا عرفان کا کردار منیر نیازی ہی کا عکس ہے۔ منیر کے لہجے میں ایک بہادر شخص کی للکار کے ساتھ جھنجھلاہٹ بھی شامل ہونے لگی۔ وہ خود کلامی کے ڈھنگ میں تجویز کرتا تھا کہ 'اس شہرِ سنگ دل کو جلا دینا چاہیے'۔ مگر اس کی تجویز تو یہ بھی تھی کہ 'شام آئی ہے شراب تیز پینا چاہیے'۔

منیر نے تعزز فروشوں کی ملامت سہی، اپنے خواب کو شعر میں حصار کیا اور جیتا رہا۔ اس کے شعر میں موجود اور وجود کے امکان نت نئے زاویوں سے حسن کی تحسین بُنتے رہے۔ اس کی فنی مہارت پر بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن اس کی یہی دین کیا کم ہے کہ نظم ہو یا غزل، اس کی شاعری میں سونگھنے، چکھنے، سننے اور چھونے کی حسیں یوں ایک دوسرے کو جگاتی چلی جاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رنگ خوشبوؤں کو پکارتے ہیں اور خوشبوئیں آوازوں کے تعاقب میں ہیں۔ اردو شعر میں آنکھوں دیکھی تصویر تو بنتی آئی ہے، یوں پڑھنے والے کی سب حسوں سے ہمکنار ہوتی بوندا باندی کہاں تھی جو شاعری کے 'صحن کو چمکا گئی، بیلوں کو گیلا کر گئی'۔

منیر کی خوش قسمتی تھی کہ اسے پڑھنے والوں تک بے پناہ رسائی نصیب ہوئی۔ غزل لکھی تو زباں زدِ عام، گیت لکھا تو بول نگر کے کونے کونے میں یوں پھیلے جیسے چاوڑی میں داغ کی غزل۔ کوئی برخود غلط شاعرہ ہو یا رسالے کا مدیر شہیر، منیر کی منجنیق کا فقرہ جس پر چست ہوا، وہ پھر زمین سے اٹھ نہیں پایا۔

منیر نے طویل زندگی پائی مگر وہ اپنے شہر سے لاتعلق نہیں ہوا، سو اس نے غیر متعلق ہونے کا عذاب نہیں دیکھا۔ بڑھتی ہوئی عمر نے صرف اتنا کیا کہ اب وہ محبت کرنے والوں کے بیچ اس شان سے رونق دیتا تھا جیسے قبیلے کا بوڑھا جنگجو اپنے لہجے کی توانائی اور داستان کی طلسمی کشش سے سننے والوں کی حیرت کو مہمیز کرتا ہے۔ 'گلیاں اجڑ گئی تھیں مگر پاسباں تو تھا'۔ اب اردو شعر کے بچوں کو چوتھے کھونٹ جانے کی چتاؤنی کون دے گا؟

۲۸ر دسمبر ۲۰۰۶ء

Scanned with CamScanner

❊

محتسب کی خیر ہو...

گوجرانوالہ میں سماجی بہبود کی صوبائی وزیر ظل ہما کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مبینہ قاتل مولوی سرور ایک مذہبی جنونی ہے جو قبل ازیں گوجرانوالہ اور لاہور میں چار خواتین کو قتل کر چکا ہے۔ اسے موقعے ہی پر گرفتار کر لیا گیا۔ مبینہ قاتل کے شخصی پس منظر، وقوعہ کی حساس نوعیت اور گوجرانوالہ کے مخصوص سیاسی اور سماجی خدوخال سے قطع نظر اس واردات سے پاکستان میں مذہب کے نام پر ریاست کی عملداری پر ہونے والے حملوں کے حوالے سے متعدد قابل غور سوالات پیدا ہوئے ہیں۔

ملزم مولوی سرور کا کہنا ہے کہ اس نے ظل ہما کو اس لیے قتل کیا کہ وہ عورت کی حکمرانی کے خلاف ہے۔ اس نے مقتولہ کے لباس کو بھی قابل اعتراض قرار دیا ہے۔ ۳۷ سالہ خاتون سیاست دان درجنوں شہریوں کی موجودگی میں عوامی خدمت کی سرگرمی میں مصروف تھیں؛ ان کے لباس پر اعتراض کو لغو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

عورت کی حکمرانی پر اعتراض سے اشارہ ملتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں فاطمہ جناح اور ۱۹۸۸ء میں بے نظیر بھٹو کے ضمن میں عورت کی حکمرانی پر ہونے والی غیر جمہوری بحث 'سربراہِ مملکت' اور 'سربراہِ حکومت' میں فرق جیسی نکتہ آفرینیوں سے آگے بڑھ کر صوبائی وزارت کے درجے تک اتر آئی ہے۔ خدائی فوجدار مولوی سرور کا کہنا ہے کہ وہ ۲۰۰۵ء میں میراتھن دوڑ میں شریک بچیوں پر حملہ کرنے کے لیے بھی پستول لے کر پہنچا تھا کیونکہ مسجدوں کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان کیا گیا تھا کہ عورتیں نیکر پہن کر دوڑ میں شریک ہوں گی۔ تاہم وہ دوڑ میں شامل لڑکیوں کو پورے لباس میں ملبوس دیکھ کر حملے سے باز رہا۔

پاکستان میں مساجد کے لاؤڈ سپیکر اور امن وامان کی صورتِ حال میں گہرا تعلق ہے۔ سانگلہ ہل میں اقلیتوں کے خلاف فساد کو ہوا دینا ہو، ننکانہ صاحب میں عوام کو کسی مبینہ ملزم کے گھر پر چڑھ دوڑنے کی ترغیب دینا ہو یا گوجرانوالہ میں میراتھن ریس کے بارے میں گمراہ کن اطلاعات پہنچانا ہو،

مجرمانہ اشتعال انگیزی کے لیے مساجد کے لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے پر شاذ ہی گرفت ہوتی ہے۔

گوجرانوالہ میں مذکورہ میراتھن دوڑ کے انعقاد میں مقتولہ سیاستدان ظل ہما نے سرگرم کردار ادا کیا تھا جبکہ گوجرانوالہ سے مجلس عمل کے رُکنِ قومی اسمبلی مولوی حمید اللہ اس موقع پر ہنگامہ آرائی کرنے والوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ گوجرانوالہ شہر کی دیواروں پر حالیہ ضمنی انتخاب کے پوسٹر اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں جن پر مولوی حمید اللہ کو ''فاتح میراتھن ریس'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ ظل ہما ان دنوں گوجرانوالہ میں ایک اور میراتھن ریس منعقد کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں اور اس کا باقاعدہ اعلان کر چکی تھیں۔

مولوی سرور نے ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں چار خواتین کو قتل کیا جنھیں وہ اپنی دانست میں غیر اخلاقی حرکتوں کی مرتکب سمجھتا تھا۔ اس نے پولیس کے سامنے دفعہ ۱۱۶ کے تحت بیان دیتے ہوئے قتل کا اعتراف کیا، عدالت میں اقبالِ جرم کیا، حتیٰ کہ ایک نجی ٹیلی وژن پر انٹرویو میں قتل کی وارداتوں کی باقاعدہ تفصیل بیان کی۔ اخباری اطلاعات اور عدالتی ذرائع کے مطابق اس کے بری ہونے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ان مقدمات میں جو گواہ پیش ہوئے تھے، انھیں مولوی سرور کے پشتی بان عناصر نے ڈرا دھمکا کر یا مالی لالچ دے کر اپنے بیانات سے منحرف ہونے پر مجبور کر دیا۔ قتل کی حالیہ واردات میں ظل ہما کی سیاسی شخصیت کے باعث اب یہ ممکن نہیں ہوگا کہ مولوی سرور کی گزشتہ کشتگانِ ستم کی طرح اخلاق باختگی کا فتویٰ لگا کر معاملہ ختم کر دیا جائے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں مولوی سرور کی قانونی پیروی اور مالی سرپرستی کرنے والے عناصر کون تھے۔

مولوی سرور کے پشتی بانوں کی نشان دہی اس لیے بھی ضروری ہے کہ مولوی سرور کا نادیدہ عناصر کی سرپرستی کے بل پر متعدد قتل کر کے بری ہونا محض اتفاق نہیں۔ عورتوں پر تشدد کرنے والوں کی سیاسی اور مالی پشت پناہی کی ایک واضح روایت موجود ہے۔ ۱۹۹۳ء میں بجلی کے جھٹکوں سے اپنی بیوی کے جسم کو وحشیانہ طور پر تباہ کرنے والے راولپنڈی کے پیش امام قاری شریف کو صدر محمد رفیق تارڑ نے دسمبر ۲۰۰۰ء میں معافی دی تھی اور اس کا عدالتی جرمانہ قرشی فاؤنڈیشن نے ادا کر کے اسے تبلیغ پر بھیجا تھا۔

پاکستان میں انصاف اور قانونی اقدار کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی بھی واردات کا نشانہ بننے والی خواتین کی کردارکشی ایک ایسا غیر شائستہ رویہ ہے جو ملک کے اعلیٰ ترین

Scanned with CamScanner

عہدیداروں سے لے کر تھانیدار تک پہنچتا ہے۔ اس صورتِ حال میں مولوی سرور جیسے نیم خواندہ اور کندۂ ناتراش افراد کا متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔ ظلِ ہما کے قتل سے اگلے روز جمہور دشمنی کی طویل روایت رکھنے والے ایک اخبار (روزنامہ نوائے وقت) نے دل آزار حاشیہ آرائی کرتے ہوئے لکھا: ''گوجرانوالہ میں ایک روشن خیالی ماری گئی''۔ چھ برس سے دہشت گردی کی تعریف پر متفق نہ ہونے والوں نے روشن خیالی کی کیسی سادہ تعریف (یعنی عورت) دریافت کی ہے۔

قانون ساز اداروں میں قانونی اور سیاسی عمل کی تفہیم کا یہ عالم ہے کہ بلوچستان سے تعلق رکھنے والی مسلم لیگی سینیٹر کلثوم پروین نے پارلیمنٹ میں مطالبہ کیا ہے کہ ''مولوی سرور کی کسی عزیز خاتون کو ظلِ ہما کے قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے۔'' یہ وہی سینیٹر ہیں جنھوں نے جون ۲۰۰۵ء میں مختار مائی کو تجویز کیا تھا کہ وہ ذرائع ابلاغ میں شور وغل کی بجائے اللہ سے انصاف کی طلب گار ہو۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں درجنوں خواتین مخصوص نشستوں پر مذہبی جماعتوں کی نمائندگی کر رہی ہیں لیکن دریائے کابل سے لے کر دجلہ کے کناروں تک عصمتوں کی دہائی دینے والوں نے خاتون سیاستدان ظلِ ہما کے قتل کی مذمت مناسب نہیں سمجھی۔ ستم ظریفی یہ کہ پارلیمنٹ میں ان حلقوں سے سنائی دینے والی واحد آواز یہ تھی کہ ملزم سرور کو مولوی نہ کہا جائے۔ ابراہیم جلیس زندہ ہوتے تو انھوں نے لکھا ہوتا: ''گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ''۔

ظلِ ہما کی موت تو سیاسی قتل بھی نہیں، محض پاکستان کے سماجی انحطاط کا ایک اشارہ ہے، اور اس کی جائے وقوع گوجرانوالہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ پنجاب کے کاروباری شہروں میں سب سے کم ٹیکس ادا کرنے والے اس شہر نے گزشتہ پندرہ سالہ جہاد میں سب سے زیادہ جنازے وصول کیے ہیں۔ پاکستان کے پانچ بڑے شہروں میں عام تعلیمی اداروں اور مذہبی مدرسوں کی تعداد میں قریب ترین تناسب گوجرانوالہ میں پایا جاتا ہے۔ توہین رسالت کے معروف ترین واقعات، خواہ سلامت مسیح کیس میں ناخواندہ بچے پر توہین آمیز عبارت لکھنے کا الزام ہو یا حافظ فاروق سجاد کو زندہ جلانے کا واقعہ ہو، گوجرانوالہ ہی میں پیش آئے تھے۔ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں گوجرانوالہ پنجاب کا واحد ضلع تھا جہاں ایم ایم اے کے دو امیدوار کامیاب ہوئے۔

عوامی نیشنل پارٹی سے تعلق رکھنے والے سیاسی مبصر طارق خان کا کہنا ہے کہ ۲۰۰۷ء میں عام

Scanned with CamScanner

انتخابات کے پیش نظر ایک خاتون سیاسی رہنما کا یہ قتل آئندہ انتخابی مہم میں غیر مذہبی اور معروف جمہوری قوتوں کو خوفزدہ کرنے کی سوچی سمجھی کوشش بھی ہو سکتی ہے۔

۲۴ رفروری ۲۰۰۷ء

❋

...جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں

سنہ ۱۹۵۸ء، اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ایوب خان کوئی دس برس سے پس پردہ بندوق چھپائے کھڑے تھے۔ بالآخر انھوں نے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس دوران سیاسی قیادت کی کم نظری اور نااہلی پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ اسمبلیوں کی برطرفی، تدوین آئین میں تاخیر، انتخابات میں دھاندلی، نیز انتظامی اہلکاروں کے ہاتھوں مقبول رہنماؤں کی تذلیل تک، سیاسی عمل کی کوئی ممکنہ بدنمائی ایسی نہیں تھی جو عوام نے دیکھ نہ لی ہو۔ اِس خطے میں عوام کا سیاسی شعور پہلے ہی کچھ ایسا توانا نہیں تھا، اب بالکل مفلوج ہو چکا تھا۔

نالیوں پر چونا گرایا جا رہا تھا، گوشت اور دودھ کی دکانوں پر جالیاں لگائی جا رہی تھیں۔ امرت دھارا نسخوں اور معجزاتی خوش فہمیوں کی دنیا میں رہنے والوں کے لیے مارشل لا گویا بجلی کا علاج تھا لیکن اس موڑ پر کہیں کہیں کوئی صاحبِ نظر سر نیہوڑائے لکھتا تھا:

اس دور کی بساط پر ہر شہ کو مات ہے
گھبرایئے نہ دیکھ کے پیدل گھرا ہوا

یہ انجم رومانی تھے، سلطان پور لودھی کے مرنجاں مرنج مہاجر۔ ن م راشد نے لکھا، ”مجھے فجر آئی ہے شہر میں، مگر آج شہر خموش ہے“۔ ناصر کاظمی کان لگائے غور سے سن رہا تھا، ”اِن سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے“، مگر قوم کے غالب ردعمل کی عکاسی ساغر صدیقی ہی نے کی:

Scanned with CamScanner

ہم نے صبر کیا، ہم کو ایوب ملا

ٹھیک چالیس برس بعد ۱۹۹۹ء میں خاکی پوش بیرکوں سے نکل کر وزیر اعظم ہاؤس پہنچے تو پذیرائی کا رنگ کچھ مختلف نہیں تھا۔ جمہوریت مانگنے والوں پر زبانِ طعن دراز کرنا آسان تھا۔

ضیاء الحق کی یبوست زدہ مذہبیت کے ستائے ہوئے روشن خیال تو دو کتوں کی شبیہ دیکھ کر ہی نہال ہو گئے۔ کسی کو پندرھویں آئینی ترمیم سے نجات کی خوشی تھی تو کوئی صاحبِ کارگل سے معجزوں کی توقع رکھتا تھا۔ کم ہی کسی کو یہ خبر تھی کہ گلی سے باہر تمام منظر بدل گئے تھے۔ اب عالمی حالات سیٹو اور سینٹو والے تھے اور نہ افغان جہاد کی انگیٹھی میں چنگاری باقی تھی۔ بس اس کی راکھ کے ذرے تھے جو بین الاقوامی سرحدوں اور ریاستی تقاضوں سے بے نیاز گلی میں اڑ رہے تھے۔

پرویز مشرف کے اقتدار کا آغاز بہت مختلف حالات میں ہوا۔ ۱۹۹۸ء کے جہادی فتوے، ۱۹۹۹ء میں قندھار کے طیارہ ہائی جیکنگ اور گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد نئے فوجی بندوبست کی مجبوریاں کھل کر سامنے آ گئیں۔ ایک طرف بیس برس سے نادیدہ کارروائیوں کی آڑ میں مالی مفادات اور فیصلہ کن اختیارات کے مزے لوٹنے والے تھے تو دوسری طرف پاکستان کی عسکری قوتوں کا وہ بالائی حصہ تھا جو اقتدار کی چوٹی پر تو پہنچ گیا تھا مگر اسے اپنی بقا کے لیے ممکن کی حدود کو مدنظر رکھنا تھا۔

سیاسی قیادت کو درونِ خانہ سازشوں سے مفلوج کرنا ایک بات ہے لیکن خود اقتدار کا بلاشرکت غیرے مالک ہونے کے بعد قومی اور بین الاقوامی نزاکتوں کی پھسلواں پگڈنڈیوں پر آگے بڑھنا احتیاط کے مختلف تقاضے رکھتا ہے۔ یہیں سے ہیئتِ مقتدرہ کے دو حصوں میں بنیادی اور ناقابلِ تصفیہ تضاد پیدا ہوا۔ برسرِ اقتدار گروہ فوج کے دوررس داخلی مفادات سے روگردانی بھی نہیں کر سکتا اور بدلے ہوئے عالمی حالات میں گزشتہ پالیسیوں کو جوں کا توں بھی نہیں رکھ سکتا۔

اس پر طرہ یہ کہ گمراہ کن تعلیمی نصاب اور یک طرفہ ذرائع ابلاغ کی یلغار سے تشکیل پانے والی رائے عامہ عالمی سیاسی اور معاشی تقاضوں سے قطعی بے نیاز ہے اور آتش نمرود میں بے خوف و خطر کودنے کے سوا اپنے مفادات کے حصول کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں جانتی۔ وہ تو شاید آتش نمرود اور تابکار جہنم میں تمیز بھی نہیں کر سکتی۔

برسرِ اقتدار گروہ کی دوسری مجبوری ہر قیمت پر سیاسی عمل کو بے دست و پا کیے رکھنا ہے۔ سابق

فوجی حکمرانوں کی طرح پرویز مشرف بھی اپنی ذاتی قامت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اجتماعی عسکری قیادت کے نمائندے کے طور پر اقتدار میں آئے۔ سیاسی عمل کو ذرا سی بھی گنجائش دینے کا مطلب اپنی اصل اداراتی قوت سے انحراف تھا۔ ۲۰۰۱ء کے بعد بین الاقوامی دباؤ اور بدلتے ہوئے علاقائی تناظر میں پرویز مشرف نے جو بھی قدم اٹھایا، اسے کم ہمتی پر محمول کیا گیا۔ مذہبی قوتوں نے جہاد کے نام پر مالی امداد، تربیت یافتہ کارکنوں، جدید اسلحے، ماورائے ریاست تعلقات اور رائے عامہ میں کلیدی حیثیت کے جو فوائد حاصل کیے تھے، ان کا رخ مشرف کی ذات کی طرف کر دیا گیا۔ ابتدائی دو برس تک جنرل مشرف کے معتمد رفقا پر چاند ماری ہوتی رہی لیکن ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد پرویز مشرف براہ راست تنقید کا نشانہ بننے لگے۔ پاکستان میں یحییٰ خان اور ضیاء الحق سمیت کسی باوردی حکمران کو ذرائع ابلاغ میں ایسی کڑی تنقید کا نشانہ نہیں بننا پڑا۔

۲۰۰۷ء کے ابتدائی ہفتوں سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ جنرل مشرف مقبول سیاسی جماعتوں کے ساتھ کسی سمجھوتے کی بجائے اپنے آزمودہ رفقا کے ساتھ مطلق العنان اقتدار کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ معروف سیاسی قیادت کی غیر حاضری میں مذہبی قیادت سیاسی منظر پر اپنی گرفت مضبوط کر چکی ہے۔

مبصرین کے مطابق چیف جسٹس کے ساتھ اختلاف کی بنیادی وجہ نہ تو سٹیل مل کی نجکاری کا فیصلہ ہے اور نہ غیر قانونی طور پر گم شدہ شہریوں کا معاملہ۔ اس تضاد کی بنیاد یہ ہے کہ آئندہ مہینوں میں اٹھنے والے آئینی سوالات کے ضمن میں مشرف حکومت چیف جسٹس پر مکمل اعتماد سے قاصر ہے۔

گزشتہ تجربات کی روشنی میں ایوان صدر کی یہ توقع بے بنیاد نہیں تھی کہ جسٹس افتخار کو انوار الحق، سعید الزماں صدیقی اور جسٹس یعقوب کی طرح چپکے سے رخصت کیا جا سکے گا۔ جسٹس افتخار کا واحد کارنامہ مستعفی ہونے سے انکار کرنا ہے۔ ممکنہ خدشات کے کھل جانے کے بعد جسٹس افتخار کے انکار کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعد کے واقعات اسی بد اعتمادی کا شاخسانہ تھے۔ اس معاملے کے زیر سماعت قانونی پہلو کچھ ایسی سیاسی اہمیت نہیں رکھتے۔

اصل بحران وہاں پیدا ہوا جب چیف جسٹس کے ساتھ تضاد میں حکومتی نقطۂ نظر کو کمزور پاتے ہوئے ہیئت مقتدرہ میں صدر مشرف کی پالیسیوں سے اختلاف رکھنے والے حلقوں نے انھیں بے بس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنرل کے سیاسی حلیف نہ تو ان کے نقطۂ نظر سے کوئی قلبی تعلق رکھتے ہیں اور نہ

Scanned with CamScanner

سیاسی میدان میں صدر کا دفاع کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہیں۔

مقتدر سیاسی جماعت کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے عدالتی بحران کو عدلیہ اور فوج کے درمیان کشمکش قرار دے کر حقیقت ہی بیان نہیں کی، خود اپنی سیاسی قامت بھی متعین کی ہے۔ وزیر اطلاعات محمد علی درانی نے ایوب کے وزیر اطلاعات وحید خان کا کردار بخوبی نبھایا ہے۔ وزیر قانون وصی ظفر کی کارکردگی پرویز مشرف کے ہاتھ مضبوط کرنے کی بجائے جگ ہنسائی کا سامان بنی ہے تو وزیر اعلیٰ سندھ ارباب غلام رحیم کے ملفوظات میں مشرقی پاکستان کے سابق گورنر عبدالمنعم خان کی جھلک ملتی ہے۔

سپریم جوڈیشل کونسل میں چیف جسٹس کی حاضری کے دوران دلچسپ مناظر دیکھنے میں آئے۔ دونوں معروف سیاسی جماعتوں پیپلز پارٹی اور نواز لیگ نے اپنے کارکنوں کو سڑک پر آنے کی واضح کال نہیں دی۔ ڈیڑھ ہفتے پر محیط اس کشمکش کی باگ ڈور واضح طور پر نادیدہ قوتوں کے ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر وکلا کے ساتھ معروف سیاسی اور جمہوری جماعتوں کے کارکن نہیں بلکہ مذہبی جماعتوں کے تربیت یافتہ کارکن پولیس سے متصادم تھے۔

موجودہ عدالتی اور سیاسی بحران میں مغربی قوتوں کی واضح لاتعلقی بھی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ حالات سے آگہی رکھنے والے اس بحران کے محرکات اور نتائج پر یکسو نہیں ہیں۔

معروف سیاسی جماعتیں سمجھتی ہیں کہ مشرف حکومت سے کسی بامعنی مفاہمت کا وقت گزر چکا۔ اب یہ ہیئتِ مقتدرہ کے مختلف حصوں کی باہمی کشمکش ہے۔ اوکاڑہ میں اپنے خلاف سازش کی دہائی دیتے پرویز مشرف کے خطاب سے مسٹر بھٹو کی وہ تقریر یاد آتی ہے جو انھوں نے راجہ بازار، راولپنڈی، میں سائرس وانس کا خط لہراتے ہوئے کی تھی۔ اقتدار کی تنہائی مکمل ہو چکی ہے۔

درختوں کی شاخوں کو اتنی خبر ہے
کہ ان کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں

۳۰ مارچ ۲۰۰۷ء

Scanned with CamScanner

معاشرے اور حرم سرا میں انتخاب

آرتھر کوسلر نے جوگی اور کمیسار میں انقلاب روس پر یورپ کے روشن خیال طبقے کا ردِعمل بیان کرتے ہوئے لکھا کہ گویا ریڈیو پر آسمانی بادشاہت کے قیام کا اعلان نشر ہو گیا تھا۔ پاکستان کا قیام کچھ حلقوں کے لیے ایسی ہی ذہنی کیفیت کا پیغام لایا جن کا خیال تھا کہ انھیں اپنے پسندیدہ سیاسی اور معاشرتی رویوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک اکھاڑا میسر آ گیا ہے۔ انھی اصحاب میں لاہور کے ایک مولانا بھی تھے جو ہر روز انارکلی بازار میں ایک بڑی سی قینچی لیے کھڑے رہتے تھے؛ جس خاتون کے سر پر دوپٹہ نظر نہ آتا، یہ اس کے بال کاٹنے کو دوڑتے۔ فیض صاحب نے دستِ صبا کا وہ شعر 'مولوی قینچی' ہی کی شان میں ارزاں کیا تھا:

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف لہرانے کا نام

چھ عشرے بعد صورت حال میں صرف یہ فرق پڑا ہے کہ 'مولوی قینچی' کی جگہ 'مولوی لہولہان' سجادہ نشین ہیں۔ یہ صاحب ٹرانسپورٹ یونین کے عہدے دار ہوا کرتے تھے۔ کوئی بیس برس پہلے پنجاب میں ہر ویگن پر لکھا ہوتا تھا: ''مولوی لہولہان کو رہا کرو ورنہ... '' اسلام آباد میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے پیش اماموں کا اعلانِ جہاد اور فدائی حملوں کی دھمکی مولوی لہولہان کے اِس 'ورنہ' کی تشریح ہی تو ہے۔

اٹھاون برس پہلے دستور ساز اسمبلی میں حزب اختلاف کے رہنما سریش چندر چٹوپادھیائے نے قراردادِ مقاصد کی مخالفت کرتے ہوئے خبردار کیا تھا کہ اگر سیاست اور مذہب کو خلط ملط کیا جاتا رہا تو ایک دِن کوئی خدائی فوجدار ڈنڈا اٹھائے آئے گا اور اللہ کا نام لے کر ریاست کو مفلوج کر کے رکھ دے گا۔

چٹوپادھیائے کا نام تو پاکستانی تاریخ کی مفصل کتابوں میں بھی نہیں ملتا لیکن اُن کی پیش گوئی یوں پوری ہو رہی ہے کہ اسلام آباد پر خدائی فوجداروں کا ٹڈی دَل اتر آیا ہے — وہ بھی جو باریش چہروں پر ڈھاٹے باندھے پھرتے ہیں، وہ بھی جو روشن خیال حکومت کی نیم روشن غلام گردشوں میں کہہ

Scanned with CamScanner

مکر نیوں کے ذریعے تاریک خیالی کا ایجنڈا آگے بڑھاتے ہیں اور وہ بھی جو اخبارات میں حقیقت اور واہمے کی، جمہوریت اور انتہا پسندی کی ایسی دلدل تیار کرتے ہیں کہ چے گویرا اور آئی ایس آئی کے سابق اہلکار خواجہ خالد کے خدوخال کا فرق مٹ جاتا ہے۔

کچھ مبصرین اسلام آباد، ٹانک اور پارا چنار میں انتہا پسندی کے پے در پے واقعات کا تعلق عدالتی بحران سے جوڑ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکومت ملا حضرات کو شہ دے رہی ہے تا کہ عدالتی بحران سے توجہ ہٹائی جا سکے، نیز کسی ممکنہ عالمی دباؤ کی شدت بھی کم کی جا سکے۔ تاہم کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ عدالتی بحران میں حکومتی موقف کو کمزور پا کر دارالحکومت کے مذہبی پیشوا موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

جنرل مشرف کی رائے درست ہے کہ انتہا پسندوں کی تعداد چند ہزار ہے جبکہ ملک کے کروڑوں عوام اُن کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں۔ لیکن یہ کہتے ہوئے جنرل پرویز مشرف اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مٹھی بھر انتہا پسندوں کے پاس تو اے کے ۴۷ کے انبار ہیں جبکہ ملک کی خاموش اکثریت کو سترھویں آئینی ترمیم سے بے بس کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ حفصہ مدرسے کی گرفتار معلمات تو اُسی روز رہا ہو جاتی ہیں جبکہ شمیم اختر اپنی بیٹی، بہو اور شیر خوار بچی کے ہمراہ تین روز تک لال مسجد میں محبوس رہتی ہے۔

۱۹۹۵ء میں افغانستان میں طالبان کی تحریک بھی متبادل عدلیہ اور نام نہاد فحاشی کے خلاف مہم سے شروع ہوئی تھی۔ اس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دنیا کے کسی معاشرے میں فحاشی کی کوئی متفقہ تعریف ممکن نہیں اور پاکستان جیسی ریاست میں تو یہ کام اور بھی مشکل ہے جہاں قانون، گناہ اور جرم میں تمیز نہیں کرتا۔ جہاں مسلمان کی تعریف متعین کرنے میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۴ء تک بیس سال لگے تھے، وہاں فحاشی کی تعریف کیسے متعین ہوگی؟ ڈاکٹر اسرار احمد کرکٹ کو فحش قرار دے چکے ہیں۔ طالبان حکومت میں گیند سے کھیلنے والے لڑکوں کو کوڑے لگائے جاتے تھے۔ پاکستانی یونیورسٹیوں میں شیکسپیئر اور ملٹن کو فحش قرار دیا جا چکا ہے۔ توبۃ النصوح میں ڈپٹی نذیر احمد نے شیخ سعدی پر فحاشی کا الزام دھرا تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ تحفظ نسواں بل پر بحث کے دوران متحدہ مجلس عمل 'زنا بالرضا' کی بجائے 'فحاشی' کی اصطلاح استعمال کرنے پر بضد تھی۔ فحاشی کا الزام وہ کمبل ہے جسے معاشرے پر ڈال کر مطلق العنانی کا ڈنڈا گھمایا جا سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ملک کے عوام عدالتی نظام کی سست روی سے اس درجہ بیزار ہیں کہ ان کی بڑی تعداد باقاعدہ عدالتوں کی بجائے جرگوں پر اعتماد کرتی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ فتووں کی روشنی میں ہونے والے فوری انصاف میں کچھ طبقات کے لیے خاصی کشش ہو—عام آدمی تو تاریخ کا یہ سبق نہیں جانتا کہ فوری انصاف کا کوئی نظام انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا۔

فتووں کی تاریخی فہرست سے قطع نظر، ابھی چند ماہ پہلے تک بھارتی علما کے فتوے کی پرواز یہ تھی کہ زنا بالجبر کا شکار ہونے والی بہو کو ملزم سسر سے شادی کرنے کا حکم دیا جارہا تھا۔

سماجی علوم کے ماہرین کے مطابق معاشرے کے ارتقا کا راستہ اختلاف رائے، پُرامن مکالمے اور مختلف سماجی نمونوں کے تنوع سے ہموار ہوتا ہے۔ فتویٰ اپنی نوعیت کے اعتبار سے فکری یک رخے پن اور جمود پر مبنی معاشرے کی طرف لے جاتا ہے۔

حجاب کے رجحان ہی کو لیجیے۔ پاکستان کے کسی قانون میں خواتین کو پردے کی کسی شکل کا پابند نہیں کیا گیا چنانچہ پردے کو اختیار یا رَد کرنے والی پاکستانی خواتین کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتیں۔ تاحال مغربی طرز زندگی اختیار کرنا بھی کوئی جرم نہیں۔ چنانچہ ریاست کا فرض ہے کہ قانون کے پابند شہریوں کو قانون کا تحفظ فراہم کیا جائے۔

گاہے گاہے ایسی خبریں آتی رہی ہیں کہ محکمۂ تعلیم کے کسی بر خود غلط ضلعی افسر کی رگِ اختیار پھڑکی اور انھوں نے تعلیمی اداروں میں لباس پر کچھ پابندیاں عائد کردیں۔ مری کی مال روڈ پر وہ تختی اب بھی لگی ہے جس میں 'بحکم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ' مردوں کا نیکر پہن کر ہوا خوری کو نکلنا منع ہے۔ یہ رویہ البتہ نیا ہے کہ بندوبستی اضلاع میں حکومت نے دھمکیوں سے گھبرا کر طالبات کو حجاب بلکہ خیمہ پوشی کا پابند کیا ہے۔ صراحت سے کہا گیا ہے کہ فیشن ایبل برقعے کی بجائے شٹل کاک برقع اوڑھا جائے۔ اب فیشن تو کوئی متعین مظہر نہیں، فیشن کا مطلب ہے جو لوگوں کو مرغوب ہو؛ گویا اصل کد عوام کی پسند سے ہے۔

اصولی طور پر تو چاہیے تھا کہ ایسی دھمکی آمیز مہم چلانے والوں کے خلاف نفرت انگیز تحریر و تقریر، بدامنی پھیلانے اور ترغیبِ جرم کے موجودہ قوانین کے تحت کارروائی کی جاتی۔ تاہم عورت دشمنی کے ان نمونوں کے سامنے سجدۂ سہو کرنے میں صرف حکومت ہی شامل نہیں، وہ تعلیم یافتہ طبقات بھی شریک ہیں جنھوں نے ان غیر قانونی اقدامات کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کی۔

Scanned with CamScanner

دوسری طرف تعلیم دشمنی کا جوش ایسا فراواں ہے کہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں درجنوں سکول اور کالج بند ہو چکے ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ گزشتہ سال تیمر گرہ میں قتل ہونے والی تین خواتین اساتذہ کے قاتلوں کا تعلق کس گروہ سے تھا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ٹانک کے فرض شناس پرنسپل کے اغوا اور پولیس افسر کے قتل پر کیا کارروائی ہوئی جنھوں نے طالب علموں کو جہاد کے لیے زبردستی بھرتی کرنے کی مزاحمت کی تھی۔

موجودہ مسئلہ ریاست کی نوعیت پر دو متضاد نقطہ ہائے نظر کا تصادم ہے۔ یہ مہذب معاشرے اور حرم سرا میں انتخاب کا سوال ہے۔ یہ جدید ریاست کا ان عناصر کے ساتھ تصادم ہے جن کی تمدنی فکر زبردستی نکاح کرنے اور نکاح ٹوٹنے سے آگے نہیں جاتی۔ جن کا تجرِ علمی ان دھمکی آمیز خطوں کی زبان اور املا سے ظاہر ہے جو بال کاٹنے کا کام کرنے اور سی ڈیز فروخت کرنے والوں کو بھیجے گئے ہیں۔

اسلام آباد کی لال مسجد کے رہنما مولوی عبدالرشید نے اپنے اخباری کالم (روزنامہ اوصاف) میں لکھا ہے کہ "لائبریری کی نہ تو کوئی عظمت ہے، اور نہ تقدیس"۔ گویا لوگوں کے کاروبار اور مکانات تقدیس کا درجہ نہیں رکھتے لہٰذا عظمتِ مذہب کے علم برداران پر قبضہ کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

مولانا نے مذکورہ کالم میں سرکاری زمین پر قبضے کے لیے 'نظریہ ضرورت' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ نظریہ ضرورت عدالت کے ایوانوں سے اجتماعی نفسیات میں سرایت کرتا حجروں تک آن پہنچا ہے۔

۱۳ر اپریل چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس کی تاریخ سماعت ہے۔ یقینی طور پر حکومت اس دوران کوئی قدم اٹھا کر امن وامان کی صورت حال کو مزید پیچیدہ نہیں کرنا چاہے گی۔ اس بیچ میں حفصہ مدرسے کی خواتین اور لال مسجد کے طالبان اپنی قوت کا اچھا خاصا مظاہرہ کر لیں گے اور پھر حکومتی حلقوں میں اپنے ہم خیالوں کے توسط سے سوچی سمجھی پسپائی اختیار کر لیں گے۔ اس دوران انھوں نے یہ تو جان ہی لیا ہوگا کہ پاکستانی ریاست اور روشن خیال طبقہ مذہبی عناصر سے ٹکراؤ کی ہمت رکھتا ہے یا بدستور سیاسی، قانونی اور معاشرتی منافقت کا خراج دیتا رہے گا۔

۹ر اپریل ۲۰۰۷ء

❁❁

Scanned with CamScanner

سالانہ خریداری

ایک اہم اطلاع

براہ کرم نوٹ کر لیجیے کہ بڑھتی ہوئی لاگت کے پیش نظر یکم جولائی ۲۰۰۷ء سے آج کی سالانہ خریداری کی شرح میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب پاکستان میں چار شماروں کے لیے سالانہ خریداری کی شرح، بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ، چار سو روپے ہوگی۔ یہ نرخ یکم جولائی کے بعد نئی خریداری اور تجدید خریداری دونوں پر نافذ ہوگا۔ اسی طرح بیرون ملک سالانہ خریداری کی شرح، بشمول رجسٹرڈ ہوائی ڈاک خرچ، چار شماروں کے لیے پچاس امریکی ڈالر ہوگی۔

سالانہ خریدار پہلے کی طرح سٹی پریس بک کلب کی طرف سے کتابوں کی خریداری پر دی جانے والی رعایت سے مستفید ہو سکیں گے۔

امید ہے کہ ہمیں اپنے مستقل پڑھنے والوں کا تعاون پہلے کی طرح حاصل رہے گا۔ شکریہ۔

Scanned with CamScanner

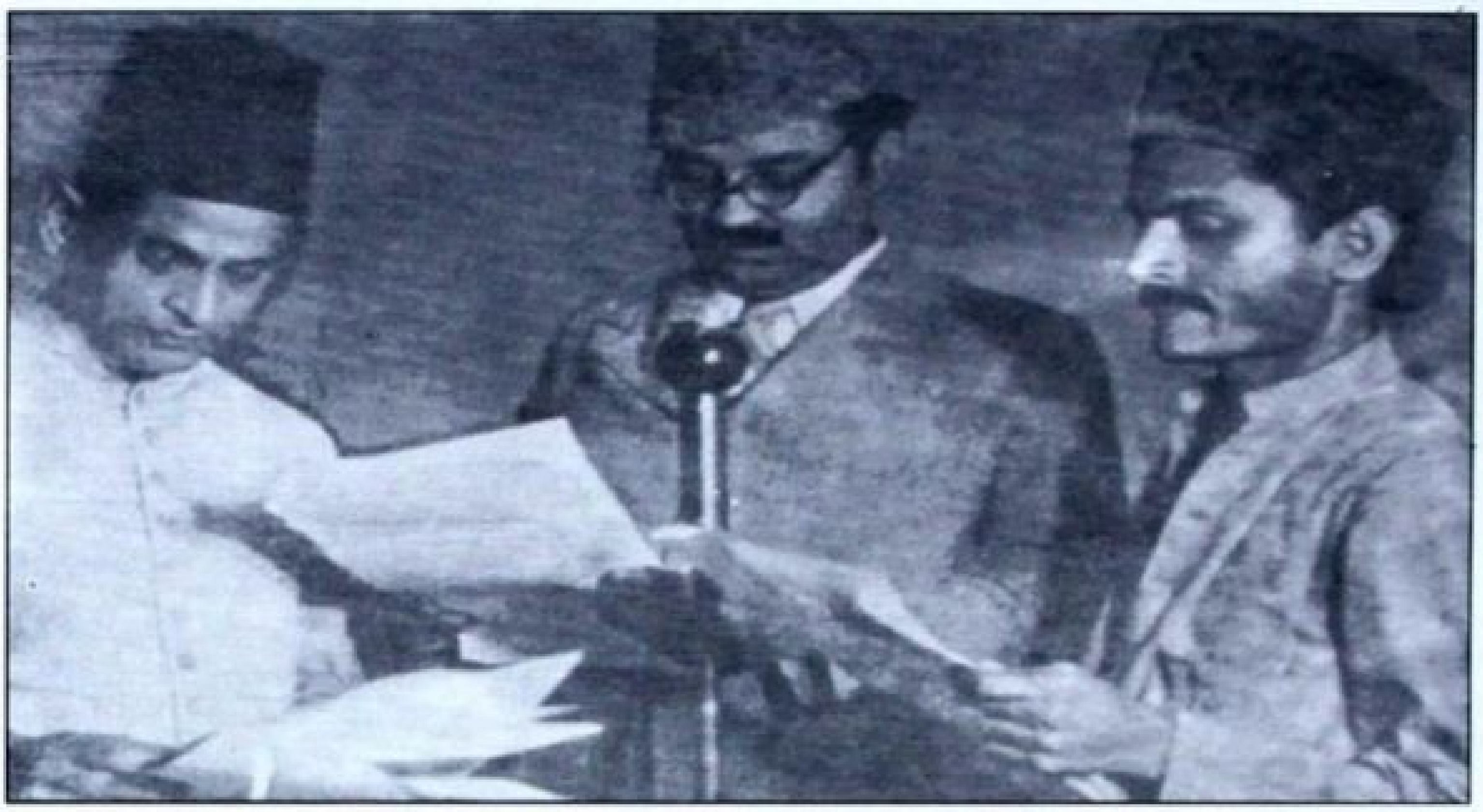

دیکھیے صفحہ ۲۴۳

دیکھیے صفحہ ۲۷۸

Scanned with CamScanner

۵۶

قیمت
۱۲۰ روپے

آج کی کتابیں
۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner